الفاظ

افسانہ نمبر

افسانہ نمبر (جلد اول)

الفاظ

جلد ۶ | جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۱ء | شمارہ ۱، ۲

مجلس ادارت

نورالحسن نقوی   اطہر پرویز

اسد یار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

سرورق پر : پریم چند

زر سالانہ ۔۔۔ Rs. 16.00

قیمت افسانہ نمبر ۔۔۔ چھ روپے

پرنٹر پبلشر ۔۔۔ اسد یار خاں

مطبوعہ ۔۔۔ اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد

کتابت ۔۔۔ ز۔ رشید، الٰہ آباد

مقام اشاعت

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پیشکش : دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

مقالات

افسانے

○

اداریہ

اردو افسانے کا کارواں آسمان کی پہنائیوں کی طویل مسافت طے کرکے پھر دھرتی پر اتر آیا ہے۔ مگر اس مقام پر نہیں جہاں سے اس نے یہ سفر شروع کیا تھا بلکہ اس سے دور، کوسوں دور!

پچھلی دو دہائیوں میں اردو افسانے نے کئی کروٹیں لی ہیں اور ایسی تبدیلیوں سے روشناس ہوا ہے کہ اس کی شکل پہچاننی دشوار ہوگئی ہے۔ افسانے کی شناخت کے جتنے اصول مقرر ہوئے تھے آج سب باطل ہوچکے ہیں۔ اور اس کی جتنی تعریفیں کی جاتی رہیں سب بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں۔ پریم چند سے شروع ہونے والی اردو افسانے کی روایت کچھ دنوں خطِ مستقیم پر چلتی رہی لیکن کرشن چندر، منٹو اور بیدی تک پہنچتے پہنچتے اس روایت کے سارے امکانات تمام ہوگئے اور وہ اپنی منتہا کو پہنچ گئی۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو بالکل فطری لابدی ہے یعنی روایت سے انحراف!

پرانی لیکھ پر چلنے سے انکار اور نئی راہوں کی تلاش ایک فطری بات اور ایک نفسیاتی معاملہ بھی ہے۔ کشیدہ قامت بھلا اپنے قد کی نمائش کیوں نہ کرے گا۔ سچا فنکار جو اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ وہ اپنے فن کو پرانے سانچوں میں قید رکھنے پر راضی نہیں ہوسکتا۔ بھیڑ میں کھوجانا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے دور سے پہچان لیا جائے اس لئے وہ روشِ عام سے ہٹ کر چلتا ہے۔ عصری حسیت اور اس کے تقاضے بھی فنکار کو روایت سے بغاوت پر اکساتے ہیں اور یہ دستور اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود ادب۔ ہمارے ادب میں بھی یہ صورت برابر پیش آتی رہی ہے۔ کبھی نمایاں طریقے سے اور کبھی غیر محسوس طور پر لیکن ہمارے افسانے کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اسے پچھلی چند دہائیوں میں بڑی شکست و ریخت اور پے درپے زبردست تبدیلیوں سے گزرنا پڑا۔ اس کا سبب کچھ تو حالات کا تقاضا تھا، کچھ فن کار کی انفرادیت اور کچھ محض قاری کو چونکانے کی خواہش۔

تقسیم ملک کے بعد سے اردو افسانے میں جو تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں، انھیں ہمارے افسانے کے ناقد نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اسے یورپ کی بے معنی نقل ٹھہرایا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپ کا فن کار جس ذہنی کرب میں گرفتار ہے وہ اصلی ہے۔ یورپ کی مخصوص شہری زندگی، صنعتی دور کے لازمی تقاضے، وہاں کی نفسا نفسی اور ایک دوسرے سے بےتعلقی، ان سب چیزوں نے مل کر وہاں کے شاعر و افسانہ نگار کو مایوسی، تنہائی اور لاحاصل کے احساس میں مبتلا کردیا ہے۔ چنانچہ اس کرب کے عالم میں اس نے جو کچھ کہا اس میں بے ربطی اور ژولیدہ بیانی قابلِ فہم ہے مگر اپنے فن کار کے بارے میں اس نقاد کی رائے یہ تھی کہ اس کے یہاں ان باتوں کا ذکر بے سوچے سمجھے محض نقالی کے طور پر ہوا ہے مگر ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہمارے فن کار کو جن حالات کا سامنا تھا وہ مغرب کے حالات سے زیادہ اذیت ناک اور روح فرسا تھے۔ اسے خونیں فسادات کے جو ہولناک منظر دیکھنے پڑے ان سے وہ دہشت زدہ ہوگیا اور اس پر نہ ختم ہونے والے تحیر کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ساتھ ہی اسے ایک اور اذیت سے گزرنا پڑا۔ اردو کے مستقبل کے ساتھ اسے اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اب کوئی اس کی بات سننے والا نہ رہ گیا ہو اور وہ بھری محفل میں تنہا ہو۔ یہ صورت حال عارضی نہ تھی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ اردو کی "ریڈرشپ" قطعاً معدوم ہوگئی۔ اب اگر وہ خود کو بے مصرف خیال کرنے لگا اور اسے بے چارگی کا احساس ستانے لگا تو یہ بالکل فطری بات تھی۔ یورپ سے کہیں زیادہ اصلی اور فطری!

انسان مایوس ہوجانے اور یہ باور کرلینے کے بعد کہ اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں اپنی ذات کے خول میں قلعہ بند ہوکر خود کو محفوظ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہمارے فن کار پر بھی گزری اور اس کی توجہ اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات سے ہٹ کر خود اس کی ذات پر مرکوز ہوگئی۔ وہ بھول گیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کا کوئی سننے والا بھی

موجود ہے اور اس لئے اسے قابلِ فہم ہونا چاہئے۔ ہمارے افسانے کے نقاد کے لئے یہ ایک انوکھی سی بات تھی۔ اس کے پیشِ نظر پریم چند اور ان کے عہد کا افسانہ تھا — جذبۂ اصلاح سے سرشار اور براہ راست یا پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر وجود میں آنے والا افسانہ تھا — بامقصد اور واضح! نئے افسانہ نگار کی ٹیڑھی میڑھی چال اس کے لئے ناقابلِ فہم اور اس لئے ناپسندیدہ تھی۔

بات شاید زیادہ نہ بگڑتی اور فن کار و ناقد یا فن کار و باشعور قاری کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نکل آتی مگر جعلی فن کاروں نے بیچ میں کود کر معاملے کو بگاڑ دیا۔ ان کے پاس نہ کہنے کو کوئی بات تھی، نہ بات کہنے کا سلیقہ۔ یہ ہیئت کے بےچیدہ اور غیر ضروری تجربے کرتے تھے اور انھیں فن کا معجزہ ٹھہراتے تھے، اقلیدس کی شکلیں بناتے تھے اور اسے جدید افسانہ کہتے تھے، ریاضیاتی علامتیں بے ترتیبی سے پیش کرتے تھے اور اسے نئی کہانی کا نام دیتے تھے۔ ان کے افسانوں میں جو ابہام اور الجھاؤ تھا وہ فطری نہ تھا، کوشش کرکے پیدا کیا گیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں جمالیاتی تسکین کا کوئی پہلو نہ نکل آئے۔ افسانے کے قاری سے اسی طرح غور و فکر کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جس طرح شعر کے قاری سے مگر افسانہ ایسا تو ہو جو قاری کو اپنی گرفت میں لے سکے اور اسے ایک ایک کرکے گرہیں کھولنے پر مجبور کردے۔ بہرحال ہوا یہ کہ ان جھوٹے فن کاروں کی بھیڑ میں سچے فن کار بھی کھوگئے۔ ایسے میں نئے افسانے کے نقاد کا فرض تھا کہ پرکھے اور کھرے کھوٹے کو الگ کردے۔ مگر ہوا یہ کہ ہمارے تنقید نگار دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک گروہ کو نئے افسانے کا سارا سرمایہ ہذیان نظر آیا۔ دوسرے گروہ کو بے سر و پا افسانے بھی وحی معلوم ہوئے۔ اور جہاں تک معنی کی تلاش کا معاملہ ہے لوگوں نے اس شعر میں بھی مفہوم ڈھونڈ نکالا ہے کہ:

ٹوٹی دریا کی کلائی، زلف الجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا، آدمی بادام میں

لیکن ندی نالے رفتہ رفتہ اترنے لگے۔ افسانہ نگار کو یہ احساس ہونے لگا کہ دھرتی سے بہت دور جاکے اور قاری کے لئے چیستاں بن کے نہ وہ زندہ رہ سکتا ہے نہ اس کا فن۔ ایسے ادب کا تصور ممکن ہی نہیں جو جمالیاتی حظ سے عاری ہو اور بصیرت سے محروم۔ افسانے میں چاہے کچھ نہ ہو مگر اتنا تو ہو کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ بہالے جائے۔

چنانچہ آج کا افسانہ گزرے ہوئے کل کی بہ نسبت زیادہ ارضی، زیادہ قابلِ فہم اور نتیجتہً زیادہ دلچسپ ہے۔ کل کے افسانہ نگار نے قاری کو مرعوب کرنے کے لئے جو ژولیدہ بیانی اختیار کی تھی، اس کے صبر کا امتحان لینے کے لئے جو الجھے الجھے تجربے کئے تھے آج کا افسانہ ان سے نجات پاچکا ہے لیکن کسی کو یہ انتظار ہو کہ اردو افسانہ لوٹ کر ایک دن پھر پریم چند یا ترقی پسند تحریک کے دور میں داخل ہوجائے گا اور پہلے کی طرح سیدھے سادے طریقے سے مسائل سے نبرد آزما ہوگا، راست گفتاری سے کام لے گا، واشگاف اندازِ بیان کو اپنائے گا یا پہلے کی طرح سریع الفہم ہوجائے گا تو شاید اسے مایوسی ہوگی۔ نئے افسانے میں ممکن ہے کہ پیچیدہ بیانی کو بھی دخل ہو۔ اس میں نئی نئی علامتیں بھی داخل ہوتی رہیں گی۔ باشعور قاری کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ مستقبل کا افسانہ اس سے غور و فکر کا مطالبہ کرے گا، آج سے بھی زیادہ غور و فکر کا!

نئے افسانے نے جن جہتوں میں قدم اٹھایا ہے الفاظ کا یہ **افسانہ نمبر** ان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ اس شمارے میں معتبر افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل ہیں اور افسانے کے مستند نقادوں کے مضامین بھی۔ اس کے مطالعے سے شاید افسانے کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اندازہ ہوگا کہ افسانہ کتنا لمبا سفر طے کرکے اس منزل تک پہنچا ہے اور آئندہ اس کے امکانات کیا ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ ضخامت بڑھ جانے کے سبب موصول ہونے والے تمام افسانے اور مضامین اس شمارے میں شامل نہ کئے جاسکے۔ انھیں افسانہ نمبر کی دوسری جلد میں پیش کیا جائے گا جس کے لئے قارئین کو کچھ دنوں انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔

— مجلسِ ادارت

(ڈاکٹر) قمر رئیس

پریم چند کی روایت

پریم چند نے اردو زبان و ادب اور اس کے سرمایۂ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ انھوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زاویوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ ایک ایسی بلند سطح سے جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا۔ اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ وہ پہلے ادیب ہیں جن کی نظر حیات انسانی کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک پہنچی۔ جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انھیں زبان دی۔ ازلی پسپائی اور پسماندگی کے شکار یہ ہندوستان کے دبے کچلے کروڑوں انسان تھے۔ جو ملک کی غالب اکثریت اور اس کی دولت، تہذیب و شان و شوکت کے خالق تھے۔

پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت، مزدوروں اور ہریجنوں کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا۔ ان کے لئے ادب کے کشادہ دروازے کھولے۔ اور انھیں ہیرو بنا کر، ان کے دکھ سکھ کی گاتھا سنا کر اردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور ایک نئے احساسِ جمال سے آشنا کیا۔ اس طرح اردو ادب جو اب تک شہر کے اعلیٰ اور متوسط طبقے کی ترجمانی کرتا تھا۔ سارے ملک کی متحرک زندگی، عوامی تحریکوں، سماجی آویزشوں اور عام انسانوں کے مشغلوں اور معرکوں کا جاندار مرقع بن گیا۔

عام طور پر شہر کے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کو گاؤں کے کروڑوں مفلوک الحال کسانوں کی زندگی کی طرف متوجہ کرنے اور ان سے جوڑنے کا کارنامہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جیسے سیاسی رہنماؤں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن پریم چند نے ہندوستانی سیاست میں ان کے طلوع ہونے سے پہلے (۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۶ء) تک بے غرض محسن، صرف ایک آواز، کیفر کردار، اور خونِ سفید، جیسی کہانیاں لکھیں۔ جن کے ہیرو کسان اور وہی مزدور ہیں۔ اور جن میں پریم چند نے پولیس، مہاجنوں، مہنتوں اور زمین داروں کے ہاتھوں کسانوں کی تباہی کے قصے سنائے اور بتائے کہ اس نوآبادیاتی نظام میں دیہی معیشت اور کسان کی بربادی کی جڑیں کہاں تک پہنچی ہیں۔ ہندوستانی عوام کی زندگی اور ان کے مقدر سے پریم چند کا یہ رشتہ ایک نمو پذیر اور متحرک رشتہ تھا۔

جو آزادی اور انصاف کے لئے عوام کی بڑھتی ہوئی جد و جہد اور بیدار ہوتے شعور کے ساتھ زیادہ گہرا، زیادہ معنی خیز، زیادہ تہہ دار اور حساس ہوتا گیا۔ اور اس کے ساتھ ان کا فنی شعور بھی ارتقا اور تکمیل کے مرحلے طے کرتا گیا۔ پریم چند کے بعض معاصرین مثلاً اعظم کریوی اور سدرشن نے بھی گاؤں کی زندگی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا لیکن ان کے یہاں گاؤں کا جو تصور ابھرتا ہے اس کی ترکیب میں جذباتی اور تخیلی عناصر کا زیادہ دخل ہے۔ جیسے شہر کے ہنگاموں، خود غرضیوں اور شور و شر کے مقابلے ہیں، گاؤں زیادہ پُرسکون، پُر عافیت اور راحت بخش ہو، پریم چند ٹالسٹائی کی طرح غریب اور مجبور کسانوں کی سادگی اور اعلیٰ اخلاقی ظرف پر زور دینے کے باوجود ان کی روحانی اذیتوں، محرومیوں اور سماجی رشتوں کی تصویریں مشاہدہ کی ایسی باریکی اور تازگی کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ جیسے وہ ان میں سے ہوں۔ ان کے دکھوں میں شریک رہے ہوں۔ ان کی جھونپڑیوں سے نکل کر آئے ہوں اس جذبۂ اتحاد نے ان کے افسانوں اور ناولوں میں دردمندانہ واقفیت کا جو اچھوتا رنگ بھرا ہے وہ اردو افسانے کی سب سے زیادہ تابناک، پائیدار اور جاندار روایت ہے۔ 'سوا سیر گیہوں'، 'بوڑھی کاکی'، 'پنچ پرمیشور'، 'نجات'، 'دو بیل'، 'دودھ کی قیمت'، 'پوس کی رات'، 'نئی بیوی'، اور 'کفن'، جیسی کہانیاں اسی مقدس روایت کے روشن ستون ہیں۔ ناولوں میں گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، میدان عمل، اور گئو دان سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کردار بظاہر سیدھے سادے ہونے کے باوجود یک رخے اور اکہرے نہیں ہیں۔ الگو، جمن، دکھی، منگل، ہلکو، گھیسو، بلراج، سورداس، ہوری۔ یہ سب اپنے داخلی اور خارجی رشتوں کے اعتبار سے پہلو دار اور پیچیدہ کردار ہیں۔ وہ اپنی ذات کے آشوب اور اپنے ماحول کے جبر اور عتاب کی ایسی علامت بن جاتے ہیں۔ جس سے نہ صرف اس زمانے کا بلکہ آج کا قاری، ہر زبان، ہر ملک کا قاری ایک احساسِ یگانگت اور مماثلت محسوس کرتا ہے۔ یہ کردار مقامی عصری اور آفاقی تینوں اوصاف کے حامل ہیں۔ خارجی ماحول کی جزئیات مقامی اثرات کے حد بندی کرتی ہیں، سماجی رشتوں کی کشمکش عصری حقائق کی نشاندہی کرتی ہے اور ذہنی تلازمات یا کرداروں کی علامتی تہہ داری آفاقی جہات کا اشاریہ ہوتی ہے۔ یہ کردار اپنی روح کی تنہائی اور اپنے دکھوں کی فصل سمیٹنے کی کوشش میں اس طرح بکھر جاتے ہیں کہ ساری انسانیت اپنا سمجھ کر ان کی شناخت کرتی ہے۔ گیورگی لوکاچ نے ایک مضمون میں کہا ہے۔

> "ہر بڑی تخلیقی تصنیف میں کردار اس پُر اثر انداز سے پیش کئے جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف مختلف طریقے سے آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ سماج اور سماج کے عظیم مسائل پر بھی ان کی چھاپ پڑتی ہے۔ ان کا باہمی ربط اور تعلق جس قدر گہرائی کے ساتھ ذہن نشین ہوگا اور اس کا تانا بانا جس قدر گھنا ہوگا، اسی قدر

اس تصنیف کی امکانی اہمیت زیادہ ہوگی۔"

گوشۂ عافیت، میدان عمل اور گؤدان جیسے ناولوں کے علاوہ گاؤں کی زندگی کی ترجمانی کرنے والے، پریم چند کے بے شمار افسانوں میں انسانی رشتوں کی یہی تہہ داری گہرائی اور گھنا پن، انھیں بے مثل فنی بلندیوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ ان کے تار و پود میں اس عہد کی اجتماعی زندگی کے بنیادی مسائل اس باریکی سے بُنے ہوئے ہیں کہ ان کو افسانوں اور ناولوں کی تخلیقی وحدت اور کرداروں کی انفرادیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ غلامی کی لعنتوں سے برہمی یا بے زاری ہو یا بڑھتی ہوئی طبقاتی بیکار سے وابستگی، مجہول رسم درواج میں جکڑی ہوئی ہندوستانی عورت کی مظلومی اور محکومی ہو یا فرقہ وارانہ کشیدگی، سماج میں اپنے انسانی حقوق اور انسانی وقار کی بحالی کے لئے ہریجنوں کی جدوجہد ہو یا ایک غیر ملکی نظام تعلیم سے فیض یافتہ نوجوانوں کی اپنے عوام کی حالت سے بے رحمانہ علیحدگی اور بے اعتنائی۔

یہ اور دوسرے قومی مسائل، پریم چند کے افسانوں میں اس عہد کی بنیادی سچائیوں کو پیش کرتے ہیں۔ اجتماعی عوامل اور استحصالی طاقتوں کے تناظر میں، گاؤں کے دبے کچلے انسانوں کی زندگی کی تصویر کشی پریم چند کی ایسی روایت ہے جس نے جدید اردو افسانوی ادب میں اپنی بقا کے وسیع امکانات تلاش کئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقت نگاری کے جس رجحان نے فروغ پایا، اس میں بھی اس توانا روایت کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، بلونت سنگھ اور آزادی کے بعد قاضی عبدالستار، عبداللہ حسین، انور عظیم اور جمیلہ ہاشمی کی ان گنت کہانیوں میں یہ روایت سانس لیتی نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں مغرب کے بعض فنی رجحانات اور افکار کے نفوذ و اثر سے اردو میں اس روایت کو نقصان پہنچا ہے۔ لیکن اس دور میں بھی رتن سنگھ کی بعض کہانیوں کے علاوہ سریندر پرکاش نے "بجوکا" لکھ کر شعور فن کی ایک نئی سطح پر اس روایت کی بازیافت کی ہے۔

پریم چند نے افسانے میں حقیقت پسندی کے جس تصور کو رواج دیا وہ زندگی کے مادی مظاہر کو معروضی انداز سے دیکھنے اور سمجھنے پر اعتراض کرتا ہے۔ اپنے وجود اور اپنے شعور سے باہر زندگی کے خارجی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ پریم چند بعض دوسرے حقیقت پسند ادیبوں کی طرح ظاہری حقیقت اور اصل حقیقت میں فرق کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اصل حقائق وہ تاریخی قوتیں ہیں جو اپنی آویزش اور اثر سے معاشرہ کو متحرک رکھتی ہیں۔ اور انسان کے داخلی رویوں اور خارجی رشتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کہانی میں زندگی کا شائبہ پیش کرنے والی جو ایک آزاد دنیا خلق کی جاتی ہے وہ خارجی دنیا کا عکس ہونے کے باوجود اس سے زیادہ حقیقی، زیادہ جاندار، زیادہ دلچسپ اور زیادہ معنی خیز اس لئے ہوتی ہے کہ فنکار اپنے شعور اور تخیل کی مدد سے اس میں ظاہری حقیقتوں

اور ان کے پیچھے، بروئے کار اصل حقیقتوں کے درمیان رشتہ تلاش کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقتوں کے اس پیچیدہ عمل اور ردعمل کے افہام و تفہیم میں وہ کبھی کبھی فریب اور مغالطوں کا شکار بھی ہوتا ہے۔ اور پریم چند بھی ہوئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اس تصور کی معروضیت، فنکار کو زندگی کی انحطاط پذیر اور ترقی پسند قوتوں کے ادراک میں مدد دیتی ہے، پریم چند کی بیشتر کہانیوں میں اسی حقیقت پسندانہ رویے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے متوازی پریم چند کے دور میں ایک رومانی یا انفرادیت پسندانہ نقطۂ نگاہ بھی پرورش پا رہا تھا۔ جو معاشرہ کے بجائے فرد کی داخلی دنیا اس کے جذبہ اور وجدان کو اہمیت دیتا تھا۔ اور انسانی تجربات کو اکثر ایک ماورائی اور تجریدی سطح پر پیش کرتا تھا۔ وہ کائنات اور حیاتِ انسانی کے چند خاص مظاہر مثلاً حُسن و عشق، آزادی، خوش ذوقی، آرزومندی، آراستگی پر زور دیتا تھا۔ فکر و نظر کا یہ اسلوب سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور ایک حد تک مجنوں گورکھپوری کے ناولوں اور افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اردو افسانہ کے ارتقا میں اس روایت نے بھی اہم حصہ لیا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس اور اختر انصاری کی تخلیقات میں بھی رومانی احساس و فکر کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس دور میں بھی، پریم چند کی حقیقت پسندی کی روایت کو غلبہ حاصل رہا۔ رومانی رجحان تبدریج روبہ زوال ہو کر تحلیل ہوتا گیا۔ راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، شوکت صدیقی، اور بعض دوسرے ادیبوں کے افسانوں میں سماجی حقیقتوں کے اسی معروضی ادراک و اظہار کا اثر غالب رہا جو پریم چند کی روایت کا جزو خاص تھا۔

بیدی کے افسانوں میں روزمرہ کی زندگی کی حقیقتیں اور انسان کی داخلی واردات جس طرح ان کی تخلیقی ذہانت اور شعور سے مس ہو کر ہیئت اجتماعی اور انسانیت کے وسیع تر حقائق اور مسائل کا علامیہ بن جاتی ہیں۔ وہ پریم چند کی روایت کی نمو پذیر اور ارتقا یافتہ صورت ہے۔ پریم چند اور بیدی کے بہت سے المیہ کرداروں، خاص کر نسوانی کرداروں کے مطالعہ میں بھی یہی شعور اور دردمندانہ احساس مشترک ہے جو قاری کے دل میں اس ماحول کے خلاف جن میں وہ سانس لیتے ہیں ایک خاموش احتجاجی چیخ بن کر جاگ اٹھتا ہے۔ سعادت حسن منٹو، احمد علی، انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے ان گنت افسانوں میں بھی انسانی تجربات اور دکھ درد کے سماجی تناظر کا احساس پریم چند کی یاد دلاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد صنعتی اور سائنسی ترقیوں، زمین داری کے خاتمہ اور بڑے شہروں میں مشینوں کے تسلّط نے سماجی رشتوں اور انسانی رویّوں پر دور رس اثرات ڈالے ہیں۔ گاؤں بھی اب شہروں کے قریب آ رہے ہیں۔ اخلاق اور انسانیت کے پرانے معیار اور قدیم ساعتی عہد کی اقدار

کا طلسم تیزی سے ٹوٹ رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کی راحتیں اور لعنتیں اپنا سکہ جمار ہی ہیں۔ اور بقول کارل مارکس اس نظام میں علیحدگی یا بیگانگی کا اذیت ناک احساس انسان کا مقدر ہے وہ لکھتا ہے۔

"صاحب جائداد و املاک طبقے اور پرولتاری طبقے دونوں ہی سرمایہ دارانہ نظام میں اجنبیت اور بیگانگی کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن اوّل الذکر طبقہ اس اجنبیت پر مطمئن ہے اور اسے روا رکھنا چاہتا ہے۔ جب کہ موخر الذکر طبقہ اس اجنبیت کو اپنے لئے سم قاتل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اجنبیت نہ صرف اس کی کمزوری اور بے بسی کا سبب ہے بلکہ اس کے غیر انسانی وجود کا باعث بھی یہی ہے۔"

ظاہر ہے کہ محنت کش انسانوں کی بیگانگی کا یہ مسئلہ پریم چند کے عہد میں ابھر کر نہیں آیا تھا۔ یہ اسی دور سے مخصوص ہے اور اس عہد کے افسانوی ادب میں نمایاں ہوا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے جن ادیبوں نے صورتِ حال کو مادّی حقائق کے تناظر میں عقلی اور حقیقت پسندانہ ڈھنگ سے سمجھا ہے وہ پریم چند کی روایت سے قریب رہ کر اسے اظہار کے نئے امکانات سے ہمکنار کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں بیگانگی کے داخلی اور خارجی مظاہر اور دوسرے عصری حقائق ٹھوس، مانوس اور متحرک پیکروں یا استعاروں میں نظر آتے ہیں۔ اور اس لئے ان کا تاثر، ان کی ترسیل، خیال انگیز اشاریت سے معمور ہوتی ہے۔ وہ پریم چند کی طرح عصری زندگی کی پیچیدگیوں کی آگہی اور بصیرت میں قاری کو شریک کر لیتے ہیں جیلانی بانو، جوگندر پال، اقبال متین، رام لعل، کلام حیدری، واجدہ تبسم، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، رتن سنگھ، آمنہ ابوالحسن، کنور سین، عابد سہیل اور نوجوان ادیبوں میں سلام بن رزاق، الیاس احمد گدی، انور قمر، سید محمد اشرف اور عبد الصمد ایسے فنکار ہیں جنھوں نے اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ پریم چند کی عظیم روایت کی توسیع و تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ انور سجاد، سریندر پرکاش اور بلراج مینرا کی بعض کہانیوں میں بھی اجتماعی آشوبِ حیات کی بڑی تیکھی جاندار اور سہ پہلو تصویریں ملتی ہیں۔

پریم چند کی روایت سے وابستہ، عصرِ حاضر کے ادیبوں کی تخلیقات میں زندگی اپنی پہنائی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ زیادہ کثیر الجہت، تہہ دار اور معنی خیز نظر آتی ہے۔ اس کے متوازی اس دور میں ایسے فنکار بھی ہیں جنھوں نے پریم چند کی روایت سے شعوری طور پر گریز کیا ہے۔ اور افسانہ کو شاعری اور تجریدی تخیل سے قریب تر لانے کی کوشش میں انفرادیت پسندی اور ماورائیت کی اس روایت سے اپنا رشتہ جوڑا ہے جسے اردو یا عالمی افسانہ میں رومانی احساس و فکر کی روایت کہا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ میرے موضوع سے خارج ہے۔

پریم چند کی تخلیقات میں بیگانگی اور تنہائی کا وہ احساس تو نہیں ہے جو خاص مشینی اور صنعتی عہد کی

دین ہے لیکن فرد کی تنہائی کا وہ عذاب جو طبقاتی استحصال اور ظلم و استبداد کی آہنی مشین میں پیس کر اسے حیوانوں کی سطح پر جینے پر مجبور کر دیتا ہے، پریم چند کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں میں ڈرامائی شدّت کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ پریم چند کے آرٹ میں ڈرامائیت، حیرت زا واقعات عمل کی تیزی یا اس کی تلافی کے لئے داستانی اور اساطیری عناصر کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ کرداروں کی انفرادی حیثیت، ان کے باہمی روابط اور اشخاص کی ذہنی اور جذباتی گھٹن اور تناؤ کے بیان میں ایسی حیرت خیز کیفیات پیدا کر دیتے ہیں جو ڈرامائی حسن سے معمور ہو کر قاری کے لئے ایک انکشاف بن جائے۔ دودھ کی قیمت، میں منگل کی اذیت ناک تنہائی اس کی ایک مثال ہے جس کی ماں گاؤں کے ایک امیر برہمن کے بچے کو دودھ پلا کر پالتی اور مر جاتی ہے اور منگل جو ماں کے دودھ سے محروم رہتا ہے۔ اسی بچے کے جھوٹے پتل چاٹ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں۔ "سخت جان منگل جھلستی ہوئی لُو، کڑاکے کے جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ اور تندرست تھا۔ بس اس کا ایک دوست تھا۔ گاؤں کا کتا جو اپنے ساتھیوں کے ظلم سے عاجز آکر، منگل کی پناہ میں آگیا تھا۔ دونوں ایک ہی کھانا کھاتے۔ ایک ہی ٹاٹ پر سوتے..... ٹامی کوں کوں کرتا دُم ہلاتا..... اور پر چڑھ جاتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔" پوس کی رات میں ہلکو کی دکھ بھری زندگی اور تنہائی کا رفیق بھی ایک کتا جبرا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں۔

"پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کی پتیوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی 'جبرا' پیٹ میں منھ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی.....
جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے 'جبرا' کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آرہی تھی۔ پر اُسے اپنی گود سے چمٹائے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔"

بھوک افلاس، بے چارگی اور بے حسی کی یہی وہ اذیت ناک تنہائی ہے جو 'سوا سیر گیہوں'، کا شنکر اور 'نجات' کا دکھی چمار محسوس کرتا ہے۔ اور اس کا نقطۂ عروج 'کفن'، کے گھیسو اور مادھو کی بے لاگ تصویروں میں نظر آتا ہے۔ گاؤں کا ہر آدمی ان سے نفرت کرتا ہے۔ انھیں کتے کی طرح دھتکارتا ہے اور وہ بھی اخلاق انسانیت اور عزتِ نفس کے ہر وصف سے آزاد حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں بھی کسانوں، کھیت مزدوروں اور ہریجنوں کی غریبی، تنہائی اور بے بسی کے ایسے ہی مرقع ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ظلم و جبر کی طاقتوں کے خلاف جنگ بھی کرتے ہیں جیسے منوہر اور بلراج،

(گوشۂ عافیت) سورداس اور ویرپال سنگھ (چوگان ہستی) منی اور آتمانند (میدان عمل) اور کچھ ایسے ہیں جو خاموشی سے جبر و استبداد کی چکّی میں پس جاتے ہیں۔ جیسے گئودان کا ہوری۔

پریم چند کی یہ شاہکار تخلیقات اوران کے جاندار کردار اس جبر و استبداد اور ان وحشیانہ بے انصافیوں کے خلاف بھرپور احتجاج ہیں جو طبقاتی سماج میں انسان کو مجبور، مجہول اور بے حس بنا کر تنہائی کے اندھیروں میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ احتجاجی فکر کی یہ زندہ روایت بھی عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور شوکت صدیقی سے ہو کر عصر حاضر کے بہت سے افسانہ نگاروں تک پہنچی ہے۔

پریم چند نے اپنے بعض مکاتیب اور مضامین میں اپنے نظریۂ فن کی وضاحت بھی کی ہے۔ وہ افسانوی ادب میں ٹالسٹائی کی طرح بشری عناصر اور اخلاقی تصادم کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پہلو پر بھی بڑا زور دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> "میرے اکثر قصّے کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا۔ تا وقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔"
>
> "موجودہ کہانی یا ناول کی بنیاد ہی نفسیات ہے۔ واقعات اور کردار تو اسی نفسیاتی حقیقت کو قایم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔"
>
> افسانہ تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی تصویر کشی کو ہی اپنا مقصود سمجھتا ہے اس میں تخیلی باتیں کم اور تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں تجربات تخلیقی تخیل سے دلچسپ ہو کر کہانی بن جاتے ہیں۔"

انسانی تجربات، تحلیل نفسی اور تخلیقی عمل کے ذریعہ انھیں دلچسپ اور ڈرامائی بنانا۔ افسانہ کے یہ ایسے ترکیبی اجزا ہیں جو پریم چند نے دنیا کے باکمال افسانہ نگاروں موپساں، ٹالسٹائی، چیخوف اور ٹیگور سے سیکھے ہیں جن کا ذکر انھوں نے عقیدت سے کیا ہے۔ پریم چند کے ڈھائی سو سے زائد افسانوں میں کم و بیش ایک تہائی افسانے ایسے ضرور ہیں جن میں ان عناصر کی متناسب ترکیب سے تاثر کی وحدت اور معنویت پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے 'کشمیر کے سیب'، اور 'شکوہ شکایت'، جیسے افسانے بھی لکھے جو کسی طرح کے پلاٹ اور کردار سے تقریباً عاری ہیں۔ اس کے باوجود یہ دلچسپ اور تاثر آفریں اس لئے ہیں کہ ان میں کسی بشری صورتِ حال کا انکشاف کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت اور جذبات کی گرہیں کھولی گئی ہیں۔ پریم چند نے 'ٹامی' اور 'دو بیل' جیسے علامتی افسانے بھی لکھے جن کے کردار انسان نہیں حیوان ہیں۔ جو اپنے ایسے مسائل پر سوچتے، خود کلامی اور گفتگو کرتے ہیں جو ان کے اور انسانوں

کے درمیان مشترک ہیں۔ جیسے خیر و شر کی شناخت یا غلامی اور استحصال کا مسئلہ —— الغرض پریم چند کے افسانوں کا جوہر وہ بشری عناصر ہیں جنھیں وہ اپنے تخیل کی تازہ کاری اور بیانیہ کی قوت اور سادگی سے شفاف اور جاندار روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کے قاری افسانہ کی تکنیک اور فارم یا اندازِ بیان کے حسن کو الگ سے محسوس ہی نہیں کر پاتا۔ وہ سب عضویاتی طور پر ایک دوسرے میں پیوست یا شیر و شکر ہو کر نمو پاتے ہیں۔ قاری یہ سمجھنے یا تمیز کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ کہاں واحد متکلم کی آواز ہے۔ کہاں بیانیہ، کہاں مکالمہ ہے کہاں خود کلامی۔ وہ تو انسان کی ذہنی پیکار، سماجی آویزش اور اخلاقی کشمکش میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کسی اور شے کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ایک خط میں پریم چند نے دعوی کیا ہے کہ ان کے افسانوں میں تکنیک کے کم و بیش وہ تمام تجربے ملتے ہیں جو یوروپ کے باکمال افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ نہ صرف عام قاری بلکہ بعض نقادوں کو بھی پریم چند کے افسانوں میں تکنیک کے اس تنوع کا احساس نہیں ہوتا۔ اور بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ وہ محض بیانیہ تکنیک کے افسانہ نگار ہیں۔

اگر ناشروں اور کتب خانوں کے ریکارڈ صحیح ہیں تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پچھلی نصف صدی میں، پریم چند ہی وہ ہندوستانی ادیب ہیں جن کی مقبولیت میں سال بہ سال اضافہ ہوا ہے۔ اور جو آج بھی سب سے زیادہ پڑھے جانے والے افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کی اس ہمہ گیر مقبولیت کا راز یہی ہے کہ وہ کسی ماورائی، ہیجان آفریں اور پُر اسرار دنیا کی ترجمانی نہیں کرتے۔ بلکہ افسانے میں عام انسان کی روز مرّہ کی زندگی کے ایسے حقائق دریافت کرتے ہیں جو دوسرے فنکاروں کی نظر سے اوجھل رہے۔ اور ان کو فن کا ایسا لباس دیتے ہیں جو ان کے اچھوتے حسن اور معنویت کو ابھارتا ہے۔ مثال کے طور پر "زیور کا ڈبہ"، 'جج اکبر'، 'گلی ڈنڈا'، 'روشنی اور مالکن'، جیسے افسانوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جہاں وہ انسان کو تنہائی کے ایسے لمحوں میں اور زندگی کے ایسے دھندلکوں میں دیکھتے ہیں جہاں کسی اور کی نظر نہیں پہنچی۔ انسان اپنے آپ میں کتنا پر اسرار ہے؟ وہ ماحول کی آسیبی طاقتوں کے شکنجے میں کیسی گھٹن محسوس کرتا ہے؟ اس کی خود پرستی اور انا کا طلسمی حصار اسے اپنے ہم جنسوں سے کتنا دور کر دیتا ہے؟ اس کے ظاہر اور باطن میں کیسا تضاد ہے؟

بیگانگی، ریاکاری اور اخلاقی کشمکش اس کے لئے کیسی روحانی اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار نفسیاتی وارداتیں ان کے افسانوں میں، قاری کو انسانیت کی روح سے قریب تر کرتیں اور اسے اعتماد اور عمل کی راہیں دکھاتی ہیں۔ یہی انسانی عناصر پریم چند کے فن کی اساس ہیں۔ پریم چند جانتے تھے کہ انسان کی توجہ اور تشویش کا سب سے بڑا مرکز خود انسان کی ذات ہے۔ اس کے معمولات، مشغلے اور مسائل ہیں، آفاقی سچائیوں کی تلاش، فلسفہ طرازی یا ایسی تجرید جو زندگی کی حقیقتوں کو روشن کرنے کے بجائے روپوش کر دے۔ کم از کم

افسانے میں ان انسانی وظائف وعناصر کا نعم البدل نہیں ہو سکتی جو اس کی شعریات کا جزو لازم رہے ہیں۔

اصغر علی انجینیر نے ایک مقالے میں پریم چند کے فن کی جمالیاتی کردار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"برطانوی حکومت نے صدیوں پرانے ہندوستانی سماج میں نئے پیداواری رشتے اور ایک حد تک نئی پیداواری طاقتوں کو جنم دے کر حرکت پیدا کر دی تھی۔ یہ ماضی کی طرح حکمرانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی۔ برطانوی حکومت نے ایک نئے سماجی نظام کو بھی جنم دیا تھا۔ پریم چند نے اپنی دور بین نگاہوں سے اس فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ ان کی آنکھیں کبھی خارجی چمک ودمک پر مرکوز نہیں رہیں۔ ان کی تیز بین نگاہیں اس (چمک ودمک) کے پیچھے دیہاتی ہندوستان میں پائے جانے والے تضادات اور یہاں کے مفلس عوام کی داخلی زندگی میں خام مواد تلاش کرتی ہیں۔ اور وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے امکانی اور حقیقی کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی اصل طاقت کا سرچشمہ ان ہی دیہات کے ان مفلس عوام میں نظر آیا جو اپنی زندگی میں معمولی سی خوشگواری پیدا کرنے کے لئے سخت سے سخت مشقتوں کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے فن کے ذریعے نہ صرف ہندوستان کی بنیادی سچائیوں تک رسائی حاصل کی بلکہ ہندوستانی ادب کو ایک ایسے جمالیاتی مذاق سے روشناس کرایا جو فن کی اعلیٰ ترین قدروں سے ہم آہنگ ہے۔ □

وحید اختر

سخن گسترانہ بات

[ہمیں خوشی ہے کہ اس شمارے سے اردو کے ممتاز شاعر اور نقاد وحید اختر "سخن گسترانہ بات" کے عنوان کے تحت موجودہ ادبی مسائل پر لکھنا شروع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی قسط پیش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی جا بجا درمیان میں کوئی ایسی بات آپڑے جس سے ہم اختلاف کر سکیں، لیکن اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح کچھ لکھنے والوں کو تحریک ہو۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ متنازعہ فیہ امور پر بحثیں چھڑتی رہیں لیکن اسے ادارہ کی پالیسی یا اس کا نقطۂ نظر نہ سمجھا جائے۔ ہم پروفیسر وحید اختر کے قلم پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگانا چاہتے کیوں کہ ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ وہ خود ایک ذمہ دار نقاد ہیں اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں۔ (ادارہ)]

---

(۱)

۱۹۵۸ء کی بات ہے، مرحوم "صبا" حیدرآباد اس وقت ایک سمت نما، فعال اور توانا ادبی رسالہ تھا۔ اس سال میرا نام مجلس ادارت میں شامل کیا گیا۔ ایک ڈیڑھ برس یا کچھ زائد عرصے تک سلیمان اریب کے ساتھ تخلیقات کے انتخاب سے لے کر رسالے کو فکر انگیز و بحث انگیز رکھنے کے لئے میں نے کئی نئے تجربے میں روشناس کئے۔ ان ہی میں "سخن گسترانہ بات" کا مستقل عنوان بھی تھا جو "صبا" کا حرفِ آغاز ہوا کرتا تھا۔ ہوا یہ کہ مقطع کی نوبت نہ آئی اور مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات آپڑی۔ اس وقت جدیدیت کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ترقی پسند رسائل کے صفحات جمود کا مسئلہ چھیڑ کر سرد ہو چلے تھے۔ نئی نسل کا مسئلہ سر اٹھا چکا تھا۔ غالباً سخن گسترانہ بات کے دوسرے یا تیسرے عنوان سے میں نے نئی نسل کے ذہنی رویے اور ادبی مزاج کی بات چھیڑ دی۔ اس ضمن میں ترقی پسند ادب کے مروجہ ادبی رویے اور اس پر مبنی تنقید

کے خلاف چند تنقیدی کلمات لکھ دیئے۔ یہ بات وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ بے ضرر شوشہ ایک ہنگامہ خیز ادبی مناظرے کا نقطۂ آغاز بن جائے گا۔ مرحوم سجاد ظہیر اس وقت راولپنڈی سازش کیس کے بعد تازہ وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ انھوں نے ترقی پسندی کی تائید اور اس پر نئی نسل کی تنقید کے بارے میں اپنے ٹھنڈے مزاج اور مرنجاں مرنج طبیعت کے برخلاف بہت گرم باتیں لکھ دیں۔ ان کا مضمون "ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے" کے ذیلی عنوان "سخن گسترانہ بات" کے ذیل میں شایع ہوا۔ آیندہ شمارے میں "سخن گسترانہ بات" کو میں نے جواب الجواب کے لئے عنوان دیا "تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے"۔ جواب اور جواب الجواب کی اشاعت کے بعد گذشتہ ربع صدی کا ایک اہم ادبی معرکہ چھڑ گیا۔ خود ترقی پسند ناقدین و ادبا میں سے کچھ نے میرے رویّے کی تائید کی مگر بیشتر بڑے ناموں نے اپنا نام پردۂ خفا میں رکھنا پسند کیا البتہ جنھوں نے بنّے بھائی کی تائید میں اشہبِ قلم کو مہمیز کیا وہ اپنے نام کے پورے طمطراق اور شہرت کے ساتھ میدان میں آئے۔ ہمارے دوست عالم خوندمیری نے اس مناظرے کو نماز میں "رفع یدین" کے فقہی اختلاف کے مماثل ٹھیرایا — لیکن اور حضرات نے اسے اتنا فروعی یا ضمنی اختلاف نہ سمجھا — ہندوستان اور پاکستان کے کئی ادبی جرائد نے اس مناظرے کی سلجھتی ہوئی ڈور کو اپنے صفحات پر اور الجھایا یا اپنے تئیں سلجھانے کی کوشش کی۔ سرور صاحب نے پہلی بار بغیر کسی شناسائی یا تعارف کے مجھے مبارکباد کا خط لکھتے ہوئے توازن برقرار رکھنے کے ساتھ آدابِ دلداری کو ملحوظ رکھنے کا بزرگانہ مشورہ دیا۔ پاکستان سے ابن انشا نے لکھا "بھائی یہ بحثیں اچھی ہیں، مگر آپ لوگوں کو اندازہ نہیں کہ ترقی پسندوں پر پاکستان میں کیا بیت رہی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ اس بحث کو آگے نہ بڑھایا جائے اور ترقی پسندوں کے ادبی کارناموں پر ایسی تنقید نہ ہو"۔ ابن انشا نے جو کچھ لکھا اس کا لُبِّ لباب یہی تھا۔ ۶۶ء میں سردار جعفری نے جن کی کتاب "ترقی پسند ادب" کا دوسرا ایڈیشن بھی میری تنقید کی زد میں آچکا تھا، میرے پہلے شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے "سخن گسترانہ بات" والے مناظرے میں میرے نقطۂ نگاہ کو وقت کے تقاضے کے مطابق اور جدلیاتی شعور کے معیار سے حق بجانب قرار دیا — خود مرحوم سجاد ظہیر کے ادبی تنقیدی رویّے میں آگے چل کر تبدیلی آگئی۔ انھوں نے میری شاعری کو صحیح معنی میں انقلابی قرار دیا۔

ادبی جرائد کے مستقل فیچر یا کالم (یہاں صفحات کہنا بہتر ہوگا) مستقل تنقیدی اہمیت حاصل کر سکیں یا نہیں لیکن اگر وہ ادب کے حالیہ مسائل پر لکھنے اور سنجیدہ پڑھنے والوں کی توجہ مرکوز کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں تو یہی ان کے وجود کا کافی جواز ہے۔

۵۵ء سے ۸۰ء تک رسالوں کے صفحات پر سرحد کے دونوں طرف بہت روشنائی بہائی جا چکی

ہے۔ اس وقت کی نئی نسل اب پرانی نہیں تو ادھیڑ یا پختہ کار ہو چکی ہے۔ بحثوں کی نوعیتیں بدل گئی ہیں تنقید کا لہجہ یا تو پہلے سے کہیں زیادہ تلخ و تند و گرم و تیز ہو چکا ہے یا مصلحتوں کا شکار ہو کر بے معنی لفاظی اور مدلّل مداحی بلکہ بیشتر صورتوں میں غیر مدلّل جانبداری و تعصب کی شکل اختیار کر گیا ہے یا تو 'آدابِ دلداری' کا سرے سے پاس نہیں یا سراسر 'آدابِ دلداری' ہی تنقید کی جگہ لے چکے ہیں۔ گذشتہ ۲۳ برسوں میں کئی نئی اصطلاحیں، فارمولے، کلیشے بنے، بگڑے اور ٹوٹے۔ ادب کا مزاج بدلا۔ نئی شاعری نے نظم و غزل میں اپنے کو مستحکم کیا۔ نئی تنقید کو اعتبار کا درجہ ملا۔ کئی نئے معتبر نام ابھرے۔ ترقی پسند شاعروں کے لہجے میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں اور ترقی پسند تنقید نے بھی جدیدیت کے کم از کم چند میلانات کی معنویت کو تسلیم کیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جدیدیت اور ترقی پسندی کی مناظرانہ بحث اب اپنے معنی کو کھو چکی ہے۔ دونوں ہی اصطلاحیں ادبی سے زیادہ غیر ادبی مقاصد کی تابع بن کر آج کے تخلیق کار کے لئے وقعت کھو چکی ہیں یہ مسئلہ یا اختلاف اب شاعروں یا افسانہ نگاروں کا نہیں رہا بلکہ چند ناقدوں، اماماِنِ ادب اور ان کے گنے چنے مقتدیوں کا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے اور یہ شعور عام ہو چلا ہے کہ ادب کو سب سے پہلے ادب ہونا چاہیے محض ترقی پسند یا جدید کا شناس نامہ سینے پر لٹکا کر کوئی تحریر ادب کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی ترسیل کی ناکامی یا ابلاغ کی کمی کا مسئلہ بھی اب جدید ادب کی شناخت کا وسیلہ نہیں رہا۔ شعر کے علامتی اظہار کو اب ترقی پسند بھی قبول کر چکے ہیں۔ سماجی شعور اور سیاسی مسائل کو بھی جدیدیت کے انتہا پسند دور کے برخلاف اب شجرِ ممنوع نہیں سمجھا جاتا یعنی اردو کا تخلیقی شعور مناظرانہ انتہا پسندیوں اور مبتدیانہ خام کاریوں سے بلند ہو چکا ہے۔

ان تمام خوش آیند تبدیلیوں کے ساتھ ایک اور تبدیلی بھی محسوس ہوتی ہے جو کوئی فال نیک نہیں سمجھی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر، شہرت، مطالعے، پختگیِ نظر اور منصب میں اضافے کے ساتھ تنقید کے قلم کی دھار کچھ کند ہو جاتی ہے جسے ہم ادبی رواداری سمجھتے ہیں، اسے کچھ بیباک زبانیں مصلحت اندیشی کا نام دیتی ہیں، اسی طرح نئے یا پرانے لکھنے والوں کی تعارف نگاری حق دوستی یا مروّت کہلاتی ہے۔ تبصرے کو تعصب کہا جاتا ہے۔ تنقید کے سخت لہجے کو غصہ اور ہزیمت خوردگی، تجزیے کو مفروضات کے بیان کا وسیلہ، مسائل کے وسیع تر احاطے کو علم کی نمائشِ بے جا اور حوالوں کی کثرت کو پریشان خیالی اور طالب علمانہ انداز کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بیشتر اعتراضات درست ہیں لیکن کچھ اعتراضات ادبی مزاج کی جلد بازی و جذباتیت اور کبھی کبھی ناپختگی و مقلدانہ روش کے نتیجے میں صادر ہوتے ہیں۔ راقم الحروف بھی ممکن ہے بعض اعتراضات کی زد میں آتا ہو۔ ۲۵ برس کے قریب ادبی مناظروں اور بحثوں کے دھاروں میں نبرد آزما رہنے کے بعد ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ ان ہنگاموں سے کنارہ کشی ہی میں عافیت ہے۔ اب ہر شخص وارث علوی کی طرح عمر کے ہر مرحلے پر جذبی کے لفظوں میں ناآموزدہ کار کی جرأت کہاں سے لائے کہ ادھر کوئی کتاب سامنے آئی یا کسی کی شاعری اور تنقیدی نظریات مزاج سے ناآہنگ محسوس ہوئے اور ادھر قلم کی لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے اور دوڑا لیا — لیکن یہ ماننے میں بخل نہیں کرنا چاہئے کہ موجودہ تنقید کی گرمی اور رستخیز ایسے ہی نقادانِ قلم بکف و نظریہ بردوش کی مرہونِ قلم ہے جو اپنی ذاتی رائے کو یدِ بیضا بھی سمجھتے ہیں اور دمِ عیسیٰ بھی۔

اطہر پرویز صاحب کے حکم کی تعمیل میں 'الفاظ' کے لئے مستقل فیچر لکھنے کا وعدہ کرتے ہوئے میں قارئین سے لازمی طور پر اس گرماگرمی اور فکری اشتعال انگیزی کا وعدہ نہیں کر سکتا جو زبان و دہن کو چٹ پٹا مصالحہ دے سکتی ہے۔ بس اتنا ہے کہ اتفاق میں اختلاف کے پہلوؤں کا لحاظ اور اختلاف کے حق سے اتفاق کرنے کے امکان کو نہ بھلانا چاہئے — 'صبا' کی سخن گسترانہ بات میں اختلاف کی لے کو 'نعرہ زن' بنتے دیکھ کر میں نے یاد دلایا تھا کہ والٹیر روسو سے سخت اختلاف رکھتے ہوئے بھی اس پر بندش کے خلاف تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اختلاف کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ روسو کو والٹیر سے بھی اختلاف کا حق ملنا چاہئے — آج ہم میں کوئی والٹیر ہے نہ روسو۔ لیکن پھر بھی اگر ہم ایک دوسرے کو خود اپنے سے اختلاف کا حق دیں تو یہ ہمارے ادب و فکر کی نشوونما کے لئے فالِ نیک ہوگا۔

(۲)

افسانہ نمبر کی مناسبت سے اس بار فکشن ہی کے کچھ مسائل اٹھائے جائیں تو مناسب ہوگا۔

کوئی ۳۰ برس قبل 'صبا' ہی میں جیلانی بانو کے ایک خط سے یہ بحث چھڑی تھی کہ ناولٹ اور طویل مختصر کہانی اور پھر مختصر افسانے اور طویل مختصر افسانے اور اسی کے ساتھ ناول اور ناولٹ میں حد امتیاز کیا ہے — یہ بحث نیا دور کراچی کے ایک ناولٹ نمبر پر میرے تبصرے کا شاخسانہ تھی — بحث میں کئی افسانہ نگاروں نے حصہ لیا، لیکن ناول اور افسانے پر کئی انگریزی مستند کتابوں اور نقادوں کی آرا کے حوالوں کے باوجود مسئلہ لاینحل رہا۔ چند ماہ قبل اس مسئلہ پر قرۃ العین حیدر سے گفتگو کا موقع ملا کہ وہ خود اپنے افسانوں اور ناولٹوں یا طویل مختصر کہانیوں میں کس طرح امتیاز کرتی ہیں۔ بات شاید اس نقطے پر آکر رکی کہ ناولٹ ناول کا MINIATURE ہے اور طویل مختصر کہانی افسانے کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ناولٹ کو ناول کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے اور طویل مختصر کہانی کو افسانے کے معیاروں پر پورا اترنا چاہئے — اسی ضمن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ 'ناول کیا ہے'؟ ایک نقاد نے اپنے مطالعۂ ادبِ مغرب کی رو میں لکھ دیا کہ "کارِ جہاں

درازہے" 'ناول ہی نہیں' — قرۃ العین اس پر برافروختہ تھیں۔ کوئی دوسرا ناقد یہ کہہ سکتا ہے کہ "کارِ جہاں درازہے" 'خود نوشت بھی نہیں'۔ خودنوشت میں وسط ایشیا کی تاریخ، اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کی داستان اور فلسفہ و تصوف کے نظریات کی تفصیل کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے؟ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ "کارِ جہاں درازہے" تاریخ بھی نہیں، ROMANCE بھی نہیں — ناول کو عہدِ جدید کا رزمیہ (EPIC) کہا گیا ہے لیکن یہ کیسا ناول ہے کہ کئی عہدوں کے رزمیوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ قرۃ العین کی اس تصنیف کو ہر پہلو سے دیکھنے کے بعد یہ سوال پھر سامنے آگیا کہ آخر ناول کی تعریف کیا ہے۔ شاید ناول کی کوئی تعریف نہیں۔ ناول سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ناول زندگی کی طرح ہمہ جہت اور متنوع ہے۔ اس میں فلسفے کی بھی گنجائش ہے، تاریخ کی بھی، نفسیاتی تجزیے کی بھی، اسطورسازی کی بھی، سفرنامے کی بھی، فینٹیسی (طلسم آفرینی) کی بھی، خودنوشت کی بھی حتیٰ کہ فنونِ حرب کی انتہائی تکنیکی بحث کی بھی۔ اگر ایسا نہیں تو ٹالسٹائی کی جنگ و امن کے ان مسلسل ابواب کو ناول کے دائرے سے خارج کرنا ہوگا جن میں اس نے جنگ کی نقشہ بندی (STRATEGY) سے بحث کی ہے۔ والٹیر کی کاندید لائبنز کے فلسفے پر طنز ہے۔ سوئفٹ بنیادی طور پر طنز نگار ہے بلکہ ہجو نگار۔ گوگول کی "مردہ روحیں" حقیقت اور متخیلہ کی آمیزش ہے۔ تاریخی ناول کو ماضی پرستی کے قلم نے اردو میں بھی بہت لکھے، ہر معیار اور سطح کے — مارسل پروست کی "ماضی کی یادوں" کے سلسلے کے ناولوں کے حدود کیا ہیں؟ ناول کے حدود کے تعین میں "آگ کا دریا" کا پہلا حصہ بھی معرضِ بحث میں آچکا ہے۔ ناقدین ان حدود کا تعین کرتے رہیں، ان کا جو فرض ہے اربابِ تنقید جانیں۔ قرۃ العین کا کام ناول لکھنا ہے اور جس تخلیق کو ناول کہیں ہمیں اس وقت تک ناول ماننا پڑے گا جب تک ہم اس پر اعتراض کے لئے کوئی قوی دلیل نہ لائیں اور قوی ترین دلیل یہی ہو سکتی ہے کہ قرۃ العین سے بہتر ناول کوئی لکھے جو شاید موجودہ نسل کے لئے ناممکن ہے۔

پریم چند کے ناولوں کو چھوڑ کر آگے بڑھئے تو اردو میں ناول کے سفر میں چند ہی روشن نشانات ملتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی"، "آگ"، "ہوس"، "مرمر اور خون"، "گریز"، کرشن چندر کا "شکست" اور "جب کھیت جاگے" (دوسرے ناول قابلِ ذکر نہیں) عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر"، "معصومہ" اور اب کربلا پر ان کا ناول۔ خواجہ احمد عباس کا "انقلاب"، غلام عباس کا "گوندنی والا تکیہ"، حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول"، شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی"۔ ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی"، خدیجہ مستور کا "آنگن"، جیلانی بانو کا "ایوانِ غزل"، بیدی کا ناولٹ (یا ناول؟) "ایک چادر میلی سی"، جمیلہ ہاشمی کا "تلاشِ بہاراں"، عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں"، حال میں انتظار حسین کا ناول "بستی" شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ احسن فاروقی،

رضیہ فصیح احمد، قاضی عبدالستار اور احمد ندیم قاسمی کے بھی ناول ہیں۔ ان میں سے کچھ میری نظر سے نہیں گزرے۔ میں اس فہرست میں ایم اسلم، تیسی رام پوری، اے آر خاتون اور ان کی امت کی خواتین ناول نگاروں کو اس فہرست سے ادب و احترام کے ساتھ خارج کر رہا ہوں۔ البتہ ناول کی تعریف اور حدود کے جویا معترض نہ ہوں تو میں مشتاق احمد یوسفی کی "زرگزشت" کو بھی ناول کی صف میں شامل کرنے پر آمادہ ہوں اگرچہ خود یوسفی نے اسے ناول نہیں کہا ہے صرف گنتی مقصود ہو تو ناول نگاروں اور ناولوں کی بڑی طویل فہرست بن سکتی ہے۔ پریم چند سے پہلے شرر ہیں جن کا ناول "فردوس بریں" بہرحال ایک اچھا ناول ہے۔ رسوا کا ناول امراؤ جان ادا اردو میں کلاسیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادبی پایے کے اچھے ناول چند ہی ہیں۔

اردو کے چند اعلیٰ ناولوں میں جسے بری طرح نظر انداز کیا گیا وہ "علی پور کا ایلی" ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان میں ممتاز مفتی کے اس ناول کے مقابلے میں آدم جی انعام جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاشِ بہاراں" کو ملا۔ خیر ادبی انعامات، وہ کسی تجارتی ادارے کے ہوں یا حکومت کے یا اکیڈمیوں کے، ان کی سیاست ہی اور ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں تو تخلیقی ادب کے مقابلے میں خشک تحقیق و تنقید کو بڑے سے بڑے ادبی انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے تو پھر بھی ناول لکھا تھا۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ابتدائی چند افسانوں اور طویل مختصر کہانیوں سے پڑھنے والوں کو فوری طور پر متوجہ کر لیا تھا۔ ان میں بڑے امکانات نظر آئے۔ شاید اسی بنا پر "تلاشِ بہاراں" کے حجم سے پاکستانی انعام نواز دھوکا کھا گئے۔ "تلاشِ بہاراں" کی ناکامی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر اچھا افسانہ نگار اچھا ناول نگار نہیں بن سکتا۔ اسی طرح جیسے ہر غزل گو اچھی نظم یا طویل نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ناول کے لئے زندگی کا گہرا اور وسیع مشاہدہ، کرداروں اور پلاٹ کی پیچیدگیوں کو دیر اور دور تک سنبھالے رکھنے کی صلاحیت اور دیرپا تخلیقی جذبہ چاہئے ـــ قرۃ العین کی تقلید میں کسی پورے دور کو ناول کا موضوع بنا لینا تو آسان ہے لیکن اس کے ساتھ انصاف کرنا بہت مشکل جب تک اس کی سی دقتِ نظر و وسعتِ مطالعہ اور تخلیقی صلاحیت نہ ہو۔ خدیجہ مستور کا آنگن اس لئے کامیاب ہے کہ انھوں نے کوئی بڑا مطالعہ طلب موضوع چننے کے بجائے اپنے تجربات کی محدود دنیا ہی کو موضوع بنایا اور اور اس لحاظ سے "آنگن" اردو کے کامیاب ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ یہی بات ان سے پہلے عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" کے لئے کہی جا سکتی ہے۔ "علی پور کا ایلی" بھی موضوع کے محدود ہونے کے باوجود نفسیاتی تحلیل کے تقاضوں اور زندگی میں جنس کے اظہارات اور ان کے صریح اور علامتی بیان کے تمام پہلوؤں کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا کامیاب ترین ناول ہے لیکن اس پر ہندوستان یا پاکستان کے نقادوں نے کوئی توجہ ہی نہیں کی ـــ اسے تجاہلِ عارفانہ کہا جائے یا ادبی بددیانتی یا تعصب؟

اس جملۂ معترضہ سے قطع نظر کہنا یہ ہے کہ قرۃ العین نے پے در پے ایسے موضوعات چنے جو زندگی کو (افلاطون کے لفظوں میں) تمام زمان و مکان کے تناظر میں دیکھنے سے عبارت ہیں۔ "کارِ جہاں دراز ہے" سے پہلے "سفینۂ غمِ دل" اور "میرے بھی صنم خانے" میں وہ خود نوشت کو افسانوی اظہار بنا چکی تھیں۔ یہی نہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کی بیشتر کامیاب کہانیوں میں بھی خود نوشت کا عنصر غالب ہے۔ خود "آگ کا دریا" کا دوسرا حصہ ان کی اپنی مہاجرت، جلاوطنی اور جڑوں کی تلاش کا قصہ ہے ـــ "کارِ جہاں دراز ہے" میں خود نوشت کو زمان و مکاں کے کلی تناظر میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اس میں تاریخ ہی نہیں اسطور سازی بھی ہے، علامتی پیرایۂ بیان بھی اور یہی اس نامکمل ناول کی انفرادیت کا راز ہے ـــ وہ اس طرح کے تجربے افسانوں میں "ملفوظات" اور "یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے" میں کامیابی سے کر چکی تھیں ـــ کارِ جہاں... انہی کی ہر لحاظ سے توسیع ہے جس میں زندگی اور تجربے ہی کے نہیں فکر و مذہب اور عدم و مرگ کے ابعاد بھی شامل ہو گئے ہیں ـــ قرۃ العین، یہ ماننا پڑے گا، کہ اب تک اردو کی سب سے بڑی ناول نگار ہیں۔ "آخرِ شب کے ہم سفر" لکھ کر انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ محض اس "شعری اسلوب" کی پابند نہیں جس کی بنا پر کچھ ناقدین ان کی نثر کو ناول کے لئے ناموزوں قرار دیتے ہیں۔ بنگال کی زندگی اور سماج پر لکھنے کے لئے انھوں نے اپنے اسلوب میں بنگالی ناولوں کی حقیقت نگاری اور سادہ بیانی سے پورا کام لیا ہے اور وہ اس تجربے میں بھی کامیاب رہی ہیں ـــ یہ ان کا اپنے مخصوص اسلوب سے انحراف ہے مگر تخلیقی اس طرح قرۃ العین نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ شعری رزمیہ اسلوب کے ساتھ سادہ بیانیہ اسلوب کا بھی حق ادا کر سکتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو تہ داری، گہرائی اور جامعیت ان کے رزمیہ اسلوب میں ہے، وہ سادہ بیانیہ میں نہیں ـــ قرۃ العین کی کامیابی ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ علامتی طرزِ اظہار میں نیا پن سہی، معنویت کا امکان سہی لیکن شاید ناول اور افسانے کے لئے وہ بیانیہ اسلوب ہی زیادہ سازگار ہے جس میں علامتی اور رمزیہ اظہار سے کام تو لیا جائے مگر اس کو مقصود بالذات نہ مان لیا جائے۔ شعر کی صنعتیں اظہار کے وسائل میں ممد ہوتی ہیں۔ شعری اظہار کا منتہی نہیں اور اچھا شاعر ان کا استعمال بھی عموماً غیر شعوری طور پر ہی کرتا ہے۔

علامتی طرزِ اظہار میں دو ناولیں چند مہینوں میں سامنے آئی ہیں۔ ایک بڑے طمطراق اور آن بان سے چھپی ہے "نرتا" جو بجائے خود طباعت اور صوری حسن کا اعجاز ہے دوسری "لہو آستیں کا" جو بہت معمولی انداز میں عام سے گرد پوش، عام سے کاغذ اور اوسط سے بھی خراب کتابت کے ساتھ چھپی ہے۔ "نرتا" کے مصنف ہیں صلاح الدین پرویز اور "لہو آستیں کا" محسن علی کی تصنیف ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ دونوں کا

موضوع ایک ہی ہے عورت مرد کا رشتہ ، دونوں کا اسلوب علامتی ہے اور دونوں پر اسطوری فضا چھائی ہوئی ہے ۔ فرق یہ ہے کہ صلاح الدین پرویز کی زبان شعری ہے اور محسن علی کی رومانی نثر کی زبان ہے صلاح الدین پرویز اپنی کہانی میں پراسراریت اور رمزیت کو شعری اسلوب کے سہارے آخر تک برقرار رکھ سکے ہیں جب کہ محسن علی کا نثری اسلوب کہیں کہیں رمزیت کا ساتھ نہیں دے سکا ہے اور سپاٹ بیان بن گیا ہے ۔ یہ دونوں ناولیں اردو کی عام ناولوں کی ڈگر سے ہٹی ہوئی ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ عام قاری انھیں کس حد تک قبول کرتا ہے اور ناول و افسانے کے ناقدین انھیں کس روشنی میں دیکھتے ہیں ۔

اردو میں ناول کی تہی دامنی کو ہر طرح کے تجربوں کی ضرورت ہے ۔

(۳)

علامتی اظہار کا ذکر آگیا ہے تو مقطع میں کچھ باتیں اس کے متعلق بھی کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔

گذشتہ چند برسوں میں ہمارے ادبی جرائد تجریدی اور علامتی کہانیاں کثرت سے شایع کر رہے ہیں بلکہ اب تو افسانوں میں کہانی شاذ ہی ہوتی ہے ۔ علامت اور علامتی اظہار ہی سب کچھ ہونے لگا ہے ۔ میں اب تک تجریدی کہانی کی کسی تعریف سے دوچار نہیں ہوا مصوری میں تجریدیت قابل فہم ہے کہ رنگ اور خطوط کی زبان اشاراتی ہوتی ہے لیکن لفظوں کی زبان ہمیشہ کسی مرئی مقرون حقیقت کا اشاریہ ہوتی ہے ۔ الفاظ مجرد سے مجرد تصور کو بھی ٹھوس پیکر ہی میں سامنے لاتے ہیں ۔ تجرید اور علامت یا اشارے میں فرق ہے ۔ الفاظ اشارہ بھی ہوتے ہیں ، علامت بھی ، رمز بھی اور استعارہ بھی ۔ ادب مجرد تصورات کو بھی مرئی پیکروں میں ڈھالنے کا فن ہے ـــــ ادب میں افسانہ اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے بھی کسی حقیقی یا فرضی واقعے کا بیان ہے ۔ یہ واقعہ تاریخی بھی ہو سکتا ہے ، زمانی بھی ، نفسیاتی واردات بھی ، تاثر کا زائیدہ بھی ـــــ لیکن کہانی میں واقعہ کو بہر حال اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ کہانی واقعے کا بیان ہے ـــــ اسی لئے کہانی کا اسلوب ہمیشہ سے بیانیہ رہا ہے ۔ حتیٰ کہ طلسمات آفرینی بھی بیان ہی کے سہارے بڑھتی ہے ، یہ اور بات ہے کہ آج ہم پرانی داستانوں اور قصوں ، حکایات اور اساطیر میں رمز و استعارہ تلاش کر کے انھیں نئے معانی پہنائیں لیکن ان کی مقبولیت کا راز "کہانی پن" میں ہے ۔ جس چیز کو تجریدی کہانی کہا جاتا ہے اور جسے کبھی کبھی اقلیدسی شکلوں ، نقطوں اور ریاضیاتی یا کیمیائی علامتوں میں لکھا جاتا ہے ۔ وہ زبان کے استعمال کی نادر مشق سہی ، کہانی کا حق ادا نہیں کرتی ۔ اسی لئے قارئین میں دلچسپی پیدا نہیں کرتی ۔ اب تجریدی کی اصطلاح تو مفقود الخبر ہوتی جا رہی ہے لیکن علامتی کہانی کی اصطلاح روز افزوں فروغ پا رہی ہے ۔ کرداروں کی جگہ علامتیں لے

رہی ہیں ، ٹھیک ہے ۔ لیکن واقعہ کی جگہ علامتوں کا تانا بانا لے تو کہانی اس میں گم ہو جاتی ہے ۔ کافکا کی ناولیں بھی علامتی ہیں لیکن اس کے یہاں کردار علامتیں بنتے ہیں نہ کہ علامتیں کردار ۔ اس کے ساتھ واقعہ کا بیان بھی ہوتا ہے اور کہانی کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے ۔ ہمارے یہاں آج کل جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں ان میں سے اکثریت ایسی ہے جنھیں چند سطروں کے بعد پڑھنا بھی محال ہوتا ہے ۔ ہر فن کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ، افسانے کا تقاضا خود افسانہ ہے ـــــ کسی اور وسیلے کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو مقصود ہاتھ سے گم ہو جاتا ہے ۔ دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ عام طور سے تقلیدی روش کی جدید شاعری کی طرح اس نئے افسانے کی علامتیں بھی آتی طے شدہ ، گھسی پٹی اور یکساں ہوتی ہیں کہ ان میں معنی کی تعیین تلاش ہی نہیں کی جا سکتیں ـــــ بصرہ یہ علامتیں چند مخصوص داخلی وارداتوں تک محدود ہوتی ہیں ـــــ اکثر کہانیوں میں "میں" یا "وہ" مرکزی کردار ہوتا ہے جو اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنے سے اور دوسروں سے الجھتا ہے ۔ اپنی تلاش کا مسئلہ یا اپنی شناخت کا بحران آج کا اہم مسئلہ سہی لیکن کیا اس کا اظہار محض اسی سادہ سہل انگار طریقے ہی سے ممکن ہے ۔ یہ تخلیق کی طرفہ کاری نہیں اس کے عجز کا اظہار ہے ۔ اردو میں علامتی کہانیاں انتظار حسین نے لکھیں ، جیسے کٹی یا زرد کتا اور آخری آدمی لیکن ان میں کہانی کی دلچسپی ہے اور واقعہ کے بیان کی روایتی دلچسپی کی جگہ پر اسرار فضا نے لے لی ہے ۔ انور سجاد نے دوسرے انداز میں علامتی کہانی لکھی ، ان کا اسلوب کم دلچسپ اور تقلید کاروں کے لئے زیادہ مشکل تھا لیکن انور سجاد کی کہانی میں کہانی پن کی کمی اور علامتوں کے استعمال کو تو ہمارے جدید علامتی کہانی کاروں نے اپنا لیا ۔ اس کے معانی کی تہ تک غوطہ نہ لگا سکے ۔ آج جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں ان میں بیشتر انتظار حسین اور انور سجاد کے تجربوں اور اسلوب کا آمیزہ ہوتی ہیں ۔ اکثر نہ تو اساطیر و قصص سے کوئی معنی خیز کام لے سکتی ہیں نہ خود اپنے آپ میں کوئی اسطوری فضا تخلیق کر سکتی ہیں ـــــ زندگی بہت وسیع ، رنگا رنگ ، متنوع ، پہلو دار اور تہ دار ہے ۔ اس کا بیان بھی تنوع ، رنگا رنگی ، پہلو داری اور تہ داری کا متقاضی ہے ۔ محض علامت اور اس کے تخلیقی استعمال کے نام پر زندگی اور اس کے تجربات و مظاہر کو چند بندھی ٹکی مفروضہ علامتوں میں قید نہیں کیا جا سکتا ـــــ اسی لئے اس قبیل کے نسبتاً بہتر تجربوں میں بھی کہانی پن کی کمی ہوتی ہے ـــــ جس طرح وہ شاعری ناکام ہے جو پڑھی ہی نہ جا سکے ، وہ کہانی بھی ناکام ہے جسے مکمل کئے بغیر ادھورا یا چوتھائی چھوڑ دیا جائے ـــــ کہانی پڑھنے والے پر اگر اپنے کو مسلط نہیں کرتی اور اس کے تخیل کو اپنی گرفت میں نہیں لیتی تو وہ خام ہے ۔ کہانی قاری کو اپنے بہاؤ میں شامل کر لیتی ہے نہ کہ اٹھا کر دور پھینک دیتی ہے ۔

ہمارے یہاں فن کار اور مدیر حضرات سب ہی تقلید پرستی اور فیشن کے گزیدہ ہیں ۔ حیرت تو اس

پر ہوتی ہے کہ وہ ادبی رسائل بھی جو ترقی پسندی اور اس عنوان سے ابلاغ اور سماجی آگہی کے معترف ہیں ایسی کہانیاں کثرت سے اور نمایاں طور پر شایع کرتے ہیں ـــــ کہانیوں کے انتخاب میں "کتاب" کی روش شب خون سے مختلف نہ تھی۔ مشہور ناموں کے لحاظ سے فرق ہو تو ہو کہانیوں کی اکثر ناقابلِ ترسیل فضا کے لحاظ سے آہنگ، سطور، شعور، جواز اور خود الفاظ میں کوئی وجہِ امتیاز تلاش کرنا مشکل ہے۔

اردو میں انتظار حسین اور انور سجاد کے بعد کامیاب ترین کہانیاں جن میں علامتی طرزِ اظہار سے کہانی کی فضا پیدا کی گئی ہے۔ سریندر پرکاش، بلراج مینرا، احمد ہمیش اور خالدہ اصغر نے لکھی ہیں۔ ان میں خالدہ اصغر کی کہانی بیانیہ کہانی سے یکسر منقطع نہیں ہوتی۔ سریندر پرکاش بیانیہ کہانی کی روایت سے منقطع ہو کر بھی کہانی سے دست بردار نہیں ہوتے۔ کردار کتنے ہی غیر حقیقی کیوں نہ معلوم ہوں لیکن وہ جس تانے بانے میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں وہ کسی غیر حقیقی ہی سہی لیکن وقوعہ کے بیان کا وسیلہ بنتے ہیں۔ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" نے تجربے کے باوجود کہانی کے بنیادی تصور کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ ان کے ایک افسانے "جنگی زاں" کا تجزیہ میں نے شب خون کے لئے کیا تھا۔ ممکن ہے میں اپنے تجزیے میں "بطنِ افسانہ نگار" تک نہ پہنچ سکا ہوں لیکن اس میں معنویت اور کہانی دونوں کا امکان بہر حال تھا۔ آج کی تقلیدی علامتی کہانیوں میں اکثر یہ امکان مفقود ہوتا ہے۔ بلراج مین را کا طرز مختلف ہے۔ ان کے یہاں زیادہ ابہام ہے۔ کہیں کہیں کہانی پن بھی غائب ہو جاتا ہے لیکن ان کے علامتی اظہار کے سماجی، سیاسی مضمرات بہت وسیع ہوتے ہیں یہی ان کی انفرادیت ہے۔ فکشن کے ایک سیمنار میں میں نے مین را سے سوال کیا تھا کہ جب آپ سیاسی، سماجی طور پر بائیں بازو کے نظریات کو قبول کرتے ہیں تو کہانی میں اس قدر ابہام کیوں برتتے ہیں کہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کہانی ویت نام پر ہے عام قاری اس کے معنی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا؟ واضح سیاسی عقائد نسبتاً واضح تر ابلاغ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مین را اور سریندر پرکاش دونوں کو زبان کے تخلیقی استعمال پر بڑی قدرت ہے۔ ان کی کہانی کو ان کی زبان غیر دلچسپ ہونے سے بچا لیتی ہے۔ احمد ہمیش زبان کا استعمال لسانی قواعد اور ادبی محاورے کو توڑنے کے وسیلے سے کرتے ہیں، جہاں ان کا یہ تجربہ کامیاب ہے۔ ان کی اچھی شاعری کی طرح ان کے افسانوں میں بھی تازہ کاری و فضا آفرینی ہے۔ جہاں وہ ناکام ہوئے ہیں وہاں زبان نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اگر ان کی کہانیوں میں سے غلاظت کے بیان کا عنصر کم ہو جائے تو وہ حواس کی سطح پر بھی متاثر کر سکتے ہیں اس لئے کہ ان کے یہاں جذبے کی توانائی ملتی ہے۔

بلراج کومل اور کمار پاشی دونوں بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی کہانیوں میں نظموں کا در و بست اور ایجاز ملتا ہے۔ شعر نے انھیں علامتوں سے کام لینے کا گُر دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں بہتر طور پر

سکھا دیا ہے۔ بعض نسبتاً پرانے اور بیانیہ کہانی کے رمز شناسوں نے بھی علامتی اسلوب کو برتنے کی کوشش کی ہے ان میں اقبال متین (گریو یارڈ) اور غیاث احمد گدی قابلِ ذکر ہیں۔ عوض سعید کے افسانوں کا مجموعہ بیشتر علامتی کہانیوں پر ہی مشتمل ہے حالانکہ ابتدا میں انھوں نے کرداروں پر مبنی اچھی کہانیاں لکھی تھیں بلکہ شاید انھی "کردار مرکز" کہانیوں نے انھیں علامتی اسلوب میں بھی کردار سازی اور واقعہ نگاری کو برتنے کا راستہ سجھایا ہے۔ اس طرح کے بعض تجربے حیدرآباد کے قدیر الزماں نے بھی کئے ہیں ـــــ اقبال مجید، رتن سنگھ، عابد سہیل نے علامتی طرز کو وسیلے کے طور پر برتا ہے، اپنے آپ کو بالکلیہ اس کے سپرد نہیں کیا۔ علامتی اسلوب کی مقبولیت (افسانہ نگاروں میں) کا ثبوت یہ بھی ہے کہ رام لعل اور جیلانی بانو کے بعض افسانوں میں بھی اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جیلانی بانو بیانیہ کی بہت کامیاب کہانی کار ہیں، واقعیت کا سادگی سے بیان ان کی خصوصیت ہے لیکن یہ سادگی اپنے اندر گہرائی بھی رکھتی ہے۔ ان کے ناول "ایوانِ غزل" کی فضا میں جو رمزیت ہے وہ واقعات کے اکہرے بیان سے بہت آگے کی چیز ہے۔

افسانہ نگاروں میں جوگندر پال اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انھوں نے بیانیہ اور علامتی اسلوب کے درمیان دونوں کی معنی خیز آمیزش سے وہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں واقعات کا بیان آفاقی سچائیوں اور کہیں کہیں مابعد الطبیعیاتی مسائل کے حل کی تلاش بن جاتا ہے۔ انھوں نے علامتی اظہار سے معنی آفرینی کا کام لیا ہے لیکن اسے ہی کُل نہیں سمجھا۔ علامتی طرزِ اظہار کو اپنانے کی کوشش میں فنی ناکامی سے دوچار ہونے کی سب سے عبرت ناک مثال انور عظیم ہیں جن کا ترقی پسندی کا پروردہ مزاج باوجود شعوری کوشش کے اس تخلیقی اظہار سے کام نہ لے سکا۔ وہ اپنی چال بھی بھول گئے۔

علامتی اظہار اور رمزیہ اسلوب محض آج کی مروجہ علامتی کہانی سے مخصوص نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے جیسا کام منٹو نے لیا ہے، اب تک کوئی اور نہ لے سکا۔ بیدی کی بہترین کہانیوں میں بھی اس اسلوب کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ایک افسانہ نگار جس کی اہمیت اور اپنے دور پر اثر اندازی کی اہمیت کو بہت کم کر کے دیکھا گیا ہے احمد ندیم قاسمی ہیں ـــــ ان کے افسانے "کفن دفن" اور "الحمدللہ" بظاہر بیانیہ انداز کی روایتی کہانیاں ہیں لیکن ان کی فضا میں بڑی گہری رمزیت ہے۔ میں ان کہانیوں کو جو جدید کہانی کے فروغ پانے سے قبل لکھی گئی ہیں سادہ حقیقت نگاری اور علامتی اظہار کے درمیان کی اہم ترین کڑیاں سمجھتا ہوں۔ اسی ذیل کی ایک کہانی حیات اللہ انصاری کی "آخری کوشش" ہے جسے بلاشک و شبہ اردو کی بہترین کہانیوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کہانی میں فقیرا، اس کا بھائی اور بوڑھی ماں جو وسیلہ گداگری بنائی جاتی ہے سب علامتی معنویت کے حامل ہیں۔ یہی نہیں اس کا مخصوص انداز میں ہاتھ چلانا اور کھانے کی رٹ لگانا بھی علامتی اہمیت رکھتے ہیں۔

"کفن" کے بعد شاید موجودہ معاشرے کی بے رحمی و بے معنویت پر یہ سب سے بے رحم طنز ہے ـــــ اپنی علامتیت کے باوجود آخری کوشش اول و آخر کہانی ہے۔

گذشتہ چند دنوں میں دو نئے افسانہ نگاروں کے مجموعے پڑھنے کا موقع ملا۔ دونوں علامتی کہانی کے اچھے نمائندے ہیں۔ قمر احسن اور احمد یوسف۔ قمر احسن کے مجموعے کی کئی کہانیاں علامتی ہوتے ہوئے بھی سماجی اور سیاسی معنویت رکھتی ہیں جیسے پہلی ہی کہانی "تعاقب" ـــــ انھوں نے اساطیر سے بھی کام لیا ہے اور اسلامی روایت سے بھی۔ جہاں ان کی کہانیاں ناقابلِ فہم نہیں ہوئیں بہت کامیاب ہیں۔ سُنا حال میں اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ان کے مجموعے "آگ الاؤ صحرا" کو اس لئے کوئی انعام نہیں دیا کہ کچھ ارکان کو ان کے یہاں جنس کے بیان میں عریانیت کا شائبہ نظر آیا۔ اسی طرح کا حادثہ چند برس قبل آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی مجلس تقسیم انعامات میں اقبال متین کے ایک ناول کے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں ادب میں عریانیت یا جنس کے بیان کے حدود کی بحث میں پڑے بغیر (کہ یہ بحث خود دفتر طلب ہے) انعام نواز کمیٹیوں کی توجہ اس نکتہ پر مرکوز کرنا چاہوں گا کہ ادب کے اپنے آداب، اپنی اخلاقیات اور اپنی شریعت ہوتی ہے جو جامد اور بستہ اخلاقیات سے زیادہ گہری اور دور رس ہوتی ہے۔ ادبی فیصلوں کی بنیاد ادبی ہونی چاہئے نہ کہ سیاسی، مذہبی یا نظریاتی۔

دوسرا مجموعہ احمد یوسف کا "آگ کے ہم سایے" ہے۔ احمد یوسف نے علامتی اظہار کو بیانیہ سے الگ نہیں کیا، اسی لئے ان کے یہاں کہانی پن ہے اور چونکہ کہانی پن ہے، اس لئے دلچسپی ہے۔ غزل کے شعر کی طرح تو نہیں لیکن مختصر نظم کی طرح ان کے یہاں ایجاز و رمزیت ہے اور اس لحاظ سے میں ان کے اس مجموعے کو اردو میں جدید طرز کی کہانیوں کی کامیاب مثالوں میں شمار کرتا ہوں۔ اس ذیل میں کلام حیدری کی بھی چند کہانیاں آتی ہیں۔

علامتی کہانی اور علامتی اظہار اور اس کے امکانات کے اس سرسری اور شاید تشنہ جائزے کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامتی کہانیاں وہی کامیاب ہوتی ہیں جو کہانی کے مطالبوں کو پورا کریں اور جن میں علامت مقصود بالذات نہ ہو بلکہ کسی واقعے، کسی خارجی یا داخلی واردات، کسی تاثر، کسی کیفیت، کسی یاد یا کسی تصور کے افسانوی اظہار کا وسیلہ ہو ـــــ ابھی اردو کہانی کو اس اسلوب کے امکانات کو بہت کھنگالنا اور برتنا ہے۔

ـــــ آج بھی ہمارے بہترین کہانی نگار وہ ہیں جن کو موٹی اصطلاح میں بیانیہ کہانی کار کہا جا سکتا ہے جیسے عصمت، بیدی، قرۃ العین ـــــ صرف ایک تجربہ پسند (علامتی) افسانہ نویس ان کی سطح کو چھو سکا ہے اور وہ انتظار حسین ہیں ـــــ لیکن یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اب ناقدین و قارئین کے ایک حلقے کو یہ شکایت ہو چلی ہے کہ انتظار حسین اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں ـــــ اگر یہ بات غلط نہیں تو سوچنا چاہئے کہ کیا انتظار حسین جیسا خلاق ذہن

بھی اپنے اسلوب کے حصار میں قید ہو سکتا ہے؟ یا پھر کہیں یہ بات تو نہیں کہ علامتی اساطیری اسلوب خود اپنے آپ اپنے مسائل و موضوعات اور اپنے کرداروں کو محدود کر لیتا ہے؟

اردو کہانی کے سفر میں علامتی اظہار اور اس کے امکانات کو برتنے کے تجربات نامعلوم راہوں کے نئے سنگ میل تو ہیں منزلِ مقصود نہیں۔

یہ کہنا یا منوانا کہ علامتی کہانی ہی جدید کہانی ہے ویسا ہی مغالطہ ہے جیسے یہ ماننا کہ:

جدید شاعری آزاد نظم ہے

آزاد نظم رمزیہ ہے

∴ جدید شاعری رمزیہ ہے

جب تک پہلے اور دوسرے دعووں کی صداقت مسلّم نہ ہو استنباط منطقی مغالطہ کہلاتا ہے۔ جدید شعر و افسانہ دونوں کے لئے یہ دعویٰ کہ وہ کسی مخصوص اسلوب یا طرزِ اظہار میں محدود ہیں ادب کے ساتھ ناانصافی ہے۔ شعر ہو یا افسانہ اس میں ہمیشہ ہر طرح کے اسلوب اور ہر طرح کے تجربے کی گنجائش رہتی ہے اور رہے گی۔ جب کسی خاص صنف یا طرز کو اچھے تخلیقی ذہن میسر آ جائیں وہ اپنے امکانات کو افشا کرتی ہے۔ ادبی اصناف تخلیقی صلاحیت سے آگے بڑھتی ہیں، اسالیب اور تکنیک یا وقتی فیشن اور مخصوص لفظیات اپنا کام پورا کر کے پیچھے چھوٹتی جاتی ہیں۔ □

شہزاد منظر

اردو افسانہ — پاکستان میں

جیسا کہ ہر دور کے ادب کا دستور ہے پاکستان کا اردو افسانہ ہر دور میں اپنے عہد کی عکاسی کرتا رہا ہے خواہ یہ ترقی پسند ادب کا دور رہا ہو یا جدید ادب کا دور۔ اردو افسانے نے کبھی بھی اپنے عہد کے تقاضوں سے منھ نہیں موڑا اور نہ عصری حالات اور رجحانات کی عکاسی سے روگردانی کی اس کا اندازہ قیام پاکستان کے بعد سے آج تک، عہد بہ عہد لکھے جانے والے افسانوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے کا سب سے بڑا اور اہم موضوع فرقہ وارانہ فساد تھا جس نے اردو کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں کو گہرے طور پر متاثر کیا خصوصاً ایک ملک سے دوسرے ملک کی ہجرت، مغویہ عورتوں کی بازیابی، عزیز واقارب کی جدائی اور گمشدگی اور نئے وطن میں از سر نو زندگی کا آغاز اور پھر چھوڑی ہوئی سرزمین کی یادیں اور اس کے نتیجہ میں تخلیق کیا جانے والا نوسٹیلجیا کا ادب۔ یہ ہیں وہ موضوعات جس نے افسانہ نگاروں کو گہرے طور پر متاثر کیا اور ایسا محسوس ہوا جیسے افسانہ نگاروں کے سامنے ان موضوعات کے سوا لکھنے کے لئے اور کوئی موضوع نہیں رہا دراصل ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت فرقہ وارانہ جنون اس انتہا کو پہنچ چکا تھا اور فسادات نے معاشرے کو اس بری طرح متاثر کیا تھا کہ لکھنے کے لئے ادیب کو اور کوئی موضوع نظر نہیں آرہا تھا چنانچہ اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ نگار ہوگا جس نے فسادات اور اس کے اثرات کے بارے میں افسانے نہ لکھے ہوں لیکن فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں میں بہت کم ایسے افسانے ہیں جو آج بھی اپنا تاثر قایم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں اس کی وجہ جذباتی ابال، رقت پسندی اور فنی ناپختگی ہے۔

قیام پاکستان کے ابتدائی چند سال فسادات پر مسلسل افسانے لکھنے کے باعث یہ موضوع کبھی فرسودہ ہوگیا اور اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہی اور افسانہ نگار نئے موضوعات تلاش کرنے لگے۔ اس دوران افسانہ نگاروں نے نئے وطن پاکستان کی معاشرت کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ پاکستان نہ صرف ایک نیا ملک ہے بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کا نیا وطن ہے چنانچہ نئی مملکت کے قیام کے بعد نت نئے مسائل نے سر اٹھانے شروع کئے۔ ہندو تارکین وطن کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں کے ہندوستان سے آئے

ہوئے مسلمان تارکین وطن میں جائز اور ناجائز الاٹمنٹوں کے نتیجہ میں ملک میں راتوں رات ایک نودولتیہ طبقہ پیدا ہوگیا جس نے پاکستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ہندو تارکین وطن کی ہندوستان ہجرت کے باعث اقتصادی میدان میں جو زبردست خلا پیدا ہوا اس نے اس نودولتیہ طبقہ کو معاشی ترقی کے مواقع فراہم کئے۔ اس نے پاکستان کے متوسط طبقہ اور تجارت پیشہ طبقہ میں حرص و طمع پیدا کر دیا اور حصول دولت کے لئے پورے پاکستانی معاشرے کو اسٹیٹس کرزی یعنی سماجی مرتبہ بنانے کے جنون میں مبتلا کر دیا۔ ان تمام باتوں کو افسانہ نگاروں نے گہرے طور پر محسوس کیا اور اسے اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں جن افسانہ نگاروں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں قرۃ العین حیدر اور شوکت صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولٹ "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں پاکستان کے نودولتیہ طبقہ کے کھوکھلے پن کو نہایت بے رحمی کے ساتھ پیش کیا۔

قیام پاکستان کے بعد اردو ادب میں جو نئے رجحانات ابھرے ان میں ادب کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے یا اسلامی ادب تخلیق کرنے کا رجحان قابل ذکر ہے۔ اسلامی ادب کی تخلیق کے نعرے کے پیچھے اصل جذبہ یہ تھا کہ پاکستان چونکہ مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اس لئے اس کی تہذیب اور ادب کو بھی اسلامی ہونا چاہئے۔ اس رجحان کو پروان چڑھانے کی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی ادیب اور دانشور اپنا علیحدہ قومی تشخص دریافت کرنا چاہتے تھے۔ اس دور کے دانشوروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ پاکستان کے اردو افسانے کو اور بھارت کے اردو افسانے سے کن معنوں میں مختلف اور منفرد قرار دیا جا سکتا ہے؟

اسی دور میں پاکستان کے افسانوں میں ایک اور رجحان نمایاں ہوا اور وہ ہے نوسٹیلجیا کا رجحان یعنی چھوڑی ہوئی سرزمین اور ماضی کو دریافت بلکہ بازیافت کرنے کا رجحان۔ اس رجحان کی وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے ادیبوں کے لئے فسادات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی جتنی ہجرت کے کرب کی۔ نئے لکھنے والوں کے لئے ہجرت ہی عہد کا سب سے بڑا تجربہ تھا۔ نقل وطن تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہجرت ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ نقل وطن ایک غیر مذہبی عمل ہوتا ہے جب کہ ہجرت مذہبی اور نیم مذہبی عمل۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ افسانوں اور ناولوں میں کرب کا اظہار ان ادیبوں نے کیا جو ہجرت کر کے نئے ملک آئے۔ وہ اپنے شاندار ماضی کی یادوں کے ساتھ ناقابل فراموش روایتوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ ان ادیبوں نے ہجرت تو کی لیکن اپنی یادوں میں آبائی سرزمین کو بسائے رکھا۔ یہ بات خاص طور پر ہندوستان سے آنے والے ادیبوں کی تحریروں

میں پائی گئی۔ یہ رجحان اِن ادیبوں کی تحریروں میں نایاب ہے جو پہلے سے پاکستان میں آباد تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں آباد ادیبوں کی تحریروں میں ہجرت کا کرب نہیں ملتا کیوں کہ یہ کبھی ان کا مسئلہ نہیں رہا۔

قیامِ پاکستان کے دس سال سے بھی کم عرصے میں یعنی ۱۹۵۵ء کے فوراً بعد اردو افسانے میں نئے رجحانات نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور رجحانات میں غیر محسوس طور پر تبدیلیاں شروع ہو گئیں۔ اس سے قبل اردو افسانے پر ترقی پسند ادب کے اثرات نمایاں تھے لیکن اس صدی کی پانچویں دہائی میں ترقی پسندوں میں زبردست فکری بحران پیدا ہوا جس کے باعث ترقی پسند ادب کے اثرات کم ہونے لگے اور افسانہ نگار بھی زندگی کے نئے معانی کی تلاش میں نکل پڑے ترقی پسند تحریک کا ردِ عمل خالص ادب اور رومانیت کی صورت میں ظاہر ہوا اور اے حمید۔ اشفاق احمد اور خلیل احمد وغیرہ کے رومانی افسانے اور ناول بہت مقبول ہوئے لیکن یہ رجحان زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اس لئے کہ رومانی ادب کا دور ختم ہو چکا تھا اور ترقی پسند تحریک کے زوال کے باوجود رومانیت کا احیا ممکن نہ تھا البتہ ادیبوں کے ایک طبقہ نے "خالص ادب" اور "ادب میں نان کمٹ منٹ" کا نعرہ بلند کیا اور زندگی اور ادب کے بارے میں ہر قسم کے نظریئے کو ماننے سے انکار کر دیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء اور اس کے تین چار سال تک اردو افسانہ اپنی مقررہ ڈگر پر چلتا رہا لیکن ۱۹۶۰ء کے عشرے میں اس نے اپنی ڈگر بدلنی شروع کر دی۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے کی ابتدا میں ہی یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اردو افسانہ سطحیت اور یکسانیت کا شکار ہو چکا ہے اور اس میں اعلیٰ اور معیاری افسانے تخلیق نہیں ہو رہے ہیں لیکن اس دور کے کسی ادیب و نقاد کو اس کا علم نہیں تھا۔ ۱۹۵۹ء تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ترقی پسند ادب کی کوکھ سے جدیدیت یا جدید ادب کے رجحان نے جنم لینا شروع کر دیا ہے جو اس صدی کی چھٹی دہائی میں منظر عام پر آنے والی افسانہ نگاروں کی نئی نسل نے کچھ اس انداز سے بغاوت کی کہ افسانے کی مروجہ روایات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور ۱۹۶۰ء کے عشرے میں اردو افسانے میں طرزِ اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں بھی کافی تبدیلیاں نظر آئیں اور اردو کا جدید افسانہ علامتی اسلوب کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس دور میں جدیدیت کی لہر نے اردو افسانے کو گہرے طور پر متاثر کیا اور افسانے میں علامت نگاری نے مقبولیت حاصل کرنی شروع کی۔ معروضی حالات کے تحت ادیبوں نے علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کر لیا اس دور میں اگرچہ بعض افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں شانہ بہ شانہ روایتی اور وضاحتی طرزِ اظہار کو بھی جاری رکھا اور روایتی اور کنونشنل انداز میں بعض بہت عمدہ افسانے پیش کئے لیکن افسانوی ادب میں علامت اور تجریدیت نگاری غالب رجحان رہا۔

اگر اردو افسانے کا موضوعات کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو ۱۹۶۵ء اردو افسانے کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بڑے پیمانے پر جنگ ہوئی اور ادیبوں نے حب الوطنی کے جذبے کے تحت ادب تخلیق کئے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا المیہ اور اس کا کرب اردو افسانے کا دوسرا اہم موضوع بنا اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے افسانہ نگاروں نے کئی انتہائی دردناک افسانے تخلیق کئے۔ جدید اردو افسانہ اپنی ساخت کے اعتبار سے توڑ پھوڑ کے عمل سے گذر کر بہت حد تک شاعری تجریدی مصوری کے قریب پہنچ گیا ہے۔ افسانے میں اینٹی اسٹوری کے رجحان نے افسانے سے افسانویت ختم کر دی ہے اور اسے بے ہیئت یعنی فارم لیس بنا دیا ہے اس لئے جدید افسانے سے کلاسیکی طرز کے افسانے کی طرح یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ اس میں عام دلچسپی ہوگی اور اسے پڑھ کر عام قاری حیرت زدہ رہ جائے گا۔ ☐

شمیم حنفی
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

"جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ڈبلنرز کی یہ کہانیاں کیسی ہیں، یہ ناول (یولیسس) کس تماش کا ہے تو میں نے جوائس کو بیچ میں چھوڑا اور کتھا سرت ساگر کے دفتر لے کر بیٹھ گیا۔ سوچا کہ سر پھوڑنا ہی ٹھہرا ہے تو جوائس صاحب ہی کا سنگ آستاں کیوں ہو۔ اپنے یہاں پتھر موجود ہیں۔ مگر کتھا سرت ساگر تو علم دریا نکلی۔ تھاہ ہی نہیں ملتی۔ کہانی کو کہاں سے پکڑیں اور کہاں ختم کریں۔ ایک سمندر ہے کہ امنڈ رہا ہے کہ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔"

انتظار حسین

اور سمندر کو دیکھیں تو یہ خیال کب آتا ہے کہ اس بے حساب آبی کائنات میں چھوٹی چھوٹی ہزاروں کائناتیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن اب سے لگ بھگ نو سو برس اُدھر ایک کشمیری برہمن سوم دیو بھٹ نے جب پاک پربت ہمالیہ کی دھند میں لپٹی برفیلی چوٹیوں پر نگاہ کی تو اس کے من میں ترنت ایک بات آئی —— اس نے سوچا، ان اونچی چوٹیوں سے اترتی ہوئی نہریں اور ندیاں ان گنت دیومالاؤں کے بھید چھپائے اندھیرے جنگلوں اور ناہموار گھاٹیوں اور ہرے بھرے میدانوں کا لمبا تھکا دینے والا راستہ طے کرنے کے بعد جب اپنی جاترا تمام کرتی ہیں تو انت میں ایک ساگر کو پرنام کرتی ہیں۔ سارے ندی نالے بالآخر ایک وشال ساگر میں جا ملتے ہیں۔ کثرتوں کی رنگا رنگی ایک اکائی میں حل ہو جاتی ہے اور ہزاروں عالموں کے سنجوگ سے ایک بہت بڑا عالم ترتیب پاتا ہے۔

تو ہوا یوں کہ اس برہمن سوم دیو نے دریا دریا بکھرے ہوئے اسی سمندر کی مثال کو سامنے رکھ کر ہزاروں کہانیوں کی ایک وشال کہانی بنائی اور اس کہانی نے کتھا سرت ساگر کا نام پایا۔ کہانیوں کا یہ سمندر، ذرا غور کیجیے تو ہمیں مشرقی تخیل کے اس رمز کی خبر بھی دیتا ہے کہ اس کی گرفت میں آنے والی ہر سچائی ایک بہت بڑی سچائی کا ہی حصہ ہے۔ اس سچائی کا نہ ایک رنگ ہے نہ ایک روپ۔ نیکی اور بدی، اندھیرا اور

اجالا، ثواب اور گناہ، یہ ساری ضدیں باہم مل کر اس اکائی کی تعمیر کرتی ہیں جس سے انسانی تجربوں کی کائنات عبارت ہے۔ اس طرح، کتھا سرت ساگر ایک قوم کی پوری سائکی اور ایک تہذیب کے مرکزی تصور کا آئینہ خانہ ہے۔ حیرانی ہوتی ہے تو یہ دیکھ کر اس آئینہ خانے میں حقیقت جیسی ہزار شیوہ، پرپیچ، سیال نظر آتی تھی، اس کے برعکس بعد کی دنیا حقیقت کے اتنے ہی محدود، متعین اور جکڑبند تصورات کی شیدائی ہوئی۔ اس ترقی معکوس کا کچھ اندازہ، دور کیوں جائیے، اپنی ۱۹۳۶ء کی نسل کے افسانہ نگاروں کی محبوب و مطبوع حقیقت کے واسطے سے بھی ہو جاتا ہے۔ شکر ہے کہ ایسے بہت سے سبق اب دھیرے دھیرے حافظے کی گرد بنتے جا رہے ہیں مگر وہ سبق جو کتھا سرت ساگر کی حقیقت نے ترتیب دیا تھا، ایک نظر اس پر بھی ڈال لی جائے تو کیا برا ہے؟ رہے سماجی حقیقت پسندی کے عشاق تو وہ اپنا بھلا کب چاہتے ہیں۔ جدید ترقی پسندوں نے ترک ذات کا جو نسخہ عرصہ ہوا، یاد کیا تھا اس کے ہاتھوں شعر اور افسانے کا حال بھی خراب ہوا اور سب سے زیادہ یہ کہ معمولی ادب اور ادبی تصورات کی سرپرستی اخلاق کا تقاضہ بن گئی۔

میں کمٹ منٹ کا عاشق نہ سہی، اس کا دشمن بھی نہیں ہوں بشرطیکہ اس کا حوالہ اپنے ہی تجربے اور اپنے ہی حواس کا ماحصل ہو اور اپنی اجتماعی کائنات تک جانے کے لئے افراد کا گلا دبانے کی ضرورت یا ان سب کو ایک سے تصنع عطا کرنے کی سخاوت ناگزیر نہ ٹھہرے —— کتھا سرت ساگر کا ایک اور سیدھا سادا سبق یہ سچائی ہے۔ اب سے نو سو برس اُدھر کی ہندی تہذیب ادنیٰ سے ادنیٰ اور مبتذل سے مبتذل سچائی کو کس طرح ایک مرکزی اور بسیط سچائی، مقدس اور عظیم اور مہیب سچائی کا پرتو جانتی تھی۔ یہ سمجھنے کے لئے نہ صوفی دھانی بننے کی شرط، نہ ہنری جیمس کے افکار کے تجزیے کی ضرورت۔ ڈکے نے یہ بھید عربوں کے جاہلی دور کی شاعری میں پایا تھا۔ یہ سفر بہت لمبا دکھائی دیتا ہو تو کتھا سرت ساگر تک جانا بھی کافی ہوگا کہ اس کے آئینے میں ہم گاہے طربناک، گاہے المناک رزمیے کا عکس ڈھونڈ سکتے ہیں جو دنیا میں آنے والے پہلے آدمی کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جس کا سلسلہ آخری آدمی تک جائے گا۔ ہزاروں کہانیوں کی یہ ایک کہانی دلچسپ بھی ہے اور تمام پرانی کہانیوں کی طرح ہم پر کسی نہ کسی ایسے بھید کا دروازہ کھولتی ہیں جس سے گذر کر ایک کلی اور ہمہ گیر حقیقت کے حصول تک پہنچا جا سکتا ہے۔ عسکری صاحب نے مغرب پر مشرق کی فکری برتری کا سب سے بڑا سبب یہ بتایا تھا کہ اہلِ مشرق کا بنیادی سروکار نہ تو اخلاق سے تھا، نہ بد اخلاقی سے، وہ جویا تھے تو اس حقیقت کے جو اس کے تمام اندرونی اور بیرونی تضادات پر محیط ہو، گیتا میں کرشن کے بھاری اہم یا انفس کی صورت۔ سوم دیو بھٹ کی تلاش کے سفر کی سمت بھی یہی تھی۔ سو، اپنے تخیل کی سیر کے لئے اس نے دوزخ کو بھی جنت میں ملانا ضروری سمجھا۔ فضا کی درجہ بندی کا آشوب روشن خیالی اور عقلیت کی مغرور صدیوں کا عطیہ ہے۔

بائیس ہزار اشلوکوں اور ایک سو چوبیس ابواب پر مشتمل یہ دفتر مجموعی طور پر ہومر کی الیڈ اور اوڈیسی کی دوگنی ضخامت رکھتا ہے۔ سوم دیو نے ہر باب کو سمندر کی رعایت سے ایک ترنگ یا لہر کا نام دیا ہے۔ اس کہانی کی کہانی یوں بیان ہوئی ہے کہ سوم دیو کا زمانہ بھی ہر زمانے کی مثال بہت سخت تھا۔ ان دنوں کشمیر پر راجہ اننت کی حکمرانی تھی۔ دربار میں سازشیں ہوتی تھیں اور رعایا پریشان تھی۔ اس دور میں بھی انسانوں کا بہت خون بہا، بہت جانیں تلف ہوئیں اور لوگ بہت دل گرفتہ اور مایوس ہوئے۔ راجہ اننت کے دونوں بیٹوں کلس اور ہرش میں کلس چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ ہرش ذہین تھا مگر بڑا جابر۔ حالات کی خرابی سے دل تنگ ہو کر اننت نے حکومت کی باگ ڈور بڑے بیٹے کلس کے حوالے کر دی۔ کچھ برس بعد جب ذرا امن چین کے دن آئے تو اننت کا جی پھر للچایا اور اس نے دوبارہ راج تخت پر براجمان ہونے کی ٹھانی۔ راجہ اننت کی رانی سوریہ وتی کا دل یہ سب دیکھ کر بہت دکھتا تھا۔ پس اس کے لائق درباری شاعر سوم دیو برہمن نے محض اس کے من بہلاون کے کتھا سرت ساگر ترتیب دی، ایسی کہانیاں جو رانی سوریہ وتی کے دل سے دکھوں کا بوجھ اتار سکیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے زندگی کے ناگزیر المیوں، اس کے شعور میں شامل کڑواہٹوں اور نامرادیوں اور مایوسیوں کی حقیقت کا گیان بھی دے سکیں۔ دکھ کی حقیقت سمجھ لی جائے تو دکھ اور سکھ میں زیادہ فاصلہ نہیں رہ جاتا۔

مگر سب کہانیوں سے بڑی کہانی خود انسان کی اپنی زندگی ہے۔ اَن ہونے، غیر متوقع اور انتہائی انوکھے واقعات کا مخزن۔ راجہ اننت کے بیٹے کلس کو اقتدار کی چاٹ لگ چکی تھی، عادتوں میں سب سے بری، سب سے پائدار اور سب سے زیادہ پسندیدہ عادت۔ سو اس نے جب دیکھا کہ اس کا باپ دوبارہ راج کاج پر قابض ہونا چاہتا ہے تو پلٹ کر باپ پر حملہ کر دیا۔ اس کی ساری دولت ہتھیالی۔ راجہ اننت نے مایوس ہو کر اپنے ہاتھوں اپنی جان لی کہ جب ہر اختیار چھن جائے اس وقت کم سے کم ایک اختیار اپنے ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ اپنی مرضی سے اپنی موت کا اور رانی سوریہ وتی جو سوم دیو بھٹ کی بنی ہوئی کہانیوں میں زندگی کرتی تھی خود اس کی کہانی کا انجام یہ ہوا کہ جیتے جی اس نے اپنے آپ کو شوہر کی چتا کے حوالے کر دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰۸۱ء کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتھا سرت ساگر کی ترتیب سنہ ۱۰۷۰ء کے آس پاس ہوئی جب راج محل کی شورشیں شباب پر تھیں اور رانی سوریہ وتی کا دل بہت دکھی تھا۔

شاید اسی لئے کتھا سرت ساگر میں مغرور عورتوں اور جیالے مردوں اور جگمگاتے شہروں کے ساتھ ساتھ راج دربار میں پلنے والی سازشوں، باہمی مناقشوں نے غداریوں، جنگ اور قتل اور غارت گری اور عیاری اور مکاری کے قصے بھی بہت ہیں۔ کرداروں میں اچھے اور نیک راجاؤں اور راہبوں کے ساتھ ساتھ

اوباش مردوں اور چھنال عورتوں اور انسانی خون سے پیاس بجھانے والی بدروحوں، چڑیلوں اور دیتیوں (راکشسوں) کی بھیڑ بھی دکھائی دیتی ہے۔ کتھا کیا ہے، بھانت بھانت کے آدم زادوں کا چڑیا گھر ہے۔ ایک طرف عبادت اور ریاضت میں مگن رہنے والے نیک طبع بھگت اور بچاری ہیں تو دوسری طرف شرابیوں، جواریوں، رنڈیوں اور بھڑووں کا گروہ ہے۔ اس بصری اور ذہنی مساوات کا دروازہ کہانی لکھنے والے پر بند ہو جائے تو گویا انسانی تجربے کی ایک کائنات کا دروازہ اس پر بند ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ تعمیری اور مفید کہانیاں بنانے والوں نے تخلیقی تجربے کی اس کائنات سے بگاڑ کیوں مول لیا۔ سوم دیو بھٹ دل گرفتہ رانی سوریہ وتی کو اس طرح یہ بتانا چاہتا تھا کہ جو کچھ اس کی اپنی دنیا میں ہو رہا ہے وہی اس دنیا کے باہر بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا اتفاقی جبر ہے جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ وہ کچھ جو ہم جھیل رہے ہیں، ہم سے آگے بھی لوگ جھیلتے آرہے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے ایک ہندی پتریکا میں فراقؔ صاحب کا ایک انٹرویو چھپا تھا۔ اس سوال کے جواب میں کہ ان کے بنیادی تجربے کیا ہیں فراقؔ صاحب نے کیا عمدہ بات کہی کہ وہی جو ان سے پہلے کے انسانوں سے وابستہ رہے ہیں ـــــ اور یہ کہ تجربوں کی بس ایک دنیا ہے جو گھوم پھر کر اپنے آپ کو ہر زمانے میں دوہراتی رہتی ہے۔ اس نکتے کی وضاحت فراقؔ صاحب نے یوں کی (اور یہ اُن ہی کے بس کی بات تھی) کہ "مثال کے طور پر انسانی معاشرے کا ایک عام تجربہ ایک کی بی بی کا دوسرے کے ساتھ بھاگ جانا ہے یا کسی غیر کے ذریعہ کسی عورت کا بھگایا جانا، لیکن مہا کوی تلسی داس نے اسی تجربے کی بنیاد پر رامائن لکھ ڈالی۔" نہ راون نے سیتا کو اغوا کیا ہوتا نہ لنکا جلتی اور ایودھیا نگری میں دیوالی کی رات آتی۔ اصل میں خیر اور شر کے یکساں ادراک ہی سے فکر میں وہ ٹھہراؤ اور مزاج میں وہ نظم اور تحمل پیدا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی لمبی کہانی سنانا کٹھن ہے۔ پھر سوم دیو بھٹ تو شاعر تھا جس کے تخیل کو بیرونی اضطراب اور تشویش کی فضا میں ایک اندرونی آسودگی کی ڈور بہر حال تلاش کرنی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو کتھا سرت ساگر میں بس زہر ہی زہر ہوتا اور یہ زہر امرت کبھی نہ بنتا۔ یہ طے ہے کہ سوم دیو بھٹ نے ارسطو کی بوطیقا نہیں پڑھی تھی، مگر کتھارسس تو ایک خودرو پودا ہے جو ہر سچے المیے کی زمین سے آپ ہی آپ نمودار ہوتا ہے۔

ادب کے علماء اور مورخین نے کتھا سرت ساگر کو ایک زمانے کی تاریخ، اس تاریخ سے وابستہ سماجی کوائف اور معاملات کا ترجمان بھی بتایا ہے کہ اس کی مدد سے ہم اپنے ریت رواج، موسموں اور منظروں، عقیدوں اور واہموں کی تفصیل بیان کر سکتے ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ ہمارے عوامی ادب کے دھندلے گوشوں پر بھی اس سے بہت روشنی پڑتی ہے۔ اس قسم کے رویوں کی رفاقت میں کتھا سرت ساگر کا تہذیبی، تاریخی، سماجی اقتصادی اور عمرانیاتی مطالعہ یقیناً مفید اور معلومات افزا ہوگا۔ لیکن یہ کام یارانِ مدرسہ پر چھوڑیئے کہ

اس کا حق دراصل ان ہی کو پہنچتا ہے۔ ہم جیسوں کے لئے تو کتھا سرت ساگر بس ایک کتھا ہے جس سے راتیں روشن ہیں۔ وہ راتیں بھی جو دنوں کی صورت سامنے آتی ہیں، اور ایک سمندر ہے جسے اوپر سے عبور کرنے کے بجائے اس میں ڈوبنے کا بھی اپنا مزہ ہے۔ جو بات اس بے مثال کارنامے کو ہمارے لئے آج بھی بامعنی بناتی ہے ایک تو اس کا خارجی اسلوب اور فارم ہے کہ ایک گرہ کھلتی ہے تو سونئی گرہیں سامنے آموجود ہوتی ہیں چنانچہ اسے ختم کرنے کے بعد بھی ہمارا تعلق اس سے برقرار رہتا ہے۔ اور کہانی اصل میں وہی ہے جو مسائل کو حل کرنے کے بجائے خود حل طلب رہ جائے۔ دوسرے یہ کہ خیر اور شر کا یکساں ادراک یا انسانی سرشت کی کلیت کا شعور اس کتھا میں ایک مستقل عقبی پردے کی حیثیت رکھتا ہے۔ تناظر کی یہ پیچیدگی شر کو ہماری مجبوری یا محض اتفاق کے بجائے ہماری ضرورت اور انتخاب ٹھہراتی ہے۔ اور تجربوں کے وہ بھید جن پر حجابات کے پردے پڑے ہوئے تھے انھیں اوپر سے مسلط کی ہوئی قید سے چھٹکارا دلاتی ہے۔ یہ صرف تخیل کی جستجو یا ہمہ پسندی نہیں بلکہ وہ جذباتی اور ذہنی بے خوفی ہے جس نے اخلاق گزیدہ معاشروں میں انسان کی ہیئت وحیثیت میں تخفیف کردی۔ شیطان کی تخلیق ایک اخلاقی احتیاج کے بغیر وجود میں نہ آتی۔ ہر موسیٰ را فرعونے تاکہ نیکیوں کے ظہور کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر بڑی کہانی کے لئے اس نوع کا عقبی پردہ ایک لازمہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد سے فتح محمد ملک کی چشمک برحق مگر یہ تو واقعہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد بھی اس لازمے کی حقیقت سے آگاہ تھے۔ یہ اور بات کہ آدمی سب کچھ جانے لیکن پھر بھی نہ مانے۔ بوکیشیو نے سوم دیو کے تین سو برس بعد CENTO NOVELLE کا جو قصہ گڑھا اس کے عقبی پردے پر فلورنس کے ہلاکت آفریں طاعون کی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں۔ سوم دیو بھٹ کی کتھا سرت ساگر کا عقبی پردہ انسانی تجربات سے چھٹی ہوئی ازلی اور ابدی بیماریوں کے اجاڑ رنگوں سے داغ دار ہے۔ لیکن اس کی اوپری سطح بظاہر سمندر کے سینے پر پھیلی ہوئی آبی چادر کی طرح پرسکون اور خاموش ہے۔ طوفان اس سطح کے نیچے ہیں۔ اس سے سوم دیو کے تخیل کی وسعت، جذبے کی صلابت، اس کے ادراک کے توازن اور اس کے شعری طریق کار کی تنظیم اور تناسب، ان سب پر روشنی پڑتی ہے۔

سوم دیو نے یہ اعتراف کیا ہے کہ کتھا سرت ساگر کا مواد یا کہانیوں کا یہ سمندر اصلاً اس کی ایجاد واختراع نہیں اور یہ کہانیاں اس سے آگے بھی سنی سنائی جاتی تھیں۔ یوں بھی ہمارے دیس کی تاریخ وتہذیب میں حقیقت اور افسانے کی دوستی کا سفر ساتھ ساتھ شروع ہوا کہ دنیا کی سب سے پرانی کہانیوں میں ہمارے مہاکی موج بھی شامل ہے۔ تہذیب کے پہلے موڑ پر عام انسانوں کے ساتھ ایک دیومالا کا منڈپ بھی سجا تھا سوم دیو کا کہنا ہے کہ اس سے بہت پہلے گنڑا دھیہ (गुणाढ्य) نے ایک وڈہت کتھا (बृहत कथा)

ترتیب دی تھی اور یہ کہ کتھا سرت ساگر کی بہت سی کہانیاں اسی ورہت کتھا یا عظیم افسانے سے ماخوذ ہیں۔ ورہت کتھا اب نایاب ہے۔ ادبی مورخ بتاتا ہے کہ یہ کتھا چھٹیں صدی عیسوی میں رچی گئی، یعنی سوم دیو بھٹ سے کوئی چار پانچ سو برس پہلے۔ سوم دیو نے لکھا ہے کہ ورہت کتھا سب سے پہلے شیوجی نے سنائی، اپنی بی پاروتی کو، پھر پشپاندت نے، پھر کنڑ بھوتی نے، پھر گنڑا دھیہ نے اور اس کے بعد سات واہن نے۔ سات واہن نے اوّل اوّل اسے مسترد کر دیا تھا جس سے دل برداشتہ ہو کر گنڑا دھیہ نے اسے ورق ورق نذر آتش کرنا چاہا چھے لاکھ ورق آگ میں بھسم کر دیئے۔ عین اس وقت سات واہن نے ظہور کیا، اس کے ایک لاکھ ورق بچا لئے اور اسے ورہت کتھا کا نام دیا۔ پھر اس میں کچھ اضافہ اپنی طرف سے کیا کہ نقصان کی کچھ تو تلافی ہو جائے اور اس اضافے میں اس کتھا کی عظیم الشان تاریخ بیان کی۔ سوم دیو نے کتھا سرت ساگر میں اس پورے سرمائے کو منتقل کر لیا ہے اور یہ اس کی کتاب کے تقریباً نصف پر محیط ہے۔ ورہت کتھا کے علاوہ ایک اور کتاب جس کا اجالا کتھا سرت ساگر تک پہنچا شیمیندر (क्षेमेन्द्र) کی ورہت کتھا منجری (बृहत कथा मंजरी) ہے جو کتھا سرت ساگر سے پچیس تیس برس پہلے وجود میں آئی۔ مگر سوم دیو کے کارنامے کا اس سے کیا مقابلہ۔ کتھا سرت ساگر عدد درجہ مختصر ہونے کے علاوہ شیمیندر کی ورہت کتھا منجری کی زبان، بیان اور اسلوب بھی بہت معمولی ہے۔ اس میں نہ تو کتھا سرت ساگر جیسی تنظیم ملتی ہے، نہ قصہ گوئی کا وہ ہنر جو اس ساگر کو بعض کڑوی، ڈراؤنی اور ظلمت آثار کہانیوں کے باوجود پرکشش اور دلچسپ بناتا ہے۔ نالہ جب تک پابندِ نے نہ ہو اور فریاد کسی لے میں نہ ڈھل جائے شعر اور فن نہیں بنتی کہ فنکار وہی ہے جو آنسوؤں کی برکھا برسانے کے بجائے انھیں پی جانے پر قادر ہو۔

تعجب کی بات ہے تو یہ کہ اہل مغرب نے خود آگے بڑھ کر یہ مینا ہاتھ میں اٹھا لیا اور ہمارے لکھنے والے کیا ہندی کے اور کیا اردو کے، ایک عرصے تک اپنے ذوقِ عمل کی کوتاہی کو اپنی تجدد پرستی کا بہانہ سمجھتے رہے۔ دلی اور دلی کے اطراف میں جعلی مشینیں اور گھڑیاں بنتی ہیں اور ان پر جرمنی یا جاپان یا انگلستان کا مارک ہوتا ہے تو لوگ شوق سے انھیں خریدتے ہیں اور گلے لگاتے ہیں۔ اپنی روایت کے معاملے میں بھی ہم بہت دنوں تک اسی فیشن پرستی اور خام خیالی کا شکار رہے۔ عمر خیام اور کالی داس کی بات الگ، ٹیگور بھی ہم تک مغرب ہی کے راستے سے پہنچے اور وہ بھی اس وقت جب انھیں فٹز جیرالڈ، گیٹے اور ڈبلیو۔ بی۔ یے ٹس کی طرف سے سند مل گئی۔ ذہنی غلامی اور فکری پسماندگی کا طلسم بڑی مشکل سے ٹوٹتا ہے۔ کہیں اب جا کر ہم نے یہ حقیقت پہچانی کہ داستانوی اور قصص کے عالمی سرمائے میں ایک لمبی اور بڑی گونج کتھا سرت ساگر کی بھی شامل ہے۔ ویسے یہ سراغ بھی ہماری عبرت کے لئے سب سے پہلے مغربی مستشرقین ہی نے لگایا کہ اس ساگر کی لہروں نے مشرق بعید

اور مغرب دونوں سمتوں میں سفر کیا تھا۔ فارس اور عرب سے ہوتی ہوئی یہ کہانیاں قسطنطنیہ اور وینس پہنچیں۔ بوکیشیو، چاسر اور لافونتین نے بھی اس چراغ سے کچھ اجالا مستعار لیا اور اس طرح عالمی فکشن کے معاشرے میں کتھا سرت ساگر کو عزت اور اعتبار میسر آیا۔ ہماری علاقائی زبانوں میں کہانیاں ایک بار پھر اب بیانیہ کا کھویا ہوا سرا تلاش کر رہی ہے اور کہانی کی بنیادی روایت یعنی اس کی حکائی (ORAL) توانائیوں نے اِدھر فارمولہ بازی کے اسالیب کے لئے ایک پرانی سچائی کے واسطے سے کچھ نئے خطرے پیدا کر دئیے ہیں۔ ادب سے قطع نظر اب تو مصوری کے نقاد بھی، جنھیں گمراہ ہونے میں دیر نہیں لگتی، اب تصویر کے بیانیہ عنصر (NARRATIVE ELEMENT) کی اہمیت پر زور دینے لگے ہیں۔ یہ رمزِ غریب کتنے جتنوں کے بعد ہاتھ آیا ہے کہ ایک تو تجرید بھی کسی نہ کسی سطح پر مشہود (CONCRETE) ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ تجرید کے بے سمت و بے دیوار صحراؤں میں ان ہی حوصلہ مندوں کا بھٹکنا بھلا لگتا ہے جو مشہود کے تقاضوں کی تکمیل پر بھی قادر ہوں۔ ذرا یاد کیجئے کہ پایانِ کار (ACTION PAINTERS) اور دادا ازم کے حامیوں کا کیا حشر ہوا اور اب تو OP ART کے ابتدائی کارناموں پر بھی ٹھنڈے دل و دماغ کے لوگ ایک نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ محض گرد اڑانے سے شہسواری کا ثبوت تو بہم نہیں پہنچتا۔

پھر پرانے اور نئے کی بحث اگر صرف کلیشیز کی نذر ہو جائے یا لبی گرمیٔ گفتار کا بہانہ تو معنی کھو دیتی ہے۔ اور اب تو تاریخ کے سلسلے میں بھی ہمارے رویّے وہ نہیں رہے جو اب سے چالیس برس پہلے تھے اور یادش بخیر، جنھیں ہمارے ترقی پسندوں نے بساط بھر خوب ہوا دی تھی۔ قرۃ العین حیدر بھی HISTORY کے دائرے سے نکل کر META-HISTORY کی پر اسرار دھند تک جا پہنچیں۔ ہم اپنے سماجی اور ثقافتی المیوں کی سزا بھلا کب تک اپنے تخلیقی تقاضوں اور میلانات کو دیتے رہیں گے سونے اور جاگنے کے آداب اگر بدل گئے اور کہانی کا رشتہ رات سے پہلے جیسا نہ رہا تو قصور کس کا ہے؟ نہ سوم دیو بھٹ کا نہ انتظار حسین کا۔ خیر، یہ سوال ایک الگ بحث کا طلبگار ہے اور اگر اسی میں الجھنا ہے تو پھر سماجی علوم اور عمرانیات کے ماہرین سے رجوع کیجئے۔ میرا مسئلہ تو وہ سمندر ہے جس میں چھپے ہوئے آبِ حیواں کی تلاش کا ذوق ابھی کند نہیں ہوا۔ یہ سمندر سوم دیو بھٹ کی دریافت نہیں بلکہ ان حیران آنکھوں کی جستجو کا حاصل ہے جنھوں نے پربت کی چوٹی پر جلتی ہوئی آگ اور جنگلوں میں بھٹکتی ہوئی پرچھائیاں دیکھیں پھر ان کے تعاقب میں نکل گئیں۔ اور جب واپس اپنے حاضر تک آئیں تو ان کا دامن دیومالا کے انمول خزانوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سفر اسپنی جہاز رانوں کے سفر سے زیادہ پر اسرار رہا ہوگا کہ اس کے بھید ابھی بھی جوں کے توں قایم ہیں۔ آپ کہیں گے یہ سب انسانی شعور کے بچپن کا نوسٹلجیا ہے۔ مجھے تو خیر

اس لفظ سے کوئی خوف نہیں آتا مگر ڈر ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ اپنے قائل ہو گئے تو پھر پال کلی (PAUL KLEE) اور شاگل اور الف لیلیٰ کی شہرزاد اور سوم دیو بھٹ کے ہاتھوں آپ کا کیا حشر ہوگا۔ ان ہاتھوں کا سایہ تو دنوں کے ساتھ برابر لمبا ہوتا جاتا ہے۔

کتھا سرت ساگر میں پنچ تنتر اور مہابھارت سے لے کر رگ وید کے دنوں تک کی کہانیاں اور دیومالائیں کسی نہ کسی شکل میں ہمارے سامنے آ موجود ہوتی ہیں اور ہمیں بتاتی ہیں کہ جو کہانیاں ہمیں سوم دیو بھٹ نے سنائیں ان سے ہمارا رشتہ سوم دیو بھٹ سے زیادہ پرانا ہے۔ حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال پہلے جب زمانے کی آنکھ نے دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کو شیر و شکر ہوتے ہوئے دیکھا تھا یہ کہانیاں اپنی ابتدائی شکلوں میں ظہور پا چکی تھیں۔ اس مسئلے کے نکات ڈاکٹر وزیر آغا بتائیں گے مگر اتنا طے ہے کہ راوی یا کتھا واچک کو ہماری تہذیب کے ایک مستقل نشان کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور وہ ہمارے معاشرے کا ایک لازمی کردار بن چکا تھا۔ مغرب کا تعارف اس کردار سے بہت دیر میں ہوا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہوگا (ایک غیر مورخ کے پاس قیاس ہی کی قوت ہوتی ہے) کہ مشرق کی راتیں ٹھنڈے اور یخ بستہ مغرب سے زیادہ مہربان تھیں اور لوگ مغربیوں کے برعکس بند کمروں میں اہلِ خاندان کے ساتھ آتش دان کے گرد بیٹھنے کے بجائے بازاروں اور چوپالوں میں مل جل کر راتوں کی تاریکی میں کہانی کے دیئے جلاتے تھے۔ پھر جتنے منھ اتنی کہانیاں۔ کوئی پاکباز عورتوں کا قصہ چھیڑتا تو کوئی اس بے وفا بیوی کی کہانی شروع کر دیتا جو جنگلوں بیابانوں کے سفر میں اپنے نیک دل شوہر کے لہو اور گوشت کی غذا پر زندہ رہی مگر اپنی طبیعت کے ٹیڑھ کی وجہ سے انجام کار اسی غریب کو تباہ کر بیٹھی۔ کوئی بہادری اور شجاعت کے کارنامے ہانکتا، کوئی بزدلی اور نکمے پن کی کہانیوں پر لعن طعن کرتا۔ انسان کی شرافت اور خباثت کے رنگ ساتھ ساتھ پھیلتے اور اپنی باہمی آمیزش سے ایک ایسی طلسمی کائنات کا نقشہ جماتے جو بیک وقت افسانہ بھی نظر آتی اور حقیقت بھی۔ اس ملی جلی کائنات میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کی بدعت ہمارے عہد میں شروع ہوئی۔

سوم دت نے سچائی کے یہ دونوں روپ سامنے رکھے ہیں۔ اس طرح کے ان کے بیچ کی لکیر مٹ گئی ہے۔ چند مہا سینا، شکتی دیو، مرگنک بھجا جیسے من گھڑت کرداروں کے ساتھ اس کے تخیل کی کمند بعض ایسی گردنوں میں بھی جا پڑتی ہے جو تاریخ کی روشنی میں نہائی ہوئی ہیں۔ سوم دت نے ایسے موقعوں پر تاریخ سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنے تخیل کی شاعرانہ اور خلاقانہ جست کے ذریعہ کرداروں کی ماہیت اور مناسبات میں من مانی تبدیلیوں کا آزادانہ عمل بھی اختیار کیا ہے اور جانی بوجھی سچائیوں

میں ایک انجانی اور انوکھی جہت کی جستجو کی ہے۔ مثال کے طور پر کتھا سرت ساگر کی نویں کتاب یا ذیلی حصے میں اس نے رام اور سیتا کی کہانی یوں بیان کی ہے کہ سیتا اپنی پاک دامنی کے ثبوت کے لئے ایک جھیل کے پاس جاتی ہیں، کہتی ہیں ــــ "اے دھرتی ماں! اگر میرا من، سپنے میں بھی کبھی اپنے پتی کے علاوہ کسی اور پُرش کی اُور نہیں گیا تو اس کی گواہی دے اور مجھے جھیل کے اس پار پہنچا دے"۔ اتنا کہہ کر جھیل میں اترتی ہیں۔ پھر ایک دیوی کا ظہور ہوتا ہے ــــ دھرتی، جو سب کی ماں ہے اور سارے انسانی تجربوں کا گنجینہ، تمام انسانی افکار و اعمال و احساسات کی رزم گاہ۔ دیوی سیتا کو اپنی گود میں بھرتی ہے اور جھیل کے اس پار پہنچا دیتی ہے۔

کتھا سرت ساگر سمندر کی طرح بے کنار ہے، مگر دھرتی کی گود تو اس سے بھی بڑی ہے، جو ایسم بھی ہے اور اپار بھی ــــ اور جو ہر آنت کا انت ہے۔ اور جس کے تجربے الگ الگ سمتوں سے آنے والی لکیروں کی صورت ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں اور ایک ایسی سچائی کا رنگ پھیلاتے ہیں جو نہ سیاہ ہے نہ سفید جو ایک ساتھ ان تمام رسوں پر محیط ہے جس کی دریافت بھرت منی نے کی تھی اور شاکیہ منی نے جنھیں نیکی اور بدی کی تفریق اور درجہ بندی سے بلند ہو کر ایک پرپیچ اور ہمہ جہت سچائی کے روپ میں دیکھا تھا۔ سوم دیو بھٹ کے بے حساب تخیل نے بھی اسی بے حساب سچائی کو شبدوں کے ساگر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جبھی تو اس کا فیضان ختم نہیں ہوتا اور کتھا سے نئی کہانی تک، سلسلہ در سلسلہ ہمیں اس سچائی کی پکار سنائی دیتی ہے، ایک ایسی پکار جس کی تاریخ تو ہے مگر جغرافیہ کوئی نہیں۔

خاتمۂ کلام پر کو آل مباحث (ذہن) سے ایک مکالمہ:

چیلا: بُدھ کون ہے؟

گرو نے اپنی زبان نکال کر چیلے کو دکھا دی۔

چیلا جھک گیا۔

گرو: اسے بند کرو۔ تم جھکے کیوں؟

چیلا: تم کتنے مہربان تھے کہ تم نے اپنی زبان سے مجھے بدھ کا درشن کرایا۔

گرو: میری زبان کی نوک پر ایک گھاؤ ہے!

کہانی کا سفر ایک زخم سے دوسرے زخم تک کا سفر ہے۔ کتھا سرت ساگر اسی سفر کا علامیہ ہے۔ ہم نے اس سے آنکھیں پھیر لیں تو گھاٹا اپنا ہی ہوگا کہ زخم تو جب بھی باقی رہیں گے، ہاں ان کی پہچان کا ایک دروازہ ہم پر بند ہو جائے گا۔ □

ابن فرید

حفیظ منزل، میرس روڈ
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

افسانہ کیا ــــ؟

اب جب کہ اردو افسانہ کی تاریخ تقریباً ایک صدی پر محیط ہو چکی ہے، وہ بہت سے سوالات جو اس کی ابتدا کے وقت اٹھائے گئے تھے دوبارہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ پہلے ان سوالات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ جیسے کسی نو عمر سے سوئے ادب پر جواب طلبی کی جا رہی ہو، یا جیسے کسی بات پر اعتبار نہ آئے اور پھر بھی اعتبار کرنے کی سعی لاحاصل کی جائے۔ سوالات کی یہ نوعیت اچھے بھلے اعتماد کو متزلزل کر دیتی تھی، چنانچہ افسانہ کی تعریف کے سلسلہ میں بعض ایسی ہلکی باتیں بھی کہی گئیں جن سے خاصی بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا تھا، مثلاً بیچ کروفٹ (BEACHCROFT) کا یہ کہنا کہ کہانی کہنا انسان کا قدیم ترین فن ہے، لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ نثری کہانی یا نثری افسانہ جدید ترین صنف ادب ہے۔ گویا وہ بیج جس سے افسانہ کا تناور درخت عالم وجود میں آیا، روز ازل سے ہی اپنا وجود رکھتا تھا۔ تاریخ نویسی کے لئے یہ نکتہ بے حد پُر کشش ہے، لیکن افسانہ کے مطالعہ کے لئے ہم اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح کی خاصی دلچسپ تعریفیں وہ ہیں جو افسانہ کا تعین تعدادِ الفاظ یا مدتِ مطالعہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر شاید ہی کوئی افسانہ ہو جو اپنے تخلیقی عمل کے دوران ان امور کو پیش نظر رکھ کر لکھا جاتا ہو۔

گذشتہ چند برسوں میں نصابی کتابوں اور نصابی ذہنوں نے افسانہ کی ہیئت کو ناول کی ہیئت کے ساتھ اس حد تک گڈمڈ (CONFUSE) کر دیا ہے کہ بار بار یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ جب دونوں اصناف میں اس قدر قریبی مماثلت ہے تو پھر انھیں الگ الگ اصناف قرار دینے سے کیا فائدہ؟۔ اس کے باوجود جب بھی افسانہ کی تکنیک یا اس کی تفاصیل کے بارے میں لکھا جاتا ہے تو غیر ارادی طور پر نہ صرف افسانہ کے قطرہ میں ناول کا دجلہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ مثالیں بھی (دو چار ہی سہی) ناول سے فراہم کی جاتی ہیں اور خود اپنے ذکر میں افسانہ بیگانہ (OUTSIDER) ہی بنا رہتا ہے۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لاکھ امتیاز کے باوجود ایک آزاد نثری صنف ادب کی حیثیت سے افسانہ کا تصور محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جیجزت یا پو کی طرح افسانہ کی ایسی معذوری تعریف کرنی پڑتی ہے کہ سوائے لفظوں اور لمحوں کے ناول و افسانہ

میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

بات کو زیادہ الجھانے کے لئے عام طور سے یہ تاویل کی جاتی ہے کہ ناول و افسانہ میں ہمیں بہت زیادہ فرق اس وجہ سے نظر نہیں آتا کہ تقریباً تمام ہی بڑے افسانہ نگار بڑے ناول نگار بھی رہے ہیں چنانچہ دونوں اصناف کی سرحدیں "خالقِ واحد" کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر قریب آجاتی ہیں کہ ان میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ دلیل بھی کچھ عذرِ لنگ ہی معلوم ہوتی ہے۔ آخر قصیدہ اور غزل میں یہ خلط مبحث کیوں نہیں ہوتا جب کہ ان میں بھی بہت سی صفات مشترک ہیں۔ مثلاً مصرعۂ ثانی کا ہم ردیف و ہم قافیہ ہونا عموماً ایک شعر میں ہی مضمون کا مکمل ہو جانا، شروع میں مطلع اور آخر میں مقطع کا اہتمام کرنا، وغیرہ۔ گویا تکنیک میں بہت زیادہ مماثلت دونوں کو ایک ہی صنف کا صغریٰ و کبریٰ نہیں بنا سکتی۔ اس لئے میں ایک بار پھر وہی سوال اٹھاتا ہوں کہ آخر افسانہ ہے کیا؟

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں افسانہ پر ایک آزاد صنفِ ادب کی حیثیت سے غور کرنا ہوگا بجائے اس کے کہ ہم کسی اور صنف کے سیاق میں اس پر بحث کریں۔ اگر افسانہ اپنی اس حیثیت کو استوار نہیں کر سکتا، تو وہ ادب میں قائم بالذات بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب اس کی کوئی آزاد حیثیت نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ ہم اسے منفرد فسانوی صنف تصور ہی نہ کریں اور جب بھی ذکر کریں تو محض ضمناً ہی کریں۔ اتنے بڑے اقدام کے لئے بھی تو ہم تیار نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس کی اپنی انفرادی حیثیت اپنا اعتراف کرانے کے لئے ہمیں مجبور کر دیتی ہے۔

افسانہ میں وحدتِ تاثر کو اس کی بنیادی صفت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وحدتِ تاثر کس چیز کا یا کس چیز کے بارے میں ہوتا ہے؟ کیا اس میں کسی واقعہ کو بیان کرنے کو اہمیت دی جاتی ہے؟ کیا چند افراد یا کرداروں کی پیش کش کو اساسی اہمیت حاصل ہوتی ہے؟ یا یہ سب اُس کُل کے عوامل ہیں جن کی حیثیت محض ضمنی ہے؟۔ ان سوالات کے جوابات ہمارے لئے بہت سے مسائل کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر ہم ان عوامل پر الگ الگ غور کریں تو ہم اس نکتہ تک نہیں پہنچ سکتے جو افسانہ کی اصل روح کو ہم سے متعارف کراتا ہے۔ چنانچہ افسانہ کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ اس مرکزی خیال کو گرفت میں لینے کی کوشش کریں جس کی خاطر یہ ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔

افسانہ کے تار و پود اس امر کو پیش کرنے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں جس کو پیش کرنے کے لئے افسانہ نگار اپنے اندر تخلیقی تحریک محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک مختصر محدود سے قرطاس پر صرف اس تجربہ، تاثر یا نکتہ کو پیش کرنا چاہتا ہے جو بہت سی تفصیلات سے عاری ہونے کے باوجود قاری کے ذہن پر اپنے نقوش ثبت کر جائے۔

اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ جزئیات نگاری کرے، یا کرداروں کے محاسن و معائب بیان کرے، وہ تو ان سے صرف وسیلہ کا سا کام لیتا ہے، اور افسانہ میں انھیں اسی حد تک نمایاں رہنے کی اجازت دیتا ہے جب تک وہ اس کے مرکزی خیال کو سنوارنے اور اسے پیش کرنے میں ممد و معاون ہوں۔ اس طرح کردار یا واقعات و حادثات صرف اسی حد تک نمایاں ہو پاتے ہیں جس حد تک کہ ان کی ضمناً ضرورت ہوتی ہے۔

افسانہ مکمل ہونے پر کسی خیال، فکر، تجربہ یا جذباتی ردِ عمل کو ابھار دیتا ہے، یہی اس کا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ بھی ضرور ہوگا کہ ہر خیال، فکر، تجربہ یا ردِ عمل کے ساتھ کچھ ذیلی افکار و خیالات یا تجربات و ردہائے عمل ہوتے ہیں جو صرف جزواً ہی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن سب کو اگر مرتب کیا جائے تو ایک محور کے گرد ایک رنگارنگ محیط بھی آراستہ ہو جائے گا۔ اور اِن سب کو جب یک جائی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ تاثر عالمِ وجود میں آئے گا جو افسانہ کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ نوعیت ان افسانوں کی بھی ہوتی ہے جنھیں ہم علامتی افسانہ کہتے ہیں۔ ہر علامتی افسانہ میں ایک کلیدی علامت ہوتی ہے، جس کے ساتھ ذیلی علامتیں وابستہ ہوتی ہیں، یہی کلیدی علامت ہمیں اس انجام تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے جس کے لئے افسانہ تخلیق کیا گیا ہے۔ افسانہ اگر کسی کلیدی علامت کو پیش کرنے میں ناکام ہو جائے تو افسانہ بکھر جاتا ہے، چھوٹے چھوٹے غیر متعلق اجزا میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اس میں داخلی تنظیم پیدا نہیں ہو پاتی۔

جدید ترین اردو افسانہ میں تجرید کو بھی ایک منفرد تجربہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ اس تصور کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے کہ سیاق و سباق، گرد و پیش، مقامیت یا پہچان افسانہ کو غیر معمولی طور پر مختص نہ کر دے۔ یہ لواحق ایسے ہیں جو قاری کی دلچسپی کے دائرے کو بہت زیادہ محدود کر دیتے ہیں۔ اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ اسے امکانی حد تک لطیف یا اثیری (ETHERIAL) بنا دیا جائے۔ اور قاری کو اس کا موقع فراہم کیا جائے کہ قاری خود اپنی ذات کے حوالہ سے اس کو مختص معنویت فراہم کرے۔ افسانہ کے تاثر کو وسیع تر قرطاس عطا کرنے کے لئے یہ تجربہ لائقِ تحسین ہے، کیوں کہ اس طرح قاری فنکار کی انگلی پکڑ کر چلنے کے لئے مجبور نہیں ہوتا۔

تجریدی افسانہ نے خود افسانہ کی تعریف کے لئے نئے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ افسانہ کے لئے پلاٹ، کردار، وحدتِ تاثر، وغیرہ لازمی تقاضے ہیں، کیوں کہ کردار عام طور سے محو ہو جاتے ہیں، پلاٹ اس حد تک مبہم ہوتا ہے کہ اس کے سروں کی تلاش کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ جب مسلمہ اصول ٹوٹ جائیں، ہیئت تبدیل ہو جائے تو روایتی تعریف از کار رفتہ ہو جاتی ہے، اور نئی تعریف کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔

ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ فن پہلے عالمِ وجود میں آتا ہے۔ اور اس کے اصول و قواعد بعد میں ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ فن کار کا ذہن ہمیشہ نقاد کے ذہن پر برتری رکھتا ہے۔ فن کار اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر اعتماد رکھتا ہے اور تخلیقی عمل کے دوران اُن پابندیوں کو اہمیت نہیں دیتا جو اُس پر خارج سے عائد کی جاتی ہیں۔ وہ تو صرف تحریر کو ہیئت عطا کرنے میں منہمک ہوتا ہے جو اس کے باطن میں جلوہ سامانی پیدا کئے ہوتی ہے۔ اس تخلیقی ماحصل یا فن پارہ سے کون سے قواعد و ضوابط مجروح ہوتے ہیں اس کی فکر اسے نہیں ہوتی۔ اس کے فن کو پرکھنے والے کس انتشار کا شکار ہوتے ہیں، یہ اس کا دردِ سر نہیں ہوتا۔ ابتداً روایت سے اس کی بغاوت برافروختگی کا ایک طوفان کھڑا کر دیتی ہے، لیکن بالآخر نقاد کو اس کے ساتھ مفاہمت کرنی ہی پڑتی ہے، اور مسلّمہ اصولوں پر نظرِ ثانی لازمی تقاضہ قرار پاتی ہے۔

افسانہ کے فن میں مسلسل تجربات نے بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیدا کر دی ہے اور اب جب کہ اردو میں افسانہ نے اپنی تاریخ کی تقریباً ایک صدی مکمل کر لی ہے، ہمیں اپنے مسلّمہ تصورات پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہمارا جدید افسانہ اس چوکھٹے میں صحیح نہیں بیٹھ رہا ہے جو اس کو پرکھنے کے لئے ہمیں اب تک فراہم کیا گیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ افسانہ کے لئے وہ بہت سی شرائط جو اب تک عائد کی جاتی رہی ہیں وہ تشفی بخش ثابت نہیں ہو رہی ہیں۔ اِس امر کی طرف میں سطور بالا میں مجملاً اشارہ کر چکا ہوں۔

افسانہ کے بارے میں ایک فرسودہ تصور یہ بھی عام رہا ہے کہ وہ واقعہ یا حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں نے (جن میں پریم چند بھی شامل تھے) اکثر اس بات پر اصرار کیا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں "سچی کہانی" ہے لیکن قارئین نے اس تصدیق کو کسی نوعیت سے بھی اہمیت نہ دی اور یہ روش متروک ہو گئی۔ افسانہ نگار لکھتا رہا، تجربہ کرتا رہا، اور واقعہ یا حقیقت کا مقام افسانہ میں باقی رہا۔ ترقی پسند افسانہ کے پیشِ نظر ایک مقصد تھا چنانچہ اس نے راست بیانی کو غیر معمولی اہمیت دی اور واقعہ یا حقیقت افسانہ کا اصل محور بنا رہا۔ لیکن یہ ہیئت بھی جب کثرتِ استعمال سے فرسودہ ہو گئی تو واقعہ یا حقیقت کو پیش کرنے کا انداز بدل گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا افسانہ وفادارانہ انداز میں واقعہ یا حقیقت کو پیش کرنے کے لئے پابند ہوتا ہے؟ یا اِس سوال کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ افسانوی واقعیت یا حقیقت کیا ہے؟ افسانے کی تعریف کے لئے ان سوالوں کے جوابات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ یہ نافہمی کا مسئلہ اٹھایا ہی اس

لئے جاتا ہے کہ افسانہ بذاتِ خود معرضِ بحث میں آجائے۔

فن افسانہ کے وہ نقاد جو اس صنف کا تجربہ نہیں رکھتے ہیں یا جو اس کی نزاکتوں سے آشنا نہیں ہیں وہ تاریخی حقیقت اور معاشری حقیقت میں امتیاز نہیں کر پاتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ واقعہ یا حقیقت صرف وہ ہے جس کی تصدیق کی جا سکے۔ اصولاً یہ بات درست ہے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسی تصدیق؟ کیا صرف دِن، تاریخ، مقام، افراد کے تعین کی مادّی تصدیق ہی کفایت کرے گی؟ یا وہ واقعہ/حقیقت جو بہ تکرار ہوتی رہتی ہے اور جو وقت، مقام اور فرد کے برابر تبدیل ہوتے رہنے کی وجہ سے عمومیت اختیار کر لیتی ہے؟ میں پورے یقین کے ساتھ اس امر کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ افسانہ تاریخی حقیقت نہیں ہوتا۔ افسانہ تخلیقی صنف ہے اور تاریخ معاشرتی علم (SOCIAL SCIENCE)! دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس لئے دونوں کی حقیقت یا واقعیت کو ایک پیمانہ سے نہیں ناپا جا سکتا۔

تاریخی حقیقت کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے جب کہ افسانہ کی حقیقت استقبالی ہوتی ہے۔ تاریخ اس واقعہ کو اہمیت دیتی ہے جس کا عملاً صدور ہو چکا ہے، اس کے برخلاف افسانہ کے لئے ہر وہ واقعہ اپنی اہمیت رکھتا ہے جس کے صدور کا امکان ہو۔ تاریخی واقعہ مختص ہوتا ہے لیکن افسانہ کا واقعہ عمومیت کا حامل ہوتا ہے۔ تاریخ کے ذریعہ چند افراد (وہ بھی ملکی، سیاسی، اقتصادی اہمیت کے حامل اشخاص) کے حالات اور کارناموں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ تاریخ نام ہی اہم واقعات کا ہے۔ اس کے ذریعہ کبھی بھی کسی معاشرہ یا قوم کی مکمل تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ صرف چند جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، وہ بھی جنگوں کی یا استحصال کی!

افسانہ افراد کو منظر نامہ سے غائب کر دیتا ہے، مقام و وقت کو مبہم کر دیتا ہے، لیکن گرد و پیش اور اس کے احوال کو اپنی گرفت سے جانے نہیں دیتا۔ وہ اپنے دور کے ذہن اپنے وقت کے تقاضوں اور ماحول کی خصوصی صفات کو اپنی فنی بافت میں پیوست کر لیتا ہے، چنانچہ ہر دور کا افسانہ اپنے موضوع (THEME) کے علاوہ اپنی تکنیک کے ذریعہ بھی اپنے عصر کی فنکارانہ نمائندگی کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ افسانہ تاریخ نہیں ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ افسانہ کے ذریعہ زیادہ جامع اور ہمہ پہلو تاریخ کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ معاشرتی علوم کے ذریعہ اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں کیسرر اور سوسن لینگر کے نام تو لئے جاتے ہی رہے ہیں۔ اب لیوس کوزر اور آئن وِیٹ وغیرہ کو بھی حوالہ کی فہرست میں شامل کر لیا جائے۔

افسانہ کی حقیقت یا واقعیت کو زیرِ بحث لانے کے بعد اس کی تعریف کے لئے ایک مسئلہ اور اہمیت

اختیار کر گیا ہے کہ کیا افسانہ بیان واقعہ ہے یا حقیقت کی عکاسی؟ میری نظر میں اس استفسار کا جواب محض اثبات یا نفی میں نہیں دیا جا سکتا، اور جو اصحابِ رائے راست بیانی کی مدافعت میں اس طرح کی حرکت کرتے رہے ہیں وہ نہ صرف اپنے قارئین کو بہکاتے رہے ہیں بلکہ اپنے استدلال کی سطحیت کو بھی رسوا کرتے رہے ہیں۔ افسانہ واقعہ یا حقیقت کو صرف اپنی اساس بناتا ہے، اور انھیں صرف اسی حد تک استعمال کرتا ہے جتنا افسانوی تقاضوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

افسانہ کی معروف و مستند تعریف سے ہٹ کر ہمیں اسے ایسا تجربہ (EXPERIENCE) قرار دینا ہوگا جو افسانہ نگار اپنے گرد و پیش کے سیاق میں ذہنی، فکری اور فنی سطح پر کرتا ہے۔ ہمارے دور میں یہ نثری صنف ہے، حالاں کہ اپنے ابتدائی دور میں اسے شعری قالب عطا کیا گیا تھا۔ اس کی ہیئت ماضی میں خاصی واضح اور متعین تھی لیکن بیسویں صدی کے تجربات (EXPERIMENTS) نے اِس پابندی کو ختم کیا اور اِسے ہیئتی لحاظ سے یک سطحی سے کثیر سطحی تکنیکی تجربہ میں تبدیل کر دیا۔

افسانہ کے لئے واقعہ، کردار، حادثات، مسائل، عروج، حل سب ضروری ہیں لیکن اس حد تک نہیں کہ یہ افسانہ کے ہاتھوں کے ہتھکڑیاں اور پیروں کی بیڑیاں بن جائیں۔ افسانہ نگار انھیں استعمال بھی کر سکتا ہے، فنی تجربہ یا ندرت کے لئے ان سے صرفِ نظر بھی کر سکتا ہے۔

افسانہ وحدتِ تاثر کا بھی حامل ہو سکتا ہے اور کثرتِ تاثر کا بھی! لیکن اس تجربہ (EXPERIENCE) سے عاری نہیں ہو سکتا جس کی افسانہ نگار فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ قاری تک ترسیل کرنا چاہتا ہے اس ترسیل کی ہمہ گیری اور دیرپائی کے لئے وہ افسانہ کو کوئی بھی صورت عطا کر سکتا ہے۔ اِس آزادی کے باوجود افسانہ اپنے سیاق سے وابستہ رہتا ہے۔ یہی اس کا کمال ہے۔ □

(زیرِ تصنیف کتاب "افسانہ کا فن" کے چند ابتدائی اوراق)

ڈاکٹر عتیق اللہ

۱/۲ سی، راجوری گارڈن
نئی دہلی

افسانے کی داخلی گہری ساخت

میں اردو افسانے کی ارتقاء سے مایوس نہیں ہوں۔ اور اگر انفرادی سطح پر میرا ردِ عمل مایوس کن ہو تو بھی مجموعی طور پر افسانے کی صحت بلکہ افسانہ نگاروں کی صحت پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ میں اور میرے علاوہ بہتوں کو ایک ایسی صورتِ حال کا سامنا ضرور ہے جو کبھی طمانیت بخش نظر آتی ہے اور کبھی مایوس کن۔ تشکیک کی یہ کیفیت محض افسانہ ہی سے وابستہ نہیں ہے اردو کی جملہ اصناف ادب اس نوع کا ردِ عمل پیش کر رہی ہیں اور ایک لحاظ سے یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔

نئے افسانہ نگاروں نے اس تخلیقی خلا کو پُر کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ ان میں بھی تشکیک ہے لیکن وہ حوصلے سے عاری نہیں ہیں۔ دراصل افسانے کا فن بڑا CHALLENGING ہے شاعری کی روایات کا ایک واضح اور صدیوں پر محیط نظام ہے۔ شاعری تجرید کا حوالہ ہے۔ شاعر زیادہ سے زیادہ زبان کے تخلیقی امکانات کو بروئے کار لاتا ہے اور لا سکتا ہے۔ اس کی کائنات ایک ایسی تخلیق کا استعارہ ہے جس میں وہ الفاظ کے نئے قرائن خلق کرنے میں خود کار ذہنی جدلیت سے بھی کام لے سکتا ہے۔ شعر کی اکائی لفظ ہے اور افسانے کی واقعہ۔ افسانہ نگار حقیقت سے یک گونہ معاملت کے بغیر کہانی کو اپنی فہم سے آشنا نہیں کر سکتا کہ اس کی تجرید بھی حقیقت ہی کا حوالہ ہوتی ہے۔

میں ان نقادوں میں اعتماد کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ جن کی نظر میں افسانے کی تخلیقی بساط محدود ہے غزل کی بساط بھی تنگ تھی لیکن ہمارے عہد ہی میں ان شعراء کی کمی نہیں جن کی تمام تر تخلیقی زندگی اور تخلیقی وقعت کا مدار یہی بدنامِ زمانہ صنف بن گئی۔ اصل میں ایک کانشس فنکار کے لئے روایت اور اس سے پیش رو روایت ایک بڑا سوال بن جاتی ہے۔ روایت کا ایک زیریں اور خود رد عمل ہوتا ہے۔ جو زبان اور ادب کی تاریخ کے پہلو بہ پہلو جاری رہتا ہے۔ ایلیٹ نے روایت کو کسب کرنے پر اصرار تو کیا ہے لیکن وہ روایت کی اسی جدلی توفیق کے راز کو نہیں سمجھ سکا۔ فنکار اگر باخبر ہے کانشس ہے تو وہ روایت سے کبھی فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کے لائف فورس کو ایک قرینہ عطا کرتا ہے۔ روایت کا ایک عمل تخریف کا عمل ہے۔ خصوصاً قریبی پیش رو

روایت اس قسم کا آسیبی تاثر دیا کرتی ہے۔ وہ للچاتی ہے، دھوکا دیتی ہے، اپنا اسیر کرنا چاہتی ہے اور یہ ثانیہ ایک جینوئن فن کار کے تئیں بڑا آزمائشی ہوتا ہے۔ وہ انکار و اقرار کے مجادلے میں اپنی توفیق کو داؤ پر نہیں لگاتا۔ بلکہ روایت سے زور آزمائی کرتا ہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ روایت کے پہلے عمل کا وہ منکر نہیں لیکن روایت کا دوسرا عمل اس کے لئے چیلنج کا ایک نیا باب وا کر دیتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کے سامنے بھی چیلنج کی اس صورت نے نمو پائی ہے۔

گڑبڑ وہاں ہوئی جہاں نئے افسانہ نگاروں نے نہایت سرعت کے ساتھ عظمتوں کے ہفت خواں سر کرنے میں ساری قوت جھونک دی۔ ایک دوڑ تھی کہ ہر ایک جلد سے جلد اپنی انفرادیت کی مہم سر کرنے کے درپے تھا۔ خالی خولی تجربے کی بن آئی اور بیشتر کو اس بے مہرنے اپنا نوالہ بنا لیا۔ انھوں نے اپنے عہد کے حقیقی آشوب سے صرف نظر کی اور مغرب کی تکنیکی تجربہ پسندی کو اپنا مرکزِ ثقل بنایا اور ہوائی کرتب دکھاتے رہے چھوٹی چھوٹی حیرتوں اور کامرانیوں نے انھیں لمحاتی خوش وقتی کا اسیر بنائے رکھا۔ نتیجہ سامنے ہے۔ افسانہ گھپلے میں پڑ گیا اور خود افسانہ نگار چاروں خانے چت۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے روایت سے کس قدر سیکھا ہے کس قدر اسے اپنی فہم کا حصہ بنایا ہے۔ کس قدر اسے راہ دی ہے، کتنی مدافعت کی ہے، کتنا سپرد کیا ہے، اور کتنا اضافہ۔ پریم چند، کرشن چندر، بیدی یا منٹو کو بے جوڑ قرار دینے یا ان پر تبرّہ بھیجنے سے نیا افسانہ جنم نہیں لیتا اور نہ ہی ان سے قطعی مغاہمت کرنے سے تموّل کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ روایت کا دوزخ پار کرنے کے بعد ہی تخلیقی انحراف کی راہ روشن ہو سکتی ہے۔ ہمارے اکثر افسانہ نگاروں نے اس نقطے کو سمجھنے کی یا تو کوشش ہی نہیں کی یا انھیں نقادوں کے عمومی فیصلوں کے پیش نظر اپنی ترجیحات کو بیع کرنے میں زیادہ سہولت دکھائی دی۔ تنقید نے تنقید سے اپنا شکم بھرا اور بڑی چالاکی سے تخلیق کو اپنا تابع محمل بنا لیا۔

افسانہ زندگی کا ایک جز ایک کیفیت ہے۔ اس کا اصل حسن اس کے اجمال ہی میں کھلتا اور پروان چڑھتا ہے۔ ارتکاز کی بے پناہ شاعرانہ صلاحیت کے بغیر افسانے کے جوڑ جہاں تہاں سے کھل جاتے ہیں۔ تاثر کی وحدت مجروح ہو جاتی ہے اور تجربے کی سالمیت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اس نواح میں پلاٹ کے معنی وہ نہیں رہ جاتے جنھیں ہم اپنی درس گاہوں سے رٹ کر آتے ہیں۔ افسانے کے ضمن میں پلاٹ سب سے بڑا مغالطہ ہے۔ خصوصاً پلاٹ کے مروجہ تصوّر کی روشنی میں افسانے کی بساط تنگ ہے۔ پلاٹ اپنی مناسب تعریف میں عمل، کردار اور خیال کی ترکیب ہے۔ افسانے کو ابتدا اور انتہا کی ایک ایسی مخصوص فریم میں چست بھی نہیں کیا جا سکتا جس میں کہانی کی رفتار بہ تدریج اور واقعات کا ارتقا زمان

کے ایک خاص نظم کے تحت ہوتا ہے۔ ڈراما میں بہ ہر صورت پلاٹ کی اِس منطق کو بہ روئے کار لایا جا سکتا ہے اور لایا جا رہا ہے لیکن افسانے کے خصوص میں تجربہ اور حقیقت وقت کی ایک مسلسل تنظیم کے تحت نشوونما نہیں پاتے۔ بلکہ افسانہ نگار کی ذہنی اور تخلیقی رو کی مناسبت کے ساتھ ایک واقعی ہیئت میں نظم ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے افسانے کے ذیل میں پلاٹ یا تو محض ابتدا کا نام ہے یا ایک ایسے داخلی نظم کی تعبیر کا نام ہے جسے دوسری طرف قاری خود اپنے ذہن میں تشکیل دیتا اور قایم رکھتا ہے۔ حقیقت سے ربط اور حقیقت کے ادراک کی ایک سطح خود فنکار کی اپنی ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی صدمہ اس کے لئے ایک اہم تخلیقی معنی بن جاتا ہے اور وہ اسے ایک نئی حقیقت کے طور پر فنی بالیدگی سے گذارتا ہے۔ یہاں پہنچ کر کیا ہم پلاٹ کے بندھے ٹکے تصوّر کا اطلاق افسانہ کے فن پر کریں گے؟ جب کہ ہر افسانے کے ساتھ پلاٹ کے معنی اور پلاٹ کا تصوّر بدل جاتا ہے ذرا ایک نظر بالکنی (کرشن چندر) ممّی (منٹو) چائے کی پیالی (حسن عسکری) سایہ (غلام عبّاس) جلا وطن (عبداللہ حسین) بے محاورہ (جوگندر پال) لا (کلام حیدری) آخری کمپوزیشن (مین را) رونے کی آواز (سریندر پرکاش) آگ کے ہم سائے (احمد یوسف) یا ہو کی نئی تعبیر (رشید امجد) پانی میں گھرا پانی (محمد منشا یاد) گرتے آسمان کا قصہ (احمد داؤد) دھند اور دھول (کنور سین) زنجیر ہلانے والے (سلام بن رزّاق) سونے کی مہر (مرزا حامد بیگ) اور بانگ (شوکت حیات) وغیرہ افسانوں کی داخلی ساخت بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں پلاٹ کا عمل ایک دوسرے سے مختلف اور داخلی خود رو کردار کا حامل ہے۔ اس کا میکانیکی تماشہ افسانے کو محض ایک فارمولے میں بدل دیتا ہے۔ جب وہ اپنی حرکت کی اکائی میں از خود نمو کشود پاتا ہے تو ابتدا اس کی ابتدا بھی ہو سکتی ہے، اس کی انتہا بھی اور اس کا وسط بھی۔ اپنی انتہا میں وہ منطق کے مطابق بھی ہو سکتا ہے اور غیر متوقع اور اتفاق بھی۔ اس کی نمایاں اور ذیلی تبدیلیاں اور وقوعے رسمی بھی ہو سکتے ہیں اور غیر رسمی بھی۔ مگر اپنی ہر صورت میں وہ موضوعِ وقت اور عمل کی ایک محدود بساط سے متجاوز نہیں ہوتا کہ افسانوی پلاٹ میں خارجی صورتِ حال و واقعات اور داخلی ذہنی کیفیات و توقعات کا باہمی تعامل برسرِ کار رہتا ہے۔ وہ کسی جامد لمحے پر استوار نہیں ہوتا بلکہ بہ ذاتِ خود ایک متواتر حرکت ہے جو افسانے کے مختلف اجزا کو ایک معنی عطا کرتی ہے۔ زمان کو کتنا بھی الٹ پلٹ دیا جائے افسانہ نگار کی ذہنی اقلیم میں وہ ایک داخلی اور نامیاتی رو کے تحت ہی اپنی آخری سطح تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح قاری کی اپنی ذہنی رو افسانے کے ظاہرا CHAOS میں ایک الگ نظم کا سراغ لگا لیتی ہے۔ لیکن یہ سب حقیقت سے پہلے اور بنیادی اقرار کے بعد کا عمل ہے۔ افسانہ نگار اگر بے صبرا ہے، اس پر آن کی آن میں منزل کو جا لینے کی دھن سوار ہے۔ زبان و بیان پر اس کی گرفت ڈھیلی ہے۔ اس کا تجربہ کوتاہ و کم عیار ہے۔ مغالطہ سازی اسے عزیز ہے تو اس کی ذہنی پراگندگی افسانے میں بھی آشکار ہو گی۔ اس کی کوئی بافت ہو گی

نہ کوئی ساخت۔

مقصود یہ کہ افسانہ کے ضمن میں ارسطوئی MYTHOS پر مبنی پلاٹ کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا افسانے نے ہمیشہ پلاٹ کے معینہ تصور کو بے دریغی سے رد کیا ہے۔ پریم چند کا سارا کا سارا فن آئیڈیا کی تعمیر و ترسیل کو مختص ہے۔ زبان۔ کردار اور واقعہ کی تشکیل بھی وہ آئیڈیا کے تحت کرتے ہیں۔ وقت کے معاملے میں ان کے ضبط اور خارجی واقعات پر اصرار کی وجہ بھی ان کے اسی رویے میں مضمر ہیں۔ انسانی شعور کی مختلف جہتوں کو دریافت کرنے میں ان کی دلچسپی کم سے کم ہے۔ لیکن پریم چند ایسے منضبط ذہن رکھنے والے کہانی کار کی کہانیاں بھی بسا اوقات ان کی عاید کردہ لکشمن ریکھاؤں کو چھلانگ جاتی ہیں۔ 'شکوہ و شکایت' کا تسلسل داخلی ہے نہ کہ خارجی۔ وقت کے مقررہ نظام میں یہاں بھی جگہ جگہ سے شکن پڑ جاتی ہیں۔ ایک رو دوسری رو کو کاٹ دیتی ہے۔ سارے لاحقے سابقے گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ محض ایک کردار کی داخلی کلامی افسانے کے دروبست میں سوت کا کام کرتی ہے۔ کم و بیش یہی شکل کرشن چندر کے کالو بھنگی میں عیاں و نہاں ہے۔ کہیں کوئی کردار اور کہیں افسانوی واحد متکلم درمیانی وقفوں اور درزوں کو پُر کرنے کا کام کرتا ہے۔ کبھی بہ ظاہر واقعاتی عدم مماثلتوں کے پس پشت مکان اور مقام افسانے کی گہری ساخت کی تعمیر کرتے ہیں اور سچویشن افسانے کی اس بیرونی ساخت کی تعمیر بن جاتی ہے جس کے جوڑ جہاں تہاں سے کھلے ہوئے اور علاحدہ علیحدہ سے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ افسانہ نگار افسانے کی گہری ساخت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ چوں کہ اس کا معاملہ زمان کے ایک محدود ترین عرصے سے ہوتا ہے اس لئے بیرونی ساخت کی باقاعدگی اس کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج بنی رہتی ہے اور اُسے اس باقاعدگی کو تہس نہس کر کے گہری ساخت کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ احمد علی کی ہماری گلی، قرۃ العین حیدر کی ڈالن والا، غلام عباس کی آنندی، جوگندر پال کی عمود اور بازیافت، ـــــ اور انور عظیم کی سات منزلہ بھوت میں موقعیت افسانے کی گہری ساخت کی تعمیر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہانی جب آپ اپنی راہ لیتی ہے اور اپنی فطرت کی تلاش آزادانہ سطح پر خود کرنے کے درپے ہوتی ہے تب ہی پلاٹ کو ہزار طرح کے صدمے اٹھانا پڑتے ہیں۔ ایک کیفیت، ایک صدمہ یا ایک تاثر کے اظہار کے لئے دو چار سطریں کافی ہوتی ہیں لیکن افسانہ نگار اِس کیفیت، صدمے یا تاثر کو شدید، متعلق، غیر معمولی اور بے چینیوں سے معمور کرنے کی غرض سے متوازی تلازموں، خیالوں اور جذبوں کی دھنک کھینچ دیتا ہے۔ جہاں غیر متوازی اور غیر یکساں واقعات، جذبات اور تاثرات سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں افسانے کی گہری ساخت مختلف جوڑوں کو مربوط کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔ افسانہ نگار جب افسانے کو بیرونی ساخت کے حوالے کر کے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر چلتا ہے اور تنظیم کے حق میں باریک سے باریک درز اور معمولی سے معمولی صدمہ بھی گوارا نہیں کرتا تو اُلٹا افسانہ

ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ہر موڑ نپا تلا، ہر کردار ڈھلا ڈھلایا، ہر تاثر مرتب اور ہر منظر تواتر کے مطابق ـــــ گویا افسانہ نگار کوئی افسانہ نہیں تاج محل کھڑا کرنے جا رہا ہے۔

کرشن چندر پر بار بار یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے افسانے کی بُنت چست نہیں ہوتی کیوں کہ افسانہ اپنے مرکز سے منقطع ہو کر بے اختیار جذبے اور شاعرانہ تخیل کی معیت میں گم ہو جاتا ہے۔ افسانے میں کئی ناگزیر LINKS محو ہو جاتی ہیں اور کئی غیر ضروری اور غیر متعلق تلازمے در آتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ہمہ وقت بھی ہیں اور ہمہ دان بھی۔ مستزاد یہ کہ کبھی کبھی کسر تجزیہ پسندی نکال دیتی ہے۔ کردار اپنے ملبوس میں ننگے فطرت ہزار رنگوں میں آر پار، واقعہ اپنے وقوعے سے قبل معلوم۔ گویا کرشن چندر واقعے کی اصل حرکت کو اپنے طور پر پروان نہیں چڑھنے دیتے۔ کبھی ان کا اپنا رویہ اور نظریہ افسانے کے فطری ٹون پر اثر انداز ہوتا ہے تو کبھی ان کی ہمدردانہ طرف داریاں افسانہ کی خود رو ہیئت پذیری کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ درست، ایک نظر منٹو انتظار حسین اور قرۃ العین پر بھی ڈال دیکھئے۔ جن کے افسانوی کمالات کے بیانوں سے ہماری زبان نہیں تھکتی ٹوبہ ٹیک سنگھ کو آپ کیا نام دیں گے۔ کیا افسانہ نگار کی واضح تر ذہنی جانب داری یہاں نمایاں نہیں ہے۔ قاری کو پوری قوت کے ساتھ اپنے انتخاب کی راہ پر لانے کی یہ ایک ایسی کوشش نہیں ہے جس میں قاری کو افسانے کی بنیادی واقعی حرکت کے رونما ہونے سے قبل بہت سی غیر متعلق آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ گو کہ پورا افسانہ سارکازم کی بنیاد پر قائم ہے۔ لیکن کیا افسانے کا ابتدائی مرحلہ اپنے تمام تر معنوی رابطوں کے باوجود بالآخر افسانہ نگار کی پیش بند توضیح ثابت نہیں ہوتا؟ ہتک جیسے معرکۃ الآرا افسانے کا ابتدائی طویل حصہ سوگندھی کی اس صورتِ حال سے مربوط ضرور ہے جس سے واقعیت نمو پاتی ہے۔ لیکن منٹو اسے قلیل ترین لفظوں میں بھی پیش کر سکتا تھا سیٹھ کی اونہہ کے بعد کے ردِ عمل کو جس قدر طویل بیان کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اسے مختصر سے مختصر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن نہ تو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس طرح کی قطع و برید کی ضرورت ہے اور نہ ہتک میں۔ کیوں کہ افسانہ نگار کو ایک بات پیش کرنے کے لئے اسے کئی حوالوں سے بامعنی اور شدید بنانا پڑتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ فوری اشاروں سے کام لیتا ہے اور ان اشارات کو پیش کرنے کا ذریعہ محض بیان ہوتا ہے۔ البتہ "سڑک کے کنارے" کا آخری طلاقاتی نوٹ مختصر ہونے کے باوجود غیر ضروری اور زائد ہے۔ جس کا مقصود سنسنی خیزی ہے اور بس۔ 'قرۃ العین نے یادوں کی ایک دھنک چلے' کے آخری صفحوں میں اس سے کہیں زیادہ بے صبری کا ثبوت دیا ہے۔ کارمن اور پت جھڑ کی آواز ایسی مثالیں ان کے یہاں کم یاب ہیں۔

انتظار حسین کے یہاں اخلاقی بحران اور ماضی سے علاحدگیوں کے کرب اور گذشت کے آسیبی خوابوں کی تکرار ہے۔ ان موضوعات کی باز آفرینی اس کے بیشتر افسانوں میں جا بجا کارفرما ہے کہیں یہ مسائل بنیادی ہیں کہیں

فردِ عمل اور ذیلی طور پر آپ ہی آپ سرایت کر گئے ہیں۔ 'آخری آدمی'، 'ٹانگیں' اور زرد کتا میں انسان کی بدی ایک کابوس بن کر افسانہ نگار کے ذہنی گراف پر محیط ہو گئی ہے۔ انتظار حسین ذہنی توہمات اور مفروضات کو پوری قوت کے ساتھ افسانے میں رچانے بسانے کا ہنر جانتا ہے لیکن افسانے کا فن شیشہ گری کا فن ہے۔ اس کی نازک اور کومل بافت پر داخلی تجزیوں کی مسلسل دخل اندازی خود افسانہ نگار کی کم اعتمادی کی غماز ہے۔ آخری آدمی میں فرسودات ارشادات اور جا بجا اسماء کے حوالے افسانے میں کئی جگہ درزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ 'ٹانگیں' میں آخری تین چار صفحات میں پیش رو تفصیلات کی باز آفرینی ـــــ انتہائی غیر ضروری اور حشو معلوم ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے افسانوی اسلوب کو عموماً داستانوی قرار دیا جاتا ہے اور خود انتظار حسین کو اپنے افسانے کی مشرقیت پر اصرار ہے۔ جب کہ داستان نگار کی استعاراتی زبان، نثر کی بے بضاعتی اور کم کوشی کا نتیجہ تھی نہ کہ اس کی ضرورت تاہم فکر کی سطح پر داستان کا سیاق کردار ژولیدہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے تھیم کے اخلاقی پہلو سے مربوط ہوتا ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ داستان ہوتی ہے تخیم جسیم، تفصیل اندر تفصیل کی حامل عینیت کی زائیدہ، تقدیر کی محکوم۔ اس بیسویں صدی میں انتظار حسین اگر داستان بھی لکھنا چاہیں گے تو داستان کو اپنی پہلی سطح پر دلچسپ اور مربوط بنانا ہوگا PARABLE اور FABLE یا اسطور کی بنیاد پر چند کہانیاں تو برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن متواتر ان تکنیکوں کو دہرانا اپنی اوقات کو مٹی میں ملانا ہے۔ اپنی تخلیقی کوتاہ دستیوں کی پردہ داری کرنا ہے۔ آج کا قاری دخل نہیں اپنی شرکت چاہتا ہے۔ ترقی پسند کہانیاں بھی تھیم کی کہانیاں ہیں اور خود انتظار حسین کی کہانیاں بھی تھیم کی کہانیاں ہیں پروپگنڈہ دونوں جگہ ہے۔ انتظار حسین کو شکایت ہے کہ ترقی پسند نقادوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ترقی پسندوں کو یہ شکایت ہے کہ بھائی یہ تو ہمارا ہی ہم زاد ہے فرق اتنا ہے کہ اس نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھی ہے۔ ابھی وہ نقاب میں سے دیکھنے کے عذاب ہی سے گزر رہا ہے۔ برتنے کی تعذیب سے دوچار ہوگا تو ساری عینیت دفع ہو جائے گی کہ عزیز من زندگی کا اصل جہنم تو یہ ہے یہ دیکھو تمہاری رگِ جاں کے نزدیک تمہارے بازوؤں میں اس کے ایک نہیں کئی دہانے ہیں اور دہانہ شتر شتر گز منہ پھاڑے ہوئے یہ نعرہ بلند کر رہا ہے ہل من مزید، ہل من مزید، دکھ کتاب میں نہیں ارد گرد ہے۔ تمہارے باہر ہی نہیں تمہارے بطن میں بھی ہے۔ لیکن تم جانتے بوجھتے انکاری ہو۔ انتظار حسین کا المیہ ہے کہ اس نے حقیقت کو ایک مخصوص و محدود چیز بنا رکھا ہے اس کی جدلیاتی فطرت کے ابلاغ سے ابھی وہ چنداں دور ہے۔ انتظار حسین کی خطابت کا آہنگ اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ ترقی پسند افسانے کی کمزور مثالوں میں پایا جاتا ہے۔ پھر بھی ترقی پسند افسانہ حقیقت کی کسی نہ کسی سطح کا حوالہ ہے۔ وہ ہماری فہم اور تجربے سے دور نہیں جاتا۔ انتظار حسین افسانے کی حدود میں بالواسطہ طور پر انسانیت اور اخلاقیات کی دہائی دیتا ہے۔ روحانی اور اخلاقی زوال کی نوحہ خوانی کرتا ہے۔ حال کو کوستا ہے اور حال ہی کے قبول کردہ نئے تناظر

میں اپنی تہذیبی شخصیت کی تلاش کرتا ہے۔ اور تلاش نہیں کرتا کہ اس ساری پراگندگی اور ابتری کی بادی وجوہ کیا ہیں۔ انسان کو محض بد کہتے رہنے سے نیک انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی انتظار حسین اپنی فطرت میں نیک ہے اور تہہِ دل سے اس کا زور نیک قدروں کے احیاء پر ہے تو اسے اپنی وضع کردہ افسانوی تکنیک کو خیرباد کہہ کر جس ماحول میں وہ سانس لیتا ہے۔ جن لوگوں کے لمس سے شبانہ روز دوچار ہوتا ہے جس زبان میں سوچ بچار کرتا ہے" اس کا عمل و ردِ عمل ایک ایسی تکنیک میں پیش کرے جو تخلیقی توانائیوں سے متصف ہونے کے باوصف حقیقت و موقعیت کے تجربے سے منقطع دکھائی نہ دے۔ ایسا نہیں ہے کہ فکشن کی اصل اور واقعی زبان حکائی یا داستانوی ہی ہے یا موجودہ زبان فنکار کے احوال و تجربات کے تئیں ناکافی ہے۔ آج کی زبان پہلے کے نسبت ـــــ زیادہ قوی، زیادہ مجرد و محسوس زیادہ گستاخ، زیادہ قدرت کی حامل ہے۔ انتظار حسین ڈر ڈر کے اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ اپنے تعینات، تعصبات، اور ترجیحات سے باہر نکل کر اپنے آپ کو چاروں دھام بکھیرنے کی سعی نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ اس کا افسانوی فن چند مخصوص مسائل و موضوعات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ افسانہ چوں کہ داستاں یا داستان کی قاش بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے اس کے افسانے کی گہری ساخت بھی مربوط نہیں ہو پاتی۔ انیس ناگی نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "انتظار حسین قصہ گوئی کے فن سے واقف ہیں، لفظوں کے تلازماتی ہیر پھیر سے بھی آشنا ہیں لیکن تصوراتی سطح پر ان کے یہاں "فردوس گم گشتہ" ایک واحد تجربہ ہے اور اس کا ناسٹیلجیا ان کا واحد احساس ہے، چنانچہ تجربہ اور وسعت، جو نئے افسانے کی ایک اہم ضرورت ہے، وہ ان کے یہاں دستیاب نہیں ہے اس طرح انتظار حسین کا فن انسانی صورتِ حال کی علامت بننے کے بجائے ایک محدود "اقلیت" کا نوحہ بن جاتا ہے، ان کے افسانوں میں نئے افسانے کی تمام تکنیکیں دستیاب ہیں۔ لیکن وہ اپنے مواد سے جدا ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔
> (تصوراتِ لاہور صفحہ ۵۴، ۱۹۷۸)

افسانہ تو TELEGRAPHIC TERSNNESS کا وظیفہ ہے۔ جس میں مختلف معنوی جہتیں ایک خود کار وضع میں ڈھل جاتی ہیں اور اس طور پر افسانے کے داخلی سیاق کو ایک ایسے لسانی اسلوب سے مالا مال کر دیتی ہیں جس میں تجربہ اور زبان مل کر ایک وحدے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح افسانے کا مواد، مواد نہیں رہ جاتا بلکہ افسانے کا خمیر افسانے کا اسلوب، افسانے کا قرینہ افسانے کی زبان بن جاتا ہے۔ اور جو افسانے کے ہر درجے میں یکساں طور پر اپنی شرکت اور اپنی شمولیت کو قائم رکھتا ہے۔ اس معنی میں انیس ناگی کا یہ خیال کہ "انتظار حسین کے افسانوں میں نئے افسانے کی تمام تکنیکیں دستیاب ہیں۔ لیکن وہ اپنے مواد سے جدا ہوتی ہوئی

نظر آتی ہیں بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن انیس ناگی نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کا ایک سبب تو خود انتظار حسین کی اپنی ادعائیت اور ہٹ دھرمی ہے۔ وہ ایک ایسا نامراد عاشق ہے جسے کسی سبز پوش سوار نے ہنوز لائق اعتنا نہیں سمجھا کہ کیوں مفت میں اپنی جان کھپاتا ہے۔ جا ملک روم میں تجھے آزاد بخت ملے گا اور وہیں تیری مراد پوری ہوگی۔ انتظار حسین کو یہ سوجھتا ہی نہیں کہ افسانے میں اگر اسلوبیاتی قطعیت کی مثال قایم کرنا ہے تو پیارے بھائی اپنی کالم نویسانہ تبلیغی و تنبیہی رویوں کو تج کر افسانے کے اس قماش پر توجہ کیجیے جس میں اپنے عہد کی حسیت اور واردات بھی نظر آئے اور پلاٹ کی گہری ساخت کی حرمت بھی قایم رہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ہماری تنقید نے کرشن چندر کے داخلی تجزیوں کی بنیاد پر اس کے افسانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ گو کرشن چندر اور انتظار حسین کے رویوں میں بعد القطبین ہے۔ لیکن اپنے اپنے تصورات کے اطلاق میں دونوں کے یہاں بے صبرا پن جھلک مارتا ہے۔ کرشن چندر پھر بھی ایسی گنجائش فراہم کر دیتا ہے کہ قاری، بلکہ صاحب بصیرت قاری حشو و زوائد کا احساس کئے بغیر افسانے کی واقعی حرکت کو اپنے شعور کی رو سے متوازی جاری خیال کرتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنی تخلیقی قوتوں کے اظہار کا میڈیم ادب کی جس صنف کو بنایا ہے وہ اس کی نفسیات اور نزاکتوں سے کم واقف ہے۔ انیس ناگی "قصیدہ گوئی کے فن" کی حد تک انتظار حسین کی واقفیت کو مسلم گردانتا ہے لیکن افسانے کے ساتھ "نئے" کا سابقہ نتھی کر کے انتظار حسین کو دوسرے ہی لمحے غیر متعلق بھی قرار دیتا ہے کہ اس کے یہاں تجربہ اور وسعت دستیاب نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ میں اتنی حاکمانہ قدرت نہیں رکھتا کہ کب اور کہاں اسے اپنے آپ کو ظالمانہ بے دلی کے ساتھ علیحدہ کر لینا چاہئے اور کہاں پھر یک گونہ فن کاری کے ساتھ جوڑ لینا چاہئے۔ افسانہ خود ضبطی کا حوالہ ہے۔ پلاٹ کی داخلی گہری ساخت اس قسم کے متواتر داخلی تجزیوں اور حوالوں کی بھرمار سے بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

افسانہ کی ایک ہمہ محتوی کیفیت، ایک جذباتی صورتِ حال ہوتی ہے۔ فن کار کا اپنا ایک رویہ ہوتا ہوتا ہے۔ کہیں داخلی تجرید اسے جذبوں کی ترمیم کے لئے اکساتی ہے۔ کہیں ترسیل کے معنی کے ضمن میں علامت اور استعارہ اس کے تخلیقی ضمائر ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی زندگی کی نارسائیاں، پیچیدگیاں، ضدیں اور مغائرتیں اس کے لئے ہیو مر اور آئرنی کا ایک وسیع میدان فراہم کر دیتی ہیں۔ یہ فن کار کی تخلیقی کارکردگی پر منحصر ہے کہ وہ کس طور پر فن کے نامیاتی واحدے کا وقار محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ انتظار حسین کو اپنی نام نہاد علم دانی کے مظاہرے سے سروکار ہے خواہ اس کا وسیلہ کچھ ہو انجام کچھ ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ پے بہ پے ناموں، حوالوں اور فرمودات سے افسانہ اس قدر گنجان اس قدر حاملہ ہو جاتا ہے اور کیفیتیں ہڑدونگے

اتنی سرعت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں کہ ذہن میں کوئی پیکر کوئی موڈ قایم نہیں رہتا۔ قاری کو افسانے کے ساتھ اتنے کانشس ہو کر چلنا پڑتا ہے کہ اس کی آزاد ذہنی تخلیقی وابستگی ——— متوازی طور پر قایم نہیں رہتی اصلاً انتظار حسین کو VERBOSITY کا عارضہ ہے وہ اسلوبیاتی قطعیت کی دُھن میں کہانی کو اپنے فیصلے پر چھوڑنا گوارہ نہیں کرتا کہ کہانی کی یہ بال دیری ہی اس کی منطق کو راس ہے۔

کالو بھنگی ہو یا گڑرایا، یا مہالکشمی کا پل ——— ٹوبہ ٹیک سنگھ ہو کہ جنگ، کہانی باہر ہی باہر اپنا سفر طے نہیں کرتی بلکہ داخلی جوڑوں کے باہمی رابطے اس کی گہری ساخت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال، انور سجاد، مین را، غیاث احمد گدی اور سریندر پرکاش نے بڑی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کے یہاں حقیقت کا خودکار تقلیبی عمل بھی ہے اور افسانے کی داخلی چستی بھی۔

ہمارے افسانہ نگاروں کا مشاہدہ جس قدر وسیع ہوگا۔ حقائق پر جتنی گہری نظر ہوگی، ادراک جس قدر شدید ہوگا۔ ان کی ترجیحات میں از خود امتیاز کی سطحیں رونما ہوں گی۔ وہ چیزوں اور چیزوں کے مابین فرق کو محسوس کریں گے۔ انسانی زندگی اور فطرت کی پیچیدگیاں، انفس و آفاق کی رمزیت، علم و بصیرت کی تعذیب، وقوعات و واقعات کا غیر متوقع پن، سیاقی عدم مطابقتیں، بے وقوفیاں، گمانیاں بدگمانیاں، حوصلگی و بے حوصلگی، انا و ضمیر کی کشاکشیں اور کش مکش، چھوٹی بڑی حرتیں، کامرانیاں، پسپائیاں معنویتیں، عدم معنویتیں، تشکیک یقین، خواب اور ماضی کا سلسلہ جب تک قائم ہے۔ افسانہ میں تازہ دمی اور تازہ کاری قایم رہے گی۔ یہ ساری قلم رو افسانہ نگار کا تخلیقی سرچشمہ ہے۔ حیات و کائنات کی یہ رنگارنگی افسانہ نگار کے حقیقی فنی اسالیب ہیں۔ زندگی کا فن افسانے کا فن ہے استعاروں اور علامتوں کا نمود کشود، نئے سے نئے تخلیقی تلازموں کی جستجو، داستانوی توسیعی و تشکیلی عمل یا اسطور سازی بُنت، شاعرانہ پیکروں کے جھرمٹ پیدا کرنا، یا لسانی محاورے سے انحراف اور لفظ کی داخلی صوتی حرکات پر اصرار ——— اپنی جگہ درست، ہزار بار درست۔ لیکن یہ ساری تکنیکیں افسانے کے تحت میں داخلی تجرید اور معانی کی توسیع کا کام کرتی ہیں کہ اب افسانہ سننے اور سنانے کی چیز نہیں بلکہ لکھنے اور پڑھنے سے عبارت ہے۔ تاہم گوئی، اس کے خمیر میں شامل ہے۔ اب قاری کہانی پڑھتا ہے اور یوں پڑھتا ہے گویا خود کو سنا رہا ہو۔ اسے سامنے دیکھ رہا ہو۔ جن تکنیکوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ تکنیکیں تخلیق کی ضرورت کے تحت از خود نمو پاتی ہیں اور حقیقت کی واردات کو ایک نئی حقیقت، ایک نئے جمالیاتی واحدے میں منتقل کر دیتی ہیں۔ اسی لئے میرے نزدیک یہ تمام کی تمام تکنیکیں معانی کی توسیع، تجرید اور ترسیل کے وسیلے ہیں اور لفظ کی معنوی تقلیل سے گریز کے ذرایع بھی۔ ایک اچھا افسانہ تخیل و بصیرت کا کرشمہ، تجربے کی تجسیم اور انسانی باہمی حرکتوں کا ماجرا ہوتا ہے۔ اس میں اگر کوئی داخلی ضبط نہیں ہے اور اس ضبط کو قایم رکھنے یا نہ رہنے کا یہ جواز اور عذر پیش کیا جائے کہ زندگی بذاتہٖ ایک غیر منظم چیز ہے

تو پھر ہماری ساری تہذیبی جستجو میں غلط، سارے فنون بے مصرف، سارے تناظرات و مظاہرات کے تحت ہیں جدلی سرگرمیاں بے معنی ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار نے اپنے لئے جو حدود قایم کرلی ہیں اور جن تعصبات کو اس نے جز وایمان بنالیا ہے۔ انھیں اگر بے دردی سے تہس نہس کر دیا تو یقیناً افسانہ تجربات کا ایک بہترین سرچشمہ ثابت ہوگا۔ وہ بے لچک ہے تو محض شعبدہ بازوں کے لئے، زندگی کے امکانات و تجربات پر یقین رکھنے والوں کے لئے اس کے مضمرات لامحدود اس کی رسائیاں بے کنار ہیں۔ ☐

اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ، الٰہ آباد

ٹیرس پر بیٹھی شام

"اوہ، ہیلو!"

دھک! پروفیسر کانیٹکر (KANETKAR) کا دل لمحہ بھر کو جیسے رکا، پھر دگنی رفتار سے دھڑک اٹھا اور خون کا دباؤ ان کے چہرے پر غیر مرئی سرخی دوڑ گیا ——— وہ آگئی تھی!

جسے 'ہیلو' کہہ کر پکارا گیا تھا، اس نے کیا جواب دیا اور کیا باتیں ہونے لگیں، پروفیسر کانیٹکر نے وہ سب نہیں سنا۔ ان کی تمام قوتیں اس کی موجودگی کے اثر سے گویا سلب ہوگئی تھیں۔ کانونٹ زدہ لہجے میں اس کے بات کرنے کا، ان کی مترنم ہنسی کا، اس کے لہجے کی شہد جیسی مٹھاس کا احساس گویا ان کے سارے وجود پر چھا گیا تھا۔

پیڈ پر رواں ان کا قلم اچانک رک گیا تھا۔ اور کاغذ سے ذرا اوپر ان کے آدھے مڑے ہاتھ میں بیجان سا اٹکا تھا۔

لمحہ بھر کانیٹکر اسی طرح آواز پر کان لگائے بیٹھے رہے، پھر انھوں نے آہستہ سے آنکھیں اٹھائیں، اس کی آواز بالکل سامنے سے آرہی تھی لیکن کھڑکی کے باہر سیمنٹ کا جنگلا، جسے ان کا دوست ٹیرس (TERRACE) کہہ کر پکارتا تھا، خالی تھا۔ پروفیسر کانیٹکر کی نگاہیں ٹیرس کے پار دادر کے ساحل کی ریت، اس پر سیر کو آنے والے لوگوں، نالے کی پلیا کے قریب جمناسٹک کے کھیل دکھانے کو تیار بے فکرے نوجوانوں، سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں یا افق پر ڈوبتے ہوئے آفتاب ——— کہیں پر نہیں ٹکیں۔ قلم میز پر رکھ کر وہ اٹھے۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے کھڑکی کے باہر دیکھا ——— وہ ٹیرس پر ہی بیٹھی تھی، مگر کھڑکی کے سامنے نہیں۔ ذرا سی بائیں طرف ترچھے کو، کھڑکی کا پٹ ساحل سمندر سے آنے والی ہوا کے دباؤ سے تھوڑا بند ہوگیا تھا۔ پورا کھل جاتا تو اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی، ذرا سا دائیں طرف کو جھک کر وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔

پروفیسر صاحب نے چاہا، کھڑکی پوری کھول دیں۔ تبھی ایک غلط انداز سی نگاہ اس نے ان کی طرف پھینکی۔ ان کا سارا خون جیسے ان کے چہرے کی طرف امنڈ آیا۔ دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا۔ انھیں کھڑکی کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور نگاہیں انھوں نے دائیں طرف ٹیرس سے ہٹا کر نالے کی پلیا

کے ادھر اکٹھے ہونے والے لڑکوں پر جما دیں، جنھوں نے اپنے کپڑے اتار کر ٹیریس کے پاس رکھ دیئے اور لنگوٹ لگا کر یا نیکریں پہن کر کودنے پھاندنے کو تیار تھے۔

نہ جانے شہر میں کوئی سرکس آیا تھا یا کوئی سکاوٹس ریلی ہو رہی تھی۔ لڑکے روز شام کو شاید مِل یا کارخانے بند ہونے پر یہاں ساحل سمندر پر آ کر اکٹھا ہوتے اور نہایت پھوہڑ پن آمیزی سے پرامڈ (PYRAMID) بناتے، رکاوٹیں رکھ کر لمبی چھلانگیں لگاتے اور دوسرے کھیل کھیلتے۔ پروفیسر کانیکر نوعمری میں خود اپنے کالج کے جمناسٹک ٹیم کے چیمپین تھے۔ پیرالل بارز (PARALLE BARS) یا ہورزنٹل بارز (HORI - ZONTAL BARS) پر یوں قلابازیاں کھاتے، جیسے انھوں نے کڑی مشق سے وہ سب نہ سیکھا ہو، بلکہ پیدائش سے ہی ویسا کرتے آئے ہوں۔ رومن رِنگز (ROMAN RINGS) پر جھولتے ہوئے قلابازیاں لگا کر وہ رنگز پکڑ لیتے تھے۔ وہ ہارس ورک (HORSE WORK) میں ماہر تھے۔ لمبی چھلانگ میں ان کا ریکارڈ تھا۔ جب وہ اس کمرے میں آئے تھے تو چند دنوں تک روز شام کو کچھ لمحہ دروازہ کھول کر وہیں کھڑے کھڑے ان نوجوانوں کا کھیل دیکھا کرتے۔

لیکن اس وقت ان کی نظر زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکی۔ ساحل سمندر پر لڑکوں کے عین اوپر تصور ہی میں انھیں اس کی شبیہہ ٹیریس پر بیٹھی دکھائی دی۔ انھوں نے آنکھیں وہاں سے ہٹا لیں، قلم اٹھا لیا اور ذہن کو سب طرف سے ہٹا کر بظاہر نہایت یکسوئی سے پہلے کی طرح لکھنے لگے۔

لیکن اتنے انہماک سے وہ کیا لکھ رہے ہیں، انھیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے کان لگاتار باہر ٹیریس پر ہونے والی باتوں کی طرف لگے رہے۔ باتوں پر نہیں، صرف اس شہدیلی آواز اور بار بار اس کے گلے میں اٹھ کر مٹ جانے والی شیریں ہنسی کی طرف، کسی نازک سے فوارے میں سے رک رک کر آنے والی باریک سی پھوار جیسی وہ ہنسی بار بار ان کے وجود کو جیسے سرتاپا شرابور کر جاتی تھی۔ ..... جس لمحے اس نے ان کی طرف وہ غلط انداز نگاہ ڈالی تھی، پروفیسر کانیکر نے دیکھا تھا کہ آج اس نے سکرٹ نہیں پہنی، بلکہ گہرے نیلے رنگ کی ریشمی قمیص اور سفید کیمرک کی شلوار پہن رکھی ہے اور ہمیشہ اس کے کندھوں پر لہرانے والے وہ اس کے کٹے بال بوفے ہیر سٹائل، میں اس سر پر ڈمرو جیسے بجے ہیں۔ اس کافی اونچے اٹھے ہوئے جوڑے کی وجہ سے اس کی گوری گردن اور بھی لمبی لگتی تھی پروفیسر کانیکر کو لحظہ بھر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ مصر کی کوئی شہزادی پرانے زمانے کی تصویروں سے نکل کر ٹیریس پر آ بیٹھی ہے۔ ..... انھوں نے دائیں ہاتھ سے برابر قلم چلاتے ہوئے بائیں ہاتھ سے کھڑکی کا پٹ پورا کھول دیا اور میز پر سے شیشے کا پیپر ویٹ اٹھا کر کواڑ اور چوکھٹے کے درمیان رکھ دیا۔ .... ایسا کرتے ہوئے انھوں نے آنکھ نہیں اٹھائی اور پورے

انہماک سے لکھتے رہے۔

وہ برابر قلم چلاتے رہے۔ لیکن انھیں یہ احساس بنا رہا کہ وہ سامنے باہر ٹیریس پر بیٹھی ہے۔ جیسے کوئی آنکھ بھر کر بجلی کے بلب کو دیکھے اور پھر آنکھیں بند کرنے پر بھی اس کا خاکہ اسے دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح نگاہیں اٹھائے بغیر بھی اس کی شبیہہ برابر انھیں دکھائی دے رہی تھی۔

سر کو زور سے جھٹکا دے کر انھوں نے لکھی ہوئی سطریں پڑھیں، کاٹ دیں اور پھر دوبارہ انہماک سے لکھنے لگے۔

لیکن اتنے انہماک کے باوجود وہ کیا لکھ گئے۔ انھیں کچھ نہیں معلوم ہوا ان کے کان اسی آواز اور اسی ہنسی پر لگے تھے اور اس کی موجودگی گویا ان کے سارے احساس پر چھائی تھی۔

ہار کر انھوں نے ادھر نگاہ اٹھائی۔ کھڑکی کی چوکھٹے نے اسے عین درمیان سے کاٹ دیا تھا۔ اس کے جسم کا صرف آدھا حصہ انھیں دکھائی دے رہا تھا۔ جبھی ذرا سی بائیں طرف جھک کر اس نے وہی غلط انداز نگاہ ان پر ڈالی۔ پروفیسر کانیکر نے اچکچا کر آنکھیں جھکا لیں۔ اور مصروف ہوتے ہوئے میز سے اٹھے۔

پہلے ان کے دل میں آیا کہ دروازہ کھول کر کچھ لمحہ چوکھٹ میں جا کھڑے ہوں۔ ان کے دوست نے انھیں دروازہ کھول کر بیٹھنے سے منع کیا تھا کیوں کہ سمندر سے آنے والی سیلی، نمکین ہوا کا زور بائیں دیوار پر پڑتا تھا جس سے دیوار کے اس حصے کا ڈسٹمپر ماند پڑ رہا تھا۔ لیکن شام اس قدر حسین اور رنگین ہوتی تھی کہ کھڑکیوں سے سمندر کا پورا نظارہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے خواہ وہ دن بھر دروازہ بند رکھیں، لیکن شام کو عموماً اسے کھول دیتے تھے اور کام کرتے کرتے کچھ لمحے چوکھٹ میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ مگر اس وقت یہ احساس کہ سامنے وہ ٹیریس پر بیٹھی ہے ان کے راستے کی رکاوٹ بن گیا۔

انھیں یوں بے باکی سے اس کے سامنے جا کھڑے ہونے میں جھجک محسوس ہوئی وہ کچھ لمحہ کمرے میں ہی باہر کے دروازہ سے اندر کے دروازہ تک، چکر لگاتے رہے۔ بار بار ان کا دل دروازہ کھولنے کو ہوتا لیکن پھر دروازہ کھولنے کے بجائے وہ واپس چل پڑتے۔

آخر کار، گویا نہایت مجبور ہو کر، انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ان کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا کر گیا۔ لیکن باہر کی طرف ذرا بھی دیکھے بغیر وہ پلٹ آئے اور آ کر کوچ میں دھنس گئے۔ ٹانگیں انھوں نے پھیلا لیں۔ اور دونوں باہیں سر کے اوپر سے لے جا کر ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنساتے اور چٹخاتے ہوئے زور کی انگڑائی لی۔

لیکن وہ بیٹھے نہیں رہ سکے۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر اچھل کر اٹھے۔

اتنی عمر میں بھی ایک ہی جست میں وہ اٹھ سکتے ہیں، اس احساس سے ان کا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔
ان کی یہی چستی پھرتی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے پچاس سال کی عمر گذر جانے پر بھی 'ڈی فل' کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا کالج یونیورسٹی میں تبدیل ہونے جا رہا تھا اور ان کے پرنسپل نے انھیں رائے دی تھی کہ اگر وہ اس دوران میں کسی طرح ڈاکٹریٹ کر لیتے ہیں تو وہ ہی اپنے شعبہ کے صدر بن جائیں گے۔ ورنہ کوئی جونیر ان کے اوپر آ بیٹھے گا..... پروفیسر کانیتکر نے کبھی برسوں پہلے 'ڈی۔ فل' کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تھیسس کا مضمون بھی منظور کرا لیا تھا۔ لیکن ملازمت، بیوی بچوں نصاب کے بورڈ کی ممبری اور میٹنگوں نے انھیں وہ سب بھلا دیا تھا اب انھوں نے پرانے کاغذوں سے تھیسس کا خاکہ نکالا تھا اور ایک نوجوان کی سی تندہی کے ساتھ کمر کس اسے مکمل کرنے میں جٹ گئے تھے..... کولہاپور میں ضروری کتابیں اور دوسرے مسالے کی فراہمی مشکل تھی ان کے دوست نے ان کی یہ مشکل پوری کر دی تھی۔ جب وہ پچھلی بار کولہاپور گیا تھا اور پروفیسر کانیتکر نے اس کے سامنے اپنی مشکل رکھی تھی۔ تب اس نے دادر بیچ (DADAR BEACH) کے اپنے اس پرسکون اور تنہائی بھرے کمرے کا ذکر کیا تھا، جہاں وہ اپنے فلیٹ کے شور شرابے سے دور سمندر کی ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتا ہوا کام کیا کرتا تھا۔ اس کی فلم کمپنی دو مہینے کے لئے کشمیر کی شوٹنگ پر جا رہی تھی اور اس نے پروفیسر کانیتکر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ دو مہینے اس کے ہاں بمبئی میں قیام کریں کار اور ڈرائیور وہ ان کے لئے چھوڑ جائے گا وہ جس لائبریری میں جانا چاہیں گے ڈرائیور انھیں لے جائے گا۔ وہ کتابیں اکٹھی کر لیں اور کمرے میں چپ چاپ بیٹھ کر اپنا تھیسس مکمل کریں۔ کھانا انھیں ڈرائیور پہنچا دے گا اور چا شام کو وہیں کمرے میں بنا دیا کرے گا۔ انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ وہ بغیر کسی پریشانی کے پوری یکسوئی سے کام کر سکیں گے.....
اور پروفیسر کانیتکر چلے آئے تھے۔

●

پروفیسر کانیتکر پردے کے پیچھے گئے۔ وہاں چھوٹی الماری پر رکھے آئینے میں انھوں نے ایک نظر ڈالی صبح سے کام کرتے کرتے ان کے چہرے پر ہلکی سی تھکان کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ قلم کو اس الماری پر رکھا صابن دانی اور تولیہ اٹھا کر عقب کا دروازہ کھول، وہ باتھ روم گئے۔ واش بیسن میں منہ میں دھوتے ہوئے پروفیسر کانیتکر کی آنکھوں میں اپنے ساتھی پروفیسروں کی صورتیں گھوم گئیں۔ اور ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی پچاس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے موٹے مٹی، تھل تھل پل پل ہو گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا چھریرا پن برقرار رکھا تھا۔ فربہ تو وہ ضرور پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہو گئے تھے لیکن اب بھی وہ موٹے نہیں چھریرے ہی لگتے تھے اس کی اصل وجہ وہ ورزش تھی جو وہ برسوں سے باقاعدہ کرتے

آ رہے تھے۔ ادھر کچھ عرصے سے ان کی وہ عادت چھوٹ گئی تھی۔ ان کا جسم کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ لیکن ان کی چستی بدستور برقرار تھی، اور کام کرنے میں وہ نوجوانوں کو مات دیتے تھے۔
اچھی طرح رگڑ رگڑ کر تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے وہ کمرے میں واپس آئے۔ الماری پر رکھی شیشی میں سے ذرا سی وینشنگ کریم لے کر انھوں نے منہ پر ملی اور آئینے کے سامنے بال سنوارے —— گول چہرہ، گھنگھرالے کھچڑی بال، گہری احساس بھری آنکھیں، موٹے مردانہ ہونٹ —— اس چہرے پر ابھی کافی کشش باقی تھی ——
اس کمرے میں کام کرتے ہوئے انھیں مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ اس لڑکی نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ یہ اس کی آواز کی مٹھاس تھی یا ہنسی کا شہد، جس نے پہلی بار ان کا من موہ لیا تھا۔ اس کا تجزیہ انھوں نے نہیں کیا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ ایک شام وہ بہت مگن ہو کر اپنا کام کر رہے تھے کہ ان کی کھڑکی کے نیچے دو لڑکیاں آ کھڑی ہوئیں اور باتیں کرنے لگیں۔ ان میں سے ایک نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کام کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ دونوں لڑکیاں ٹیرس کے چکر لگاتی ہوئی بار بار کھڑکی کے پاس رک جاتی تھیں اور ہر بار ان کا دھیان بٹ جاتا تھا۔

یہ بلڈنگ، جس میں ان کے دوست نے وہ چھوٹا سا کمرہ لے رکھا تھا "سمندر ترنگ" کے نام سے مشہور تھی۔ پانچ منزلہ عمارت تھی۔ کیڈل روڈ پر اسپتال کے بالکل سامنے۔ سڑک سے داخل ہوں تو بمبئی کی ہزاروں عمارتوں ہی کی طرح دکھائی دیتی تھی —— سامنے احاطے میں نہ سڑک پکی تھی نہ فرش —— لیکن بلڈنگ کے اردگرد اور عقب میں بیس ایک فٹ چوڑی کشادہ جگہ تھی۔ جس میں کنکریٹ کی سلوں سے فرش بندھا تھا۔ بلڈنگ کی پچھلی طرف اس کی پوری لمبائی، تک ساحل کے برابر سیمنٹ کا جنگلہ تھا۔ جس کا اوپری حصہ چوڑا اور چمکیلا تھا۔ یہ ٹیرس یوں تو بلڈنگ کی طرف سے چار فٹ اونچی تھی لیکن سمندر کی طرف سے اس کی بلندی دس بارہ فٹ تھی۔ اس کے وسط میں ایک چھوٹا سا گیٹ تھا، جس سے ساحل پر اترا جا سکتا تھا۔ پروفیسر کانیتکر کے دوست کا کمرہ بلڈنگ کی بائیں طرف کے فلیٹ میں کونے کا کمرہ تھا جس کے دونوں طرف کھڑکیاں تھیں۔ چوں کہ کاریں وہاں نہیں آتی تھیں اس لئے شام کو بلڈنگ کے لڑکے لڑکیاں اور کبھی عورتیں وہاں ٹیرس کے ساتھ سیر کیا کرتی تھیں، کبھی اتر کر ساحل پر چلی جاتی تھیں اور کبھی ٹیرس پر آ کر بیٹھ جایا کرتی تھیں..... وہ لڑکی جب گھوم کر بائیں طرف سے آتی تو پروفیسر کانیتکر کے کان کھڑے ہو جاتے، پھر جتنی دیر تک اس کی باتوں یا ہنسی کی آواز آتی وہ اور کچھ نہ کر پاتے۔ اس کی ہنسی نہایت چھوٹی نہایت شیریں، نہایت دھیمی اور نہایت پرکشش تھی۔ ایک بار جو اس ہنسی نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ اسی کے ہو رہے۔ جتنی دیر وہ ان کی کھڑکی کے قریب کھڑی باتیں کرتی۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ان کی سماعت میں سما جاتیں۔ جب وہ چل دیتی تو کچھ لمحے انھیں اپنے شعور کو اپنے راستے میں لانے میں صرف

کرنے پڑتے۔ اپنے حواس کو درست کر، بڑی کوشش سے یکسو ہو کر وہ قلم چلانے لگتے۔ جبھی بائیں طرف سے وہی شہد بھری ہنسی پھر سنائی دیتی اور ان کا قلم وہیں رک جاتا..... جب وہ ان کی کھڑکی کے پاس آکر رکی تھی ان کے دل میں آیا تھا کہ باہر دروازہ کھول کر اسے ایک نظر دیکھ لیں لیکن انھیں جرأت نہیں ہوئی.....

جب باہر شام کافی گہری ہو گئی تو وہ اٹھے تھے۔ انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا تھا۔ ہوا کے زور سے وہ کھٹاک سے جا کر بائیں طرف دیوار سے نہ لگے اس لیے ہاتھ سے اسے تھامے تھامے انھوں نے بڑی احتیاط سے اسے بائیں دیوار سے لگا دیا تھا۔ پھر انھوں نے اس طرف نظر دوڑائی تھی، جہاں ان کی کھڑکی کے پاس دیوار کے سہارے دونوں لڑکیاں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ نیم تاریکی میں انھوں نے صرف یہی دیکھا کہ دونوں نے سکرٹ پہن رکھی ہے۔ ایک سترہ، اٹھارہ سال کی معلوم ہوتی تھی دوسری بارہ تیرہ سال کی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہیں جان سکے۔ نہ وہ ان کے چہرے پہچان سکے اور نہ وہ ان کے بلاؤزوں یا سکرٹوں کے رنگ۔ لمحہ بھر ان کی طرف نظر ڈال کر وہ سیڑھیاں اتر گئے اور ٹیرس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ لڑکیاں ان کے باہر آتے ہی کھسک گئیں۔ پل بھر پروفیسر کانیتکر جیسے سمندر کی تاریکی کو ہانپتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے لمبی سانس لی اور خراماں خراماں ٹیرس کے ساتھ گھومنے لگے۔ سامنے افق پر ابھی تک روشنی کی دو ایک دھندلی لکیریں پھیلی تھیں۔ جس کے نیچے دور سمندر میں کسی جہاز یا کشتی کی روشنی رہ رہ کر جھلملا جاتی تھی۔

ٹیرس کے ساتھ گھومتے ہوئے پروفیسر کانیتکر کبھی دکھن کی طرف دور دری پوائنٹ تک نیم دائرے میں چمکتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتے، کبھی مڑ کر شمال میں باندرہ کے ریلوے پل کی چمکتی بتیوں پر نظر جماتے۔ لیکن ان روشنیوں سے ہٹ کر ان کی نگاہیں بار بار بائیں طرف "سمندر ترنگ" کی سبھی کھڑکیوں کا جائزہ لے لیتیں کہ نہ جانے کس کھڑکی میں وہ آواز یا وہ ہنسی سنائی دے جائے۔

وہ دیر تک ٹیرس کے ساتھ گھومتے رہے تھے۔ ایک مرتبہ بغل کے فلیٹ میں، جس کے ڈرائنگ روم کا دروازہ پیچھے کو کھلتا تھا، سکرٹ والی ایک لڑکی کو دیکھا انھیں لگا تھا کہ وہی لڑکی ہے۔ وہ کئی بار اس فلیٹ کے سامنے سے گزرے تھے، اس لڑکی سے ان کی نگاہیں بھی چار ہوئیں اگرچہ وہ خوبصورت بھی تھی، انھیں لگا کہ وہ نہیں ہے، کیوں کہ ایک بار بھی تو وہ اس طرح سے نہیں ہنسی..... مایوس ہونے کے باوجود وہ دیر تک وہیں چکر لگاتے رہے تھے۔

لیکن ان دس پندرہ دنوں میں اگرچہ انھوں نے اس سے اچھی طرح آنکھیں نہیں ملائی تھیں، مگر وہ اسے پہچان گئے تھے۔ وہ اسی فلیٹ کے سندھی کرائے دار کی لڑکی تھی، جن سے ان کے دوست نے وہ کمرہ لے رکھا تھا۔ اس فلیٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا کمرہ تو ان کے دوست ہی کے پاس تھا۔ وہ سندھی

ادھر کے حصے میں رہتے تھے۔ جس کا دروازہ عمارت کے سامنے کی طرف تھا۔ وہ لڑکی شاید گھوم کر عقب میں آیا کرتی۔ تو کبھی ایک دو مرتبہ باتھ روم جاتے یا وہاں سے آتے ہوئے انھوں نے اسے اپنی ممی یا پاپا سے باتیں کرتے سنا تھا۔ وہ ہنسی بھی انھیں سنائی دی تھی اور ایک دو مرتبہ تو انھوں نے اسے، انھیں دنوں میٹرو میں لگی فلم کے گانے کے بول گنگناتے سنا تھا۔ وہ باتھ روم سے ہاتھ منھ دھو کر آئے تھے، دروازہ ذرا کھلا تھا کہ اس کی تان سنائی دی ــــ "آواز میں نہ دوں گی!" ــــ لوچ اور سوز بھری کھنکھناتی تان! کمبخت نے "دوں گا" کی جگہ "دوں گی" کر دیا تھا۔ گیلری میں یا ادھر کے کمرے میں اندر باہر جاتے ہوئے وہ ایک ہی لائن بار بار گائے جا رہی تھی ــــ "آواز میں نہ دوں گی" ــــ "آواز میں نہ دوں گی" ــــ پروفیسر کانیتکر کو لگا جیسے وہ انھیں سنا کر وہ مصرع دہرا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ عین کھڑکی کے سامنے ٹیرس سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور کسی نہ کسی سے باتیں کرتی ہوئی اپنی غلط انداز نگاہوں سے انھیں پریشان کیا کرتی۔

اور آج وہ شلوار قمیص پہن کر، ایسی لمبی گوری گردن تیکھے نکیلے چہرے اور اس ڈمروا ایسے جوڑے کے ساتھ مصر کی شہزادی بنی ان کے سامنے ٹیرس پر آکر بیٹھ گئی تھی.....

●

آئینے میں اپنے چہرے کی کشش کا جائزہ لیتے ہوئے اس سُریلی تان کا خیال آجانے سے انھوں نے دل ہی دل میں کہا " ہانکیں میچ دینار لاڑکے " ــــ " ہانکیں میچ دینار " ــــ یعنی آواز میں ہی دوں گا میری جان، آواز میں ہی دوں گا۔

اپنی اس شوخی سے دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے کے باوجود، وہی مصرع امنگ سے گنگناتے ہوئے انھوں نے کنگھی رکھ کر بالوں پر ہاتھ پھیرا..... ان کے سامنے اپنی جوانی کے دن گھوم گئے۔ ان کی شخصیت میں کیسی کشش تھی۔ کیسے نوجوان لڑکیاں ان کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں..... ایک کے بعد ایک متعدد چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ پھر ایک چہرہ ان کے ذہن میں نقش ہو گیا ــــ چہرہ جو ان کے گھر میں ان کی بیوی کی شکل میں آکر بس گیا تھا..... جس نے ان کے دل پر اپنی شخصیت کی ایسی چھاپ چھوڑی کہ دوسرے تمام چہروں کے نقش بھی وہاں باقی نہ رہے..... لیکن دوسرے لمحہ وہ چہرہ بھی ماند پڑ گیا اور ٹیرس پر بیٹھی اسی شہزادی نے اس کی جگہ لے لی۔

اس لڑکی نے، اس کی شہد بھری آواز نے، اس کی ہنسی نے انھیں ایک بار پھر نوجوان بنا دیا تھا۔ اس کی اس غلط انداز نگاہ نے نہ جانے ان کی رگوں کو کیسی چستی و توانائی عطا کر دی تھی کہ گذشتہ کئی دنوں سے وہ اپنے آپ کو یکسر بدلا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھیں یہ لگا کہ ان کے بال اب اتنے گھنے نہیں رہے، لیکن ان کے سر پر گنجے پن کو اپنا قبضہ جمانے میں ابھی برسوں درکار تھے۔ اطمینان سے مسکرا کر اپنی ٹائی کی ڈھیلی گرہ انھوں نے کسی قلم اٹھایا اور پھر کمرے میں گھومنے لگے۔

●

"ہانگ سیچ دینار لاڑکے، مانگ سیچ دینار!"

قلم ان کے دائیں ہاتھ میں تھا اس ہاتھ کی کلائی کو انھوں نے بائیں ہاتھ سے باندھ رکھا تھا اور دونوں ہاتھ ان کی کمر پر تھے کچھ جھکے ہوئے عجیب سی مسرت میں وہ کمرے میں گھومے اور دل ہی دل میں گنگنائے جا رہے تھے" ہانگ سیچ دینار لاڑکے، مانگ سیچ دینار.....!"

یہ جذبہ ان کے دل میں کچھ عجیب سی امنگ بھر رہا تھا کہ پچاسواں سال پورا کرنے پر بھی وہ ایک بالکل انجان خوبصورت لڑکی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں.....کالج میں ان کی طالبات کبھی ان کے قریب آ جاتی تھیں تو وہ بانہوں میں لے کر پیار بھی کر لیتے تھے، چوں کہ ادھر ان کی عمر بڑھ گئی تھی، وہ انھیں بڑے بھائی یا باپ جیسا سمجھتی تھیں، کچھ اور قریب آ جاتی تھیں، تو ان کی اپنی لڑکی کی طرح انھیں "آوا جی" "بھاؤجی" کہہ کر پکارنے لگتی تھیں اور وہ اپنے بڑھاپے سے تقریباً سمجھوتا کر چکے تھے۔ کبھی جب ان کی سانس پھولنے لگتی، کمر میں، انگلیوں کے پوروں میں گھٹنوں کے جوڑوں میں درد ہونے لگتا تو وہ ہنس کر اپنے بڑھاپے کو کوسا بھی کرتے.....لیکن اس لڑکی نے، اس کی ان نگاہوں نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ ان کی کشش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ آئینے میں انھوں نے دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک بھی جھری نہ تھی گلے پر گوشت ضرور کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور دو ایک جھریاں بن رہی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ٹائی کی گرہ کچھ زیادہ کس جانے کی وجہ سے وہ جھریاں بن گئی ہیں۔ پھر انھیں اپنے چہرے پر کچھ ایسی چمک دکھائی دی، جو کولہاپور کے گھٹے گھٹے بند ماحول میں کبھی دکھائی نہ دی تھی.....

اسی طرح دونوں ہاتھ کمر پر رکھے وہ کمرے میں چکر لگاتے رہے، وہ دروازے تک جاتے، لیکن بغیر نظر اٹھائے جیسے گہری فکر میں غلطاں وہاں سے واپس پلٹ آتے۔ ہر بار ان کے دل میں آتا کہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ لیکن وہ نگاہ نہ اٹھاتے۔ جب وہ تین چار چکر اسی طرح لگا چکے تو انھیں یقین ہو گیا کہ اب دروازے میں جا کر کچھ لمحہ کھڑے ہونا فطری معلوم ہوگا تو وہ دروازے میں جا کر مڑے نہیں اور چوکھٹ کے سہارے کھڑے ہو گئے اور فضا میں دیکھتے ہوئے قلم کے پچھلے سرے سے کنپٹی کو یوں سہلانے لگے جیسے کسی فکر میں محو ہوں۔

وہ اسی طرح پاؤں پر پاؤں رکھے انھیں ہلاتی ہوئی ٹیرس پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ بات کرنے والا شاید

نیچے ساحل پر اتر گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کی نظریں فضا میں بھٹکتی ہوئی اس کے پیروں پر جا ٹکیں۔ اس نے نائلن کی سفید چپل پہن رکھی تھی اس کی سفید جالی تو انھیں اتنی دور سے دکھائی نہ دے رہی تھی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چپل کا تلا ان گورے نازک پیروں سے جڑا ہوا ہے۔

کچھ لمحہ وہ اپنی نظر وہیں جمائے رہے تاکہ لگے وہ اس کے پیروں کو نہیں دیکھ رہے، اپنی سوچ میں غلطاں یوں ہی فضا میں نظر جمائے ہیں پھر کچھ جھجک کر ان کی نظر کیمرک کی سفید دودھیا شلوار اور گہری نیلی ریشمی قمیص پر سرکتی ہوئی اس کے چہرے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہاں رکی نہیں۔ وہ انھیں کی طرف گھور رہی تھی۔ ان کی نظریں اس کے ڈمرو جیسے جوڑے سے پھسلتی ہوئی مغرب کے افق پر جا ٹکیں۔

غروب ہوتے ہوئے آفتاب نے اپنی کرنیں سمیٹ لی تھیں افق پر جہاں سمندر اور آسمان ہم آغوش ہو رہے تھے، ہلکی سی دھند چھائی تھی، اور سورج کی بڑی سی سندوری تھالی اس کے اوپر معلق دکھائی دیتی تھی۔ لیکن وہ لمحہ بہ لمحہ غیر مرئی طور پر نیچے اتر رہی تھی۔ پروفیسر کانیٹکر کے دیکھتے دیکھتے وہ سنہری تھالی اس دھند میں اتری اور پچک کر بڑی سی نارنگی جیسی ہو گئی۔ اس نارنگی کا نچلا حصہ سمندر کی سطح کو چھو رہا تھا۔ وہیں سے اس کا عکس ایک سنہرے مینار سا جوار پر آئے سمندر کی لہروں پر لرزتا ہوا کنارے تک آ گیا تھا۔ پروفیسر کانیٹکر کی نگاہ ایک بار افق سے کنارے تک اور کنارے سے افق تک اسی کانپتے سنہرے مینار پر پھسلتی آئی اور لوٹ گئی۔ سورج کے ڈوبنے کے ساتھ ساتھ اس مینار کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔ اور لہروں کی سیاہی بڑھ رہی تھی.....دور افق پر پہلے ایک کشتی کے بادبان دکھائی دیئے، پھر دوسری کے پھر تیسری کے.....ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ بادبان پروفیسر کانیٹکر کو یادوں کے آسمان میں چمک اٹھنے والے مسرت آگیں خاکوں سے لگے.....دور جہاں باندرہ کی پہاڑی سمندر میں کافی آگے بڑھ آئی تھی، سمندر کی تہہ پایاب تھی۔ جوار کے پہلے ریلوں میں لگاتار وہاں جھاگ کی لکیریں بن مٹ رہی تھیں اور یہ جھاگ سمندر کی سطح پر کئی جگہ بگلوں کی قطاروں سی بڑھتی کنارے پر آ کر سفید سفید لکیر بناتی ہوئی مٹ جاتی تھی.....جوار ابھی ابھی شروع ہو رہا تھا۔ ہر لہر کے ریلے کے ساتھ ساحل کا کچھ اور زیادہ حصہ بھیگ جاتا، پروفیسر کانیٹکر کچھ لمحہ تک جوار کو بڑھتے دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے کنکھیوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

اس کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا۔ ادھر کو پیٹھ کئے وہ کنارے پر نگاہیں جمائے تھی۔ پہلے انھیں محسوس ہوا کہ شاید وہ شام کے وقت ساحل پر اکٹھا ہونے والوں میں سے کسی شناسا کو ڈھونڈ رہی ہے۔ مگر یہاں ساحل پر اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ دو فرلانگ آگے کیڈل کورٹ کے ساحل پر خوب رونق تھی۔ لیکن "سمندر ترنگ" کے سامنے ساحل پر بہت کم لوگ تھے، جو تھے وہ بھی آ جا رہے تھے۔ بھیل پوری والی

ایک ہتھ گاڑی کھڑی تھی، جہاں چار چھ لوگ بھیل پوڑی کھا رہے تھے۔ پروفیسر صاحب کو ساحل پر کوئی بھی ایسا چہرہ دکھائی نہیں دیا جو اس کی توجہ کا مرکز ہو سکے۔ آہستہ آہستہ وہ کمرے کی سیڑھی سے اترے اور اس لڑکی سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے ٹیریس پر جا کھڑے ہوئے۔ ان کے قدموں کی آواز کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اسی طرح اپنے خیال میں محو بیٹھی رہی۔ تب انھوں نے اس کی نگاہوں کا پیچھا کیا۔ انھیں پتہ چل گیا۔ وہ نہایت انہماک سے مزدور نوجوانوں کا کھیل دیکھ رہی تھی۔

لمحہ بھر وہ بھی ان لڑکوں کا کھیل دیکھنے لگے۔ ان لوگوں نے ایک نیا کھیل شروع کیا تھا۔ دو لڑکے نم ساحل سے کچھ ہی ادھر ریت پر چت لیٹ گئے۔ ایک جو لمبے قد کا تھا، ٹیریس کے پاس آ کر وہاں سے بھاگا لیٹے ہوئے لڑکے کے پاس آ کر اور ایسے اچک کر کہ اس کے ہاتھ بمشکل تمام زمین کو چھو پائے، اس نے قلابازی لگائی اور ان لیٹے ہوئے لڑکوں کے پار دھم سے گیلی ریت پر جا گرا۔

'غلط!' پروفیسر صاحب نے دل ہی دل میں کہا 'اسے قلابازی لگا کر یکدم سیدھے کھڑا رہنا چاہئے یوں دھم سے نہیں گرنا چاہئے!' اور انھیں خواہش ہوئی جا کر اسے ٹھیک سے قلابازی لگانا سکھائیں....

دوسری بار اس نوجوان نے تین لڑکوں کو لیٹنے کو کہا، تیسری بار چار کو.....

پروفیسر صاحب ذرا سا کھانسے لیکن ان کے وجود سے بالکل بے خبر وہ لڑکی نہایت غور سے ان لڑکوں کا کھیل دیکھ رہی تھی..... تب جانے انھیں کیا ہوا، وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے اور کچھ آگے جا کر انھوں نے بائیں ہاتھ کو ذرا سا ٹیریس پر رکھا، کسی نوجوان جمناسٹ کی طرح اس کے اوپر سے صاف کود گئے اور بارہ فٹ نیچے ریت پر سیدھے پاؤں کے بل جا کھڑے ہو گئے۔ اتنی بلندی سے کودنے پر ان کے گھٹنے ذرا جھکے۔ انھیں لگا کہ لڑکھڑا کر گر جائیں گے، لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ سنبھل کر سیدھے کھڑے ہو گئے اس طرح دوڑنے اور اتنی بلندی سے کودنے کی وجہ سے ان کی سانس پھول گئی تھی۔ خون کا دوران ان کے سر کی طرف بڑھا اور لمحہ بھر انھیں لگا کہ وہ چکر کھا کر گر جائیں گے۔ لیکن اپنی پوری قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے وہ کچھ لمحہ اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔ ان کی سانس درست ہوئی تو ان کے جی میں آیا اور پر نگاہ ہیں دوڑائیں۔ مگر اپنی خواہش کو انھوں نے قابو میں رکھا اور آہستہ آہستہ ان لڑکوں کی جانب بڑھ چلے۔

وہ لڑکے اپنا کھیل چھوڑ کر انھیں کی طرف دیکھ رہے تھے جس صفائی سے پروفیسر کاینکر کودے تھے، ظاہر ہے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ اسی لئے جب وہاں پہنچ کر پروفیسر صاحب نے کہا کہ وہ انھیں ٹھیک سے قلابازی لگانا سکھاتے ہیں تو وہ تیار ہو گئے۔

قلم ابھی تک پروفیسر صاحب کے ہاتھ ہی میں تھا۔ انھوں نے بڑے لڑکے کے ہاتھ میں تھمایا،

ان چار لڑکوں کو اسی طرح لیٹنے کو کہا، جوتے اور موزے اتارے، پتلون کی مہری کو موڑ کر کچھ چڑھا لیا اور آرام سے نیچے کو نظر جھکائے ٹیریس تک گئے۔ وہاں سے مڑ کر وہ بھاگتے ہوئے آئے اور دوسرے لمحہ قلابازی لگا کر چاروں لڑکوں کے پار، ریت پر پیروں کے بل جا کھڑے ہوئے۔ لمحہ بھر کو انھیں محسوس ہوا کہ پیچھے گر جائیں گے مگر دوسرے پل وہ سنبھل گئے۔

وہ مزدور لڑکا قلابازی لگاتا تھا تو دھم سے چوتڑوں کے بل ریت پر جا گرتا تھا۔ لیکن پروفیسر صاحب کے گھٹنے بھی نہیں جھکے۔ وہ ایک دم سیدھے کھڑے رہے۔ ہلکا سا چکر انھیں ضرور آیا، کمر میں بھی انھیں اکڑاؤ محسوس ہوا۔ لیکن اس عمر میں اپنی اس کامیابی پر انھیں فخر بھی کم نہیں ہوا۔ اسی لمحہ انھوں نے مڑ کر ٹیریس کی طرف دیکھا۔ انھیں لگا کہ لڑکی ایک ٹک انھیں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کی نظروں کے لمس سے ہی ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور انتہائی مسرت کی وجہ سے ان کے جسم کا لہو ان کے دماغ کی طرف دوڑ چلا۔ لگ بھگ نشے میں، وہ لیٹے ہوئے لڑکوں کے اوپر سے گھوم کر واپس آئے اور انھوں نے باقی دو لڑکوں کو بھی وہاں جا کر لیٹنے کا حکم دیا۔

دونوں لڑکے (وہ بھی جو خود قلابازی لگا رہا تھا) وہاں اوروں کے ساتھ جا کر لیٹ گئے۔

تب پروفیسر کاینکر بڑے غرور سے چلتے، ریت پر ایڑیوں کا دباؤ دیتے، لگ بھگ جھومتے ہوئے ٹیریس تک آئے۔ بجلی کی سی رفتار سے مڑے اور گولی کی طرح بھاگتے آئے اور لیٹے ہوئے لڑکوں کے پاس آ کر کودے.... لیکن تبھی نہ جانے کیا ہوا، قلابازی ان سے نہیں لگی۔ وہ سیدھے لڑکوں کے پار جا کر سر کے بل گرے۔ ان کی گردن ٹیڑھی ہو گئی اور ان کے جسم کا نصف حصہ بے جان سا چت لڑکوں پر جا گرا۔

نارنگی سمندر میں یکسر ڈوب گئی تھی۔ افق میں سمندر کی سطح پر ایک ذرا سا سنہرا تل دکھائی دے رہا تھا۔

"سمندر ترنگ" کی کسی اوپری منزل سے کوئی لڑکا سمندر کے ساحل پر بھیڑ جمع ہوتی دیکھ کر بھاگتا آیا اور عقب میں آ کر اس نے ٹیریس پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے پوچھا "واٹ ہیپنڈ؟"[1] (WHAT HAPPENED)

"دیٹ سلی اولڈ مین" لڑکی نے پروفیسر کاینکر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہیز بروکن ہز نیک اوور دیر۔"[2] (THAT SILLY OLD MAN HAS BROKEN HIS NECK OVER THERE)

---

[1] کیا ہوا؟

[2] وہ بے وقوف بڈھا۔ اس نے وہاں اپنی گردن تڑوا لی ہے۔

لڑکا بھاگتا ہوا ساحل پر آ رگیا۔ لڑکی نہایت بے نیازی سے وہیں ٹیریس پر بیٹھی ہوئی پاؤں جھلاتی رہی۔ افق میں گہرا سندوری الاؤ جل اٹھا۔ جس کی لپٹیں آہستہ آہستہ مغربی سمت پر چھا گئیں۔

اچانک سمندر کی سطح پر لہریں روپہلی ہو گئیں اور جو کشتیاں پہلے دکھائی نہیں دیتی تھیں ان کے خاکے نظر آنے لگے۔ لڑکی نے بھیڑ سے نگاہیں ہٹالیں اور سمندر کے بیچ ایک کشتی پر کھڑے ملاحوں کے سلہوٹ دیکھنے لگی، جو سمندر کی روپہلی لہروں پر گویا منقوش دکھائی دے رہے تھے۔ ٹیریس پر بیٹھی ہوئی وہ لڑکی بھی شام کے وسیع کینوس پر انھیں کی طرح تصویری نقش دکھائی دے رہی تھی —— اسی شام ہی کی طرح بے نیاز اور بے پروا۔ ☐

دیوندر ستیارتھی

رفوگر

(۱)

آسمان جیسے پھٹے پشمینے کا شامیانہ۔

نیل گگن پہ دودھیا میگھ، جیسے مدھوبن میں مست ہاتھی۔ ہندوستان کی قسم۔ کارواں سرائے سلامت یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل!

ترکی والا سفید گھوڑے پر کالا شہسوار۔

ترکی بی —— پہلے دیگیری بلاؤں پھر مالکوس۔

دوکان کی اونچی سیڑھیاں چڑھ کے آئی آئینہ خانم اور رفوگر سے بولی:

"پہلے میری شال رفو کیجئے۔ پیشگی مزدوری۔"

پانچ کا نوٹ دے کر وہ چلی گئی۔

جس کی چاہو سوگندھ لے لو۔ کوئی رائے قائم کرنی مشکل۔

دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔

برگد کی آنکھ میں ابابیل کا گھونسلا، جہاں سورج کی پہلی کرن داخل ہوتی۔

برگد تلے ننگی بھکارن بڑبڑاتی:

"کچھ نہ کہو لوگو: میرے علی کر کچھ نہ کہو۔"

کارواں سرائے اپنی خبر رکھتی ہے۔ محبوب کی سرگوشی ہو یا ماں کی لوری۔

جن کے قدموں کے نشان مٹ گئے، ہم ان کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔

رفوگر علی جو امام کی گنبد والی دوکان۔ اونچی سیڑھیاں، تین کھڑکیاں۔

دوستانہ جذبے سے چمکتی آنکھیں۔ جگ درشن کا میلہ۔ کون گرو کون چیلا:

ترکی والا اپنی دھن الاپتا رہا۔

وہی کارواں سرائے، وہی بیگم بازار، وہی دوڑتی نظریں۔ اور وہی گم ہوتی پرچھائیاں۔ سب کی توجہ کا مرکز

علی لجو امام۔

یہ علی جو تو ہوا، یہ علی لجو امام کیا ہوا؟

پیر باورچی بھشتی خر:

ہرفن مولا۔

کوئی اسے علی کہتا، کوئی امام۔ کوئی استاد۔

اس کے ہاتھ دعا کے لیے اوپر اٹھ گئے۔

یا پیرِ دست گیر، روشن ضمیرا

سامنے دیوار پر کالا ریشم، سنہرے حروف، فاختئی بوکھٹے میں جڑا شاعر کا کلام

رسم الخط کو سلام:

ڈھوتے ڈھوتے پربت غم کا، پاؤں میں پڑ گئے چھالے
بین کرے دیوانی پچھوا، رو دیئے ماتم والے
انھوں نی کا چاک گریباں، کون رفو کر پائے
بول سپیرے! تم نے اب کے، کتنے پھنئیر پالے

بغل والی دیوار پر لال صوفی کے ساتھ رفوگر کی تصویر۔ دونوں کی ہنسی ہم آغوش۔ بیس برسوں پہلے کی یادگار۔

لال صوفی ہوتا تو یہیں سے شروع کرتا اپنا سفرنامہ:

میخانوں کا عام رویہ، دھینگا مشتی تا تا تھیا:

سدھی کا چمتکار

من کے آر پار

مزارِ گل شہید پر قوالی کی رات۔

آتے جاتے لوگ۔ کارواں سرائے خوش: محفل میں چہل پہل۔

کہانی کا کیا کمال: سپنا نہیں اگیا بیتال۔

رفوگر کی ننھی منی نواسی جگنی اپنی گڑیا سے کھیلتے ہوئے گیت کا بول اچھالتی:

جاگ اری جنت کی گڑیا — جاگ اری جنت کی چڑیا
کھالے یہ پنج میل مٹھائی — اوری گڑیا! اوری چڑیا

لال صوفی ہوتا تو جگنی کے ساتھ سر میں سر ملا کر گاتا۔

پنالال کی تان یہیں ٹوٹتی کہ سب کتے کاشی گئے تو ہنڈیا کس نے چاٹی!

لال صوفی کو اولاد احمد اور وارث معصوم کا سلام۔ اس کا ایک اور نام گل شہید۔

خلیل اور رحمان نے یہ کہہ کر دم لیا کہ لال صوفی تو جوانی میں بڑھاپے کا مزہ لیتا رہا۔

"اللہ میگھ دے رے اللہ میگھ دے!" گنگناتے ہوئے اولاد احمد رفوگر کی دوکان میں آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

چنچل سنگھ اور پنالال کا وہی مذاق کہ آرہی ہے چائے دار جلنگ سے:

آچاریہ مہادیو "دس آئے دس گئے!" کہتے ہوئے کتاب محل کی طرف چل دیئے۔

گل آئینہ خانم کی موڑ پر بوڑھا برگد، رفوگر کا پڑوسی۔ امیر خسرو کی کہہ مکرنی۔

استاد سے پوچھا "آپ کی عمر؟"

بولے "برگد سے پوچھ لو۔"

برگد کی داڑھی ہنسنے لگی۔ جیسے ہوا کہہ رہی ہو کہ بوڑھا برگد سب جانتا ہے۔

جگنی سے پوچھا "تمھاری عمر؟"

"میری گڑیا سے پوچھ لو۔" وہ ہنس پڑی۔

آگے چلتے ہیں، پیچھے کی خبر نہیں... کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسہ میرے آگے...

جو سب سے پیچھے رہنا چاہتا ہے، اسی کو سب سے آگے بڑھاتی ہے کارواں سرائے۔ ایک ہی داؤ میں پاسہ پلٹ سکتا ہو۔

وہ خود ستائی کبھی نہ کرتا۔ گاہک سے یہی کہتا "شاید میرا کام آپ کو پسند نہ آسکے!"

اگر کسی کو اس کا کام پسند نہ آتا تو وہ جھگڑے میں پڑنے کی بجائے صاف صاف کہہ دیتا "آپ کچھ بھی نہ دیجیے اور رفو کی ہوئی اپنی اچکن لیتے جایئے۔"

پنالال جگنی کو چڑیا کہہ کر چھیڑتا تو وہ کہتی:

"وہ چڑیا جاپان گئی!"

رفوگر کے ابا دست گیر کی موت پر چنچل سنگھ افسوس کرتے ہوئے کہتا:

"آگے مرنا پیچھے مرنا، پھر مرنے سے کیا ڈرنا!"

کسی کے ہاتھ میں کئی تہوں میں لپٹا ہوا کاغذ۔

کسی کی بات چاکلیٹ اور بسکٹ کے بیچ۔
کسی کی نظر ایک کونے میں پڑی جگنی کی لٹکنے والی گڑیا پر۔
پتھر کی دیوار پر رنگ برنگے پوسٹر:
"سچ کو سولی۔۔"
"آنکھ کا پانی مر گیا۔۔"
"ڈھائی دن کی بادشاہی۔۔"
"پاؤں میں سنیچر۔۔"
"سفرنامہ ابنِ بطوطہ۔۔"
"چوڑیاں پہن لو۔۔"
"سفید گھوڑے پر کالا شہسوار۔۔"

امرت گیسٹ ہاؤس کے آگے مغل اعظم ہوٹل۔ اور بیگم پل سے آگے ترکمان دروازہ۔
بھول بھلیاں اور بارہ دری کے بیچ کتاب محل۔
بک لینڈ پریس کی بغل میں لبرٹی کینٹین۔
کہیں اوور کوٹ، کہیں نیچا نگر۔
کہیں اُستاد ڈی لکس ہوٹل، کہیں مٹیا محل۔
کارواں سرائے کا نام بدل کر پانڈولیبی رکھ دیا۔
یہ اور بات ہے کہ لوگوں کی زبان سے کارواں سرائے نہیں اترتی۔

واہ ری کارواں سرائے:
ندیا میں مچھلی جال
بھکارن پھٹے حال
نام بن پھول بائی۔

اس کی ہتھیلی پر پانچ پیسے کا سکہ رکھنا نہ بھولتا علی محمد امام۔ اور وہ ہتھیلی میں گدگدی ہونے لگتی۔
کل کی رنگی آج کی بھکارن۔ سونے چاندی کے سکوں کی کھنک اس کے پاؤں چومتی تھی۔
پانچ پیسے کا سکہ لیتے وقت آج اس کی آنکھیں پاؤں کی طرف جھک جاتیں۔
کون سی داستان سنو گے؟ کچھ سنائیں گے، ذرا اور قریب آجاؤ۔

دو بہنوں کی ایک کہانی
ماں کی لوری ایک نشانی
جو گزرو گے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے، پرانا ایک مندر ہے
"عمر بھر کون محوِ رقص رہا؟" رفوگر نے رفو کرتے ہوئے پوچھا۔
نغمے کی سوغات۔ قوالی کی رات۔ صبح گئے، سلامت آئے۔
شکُنتلا کے روپ میں کس یگ کی رچنا آگے آئی؟
ننھی منی جگنی اور اس کی بڑی بہن نسیم۔
"تو نسیم کی بہن ہے جگنی؟" پنا لال نے پوچھا۔
"نہیں نسیم میری بہن ہے۔" وہ ہنس پڑی۔
کہاں تک چپ رہیں، جب سر سے اوپر ہو گیا پانی!
آچاریہ مہادیو یہ کہتے ہوئے عمل میں آئے کہ سو سنار کی، ایک لوہار کی:
"سونے سے مہنگی گھڑائی!" وارث معصوم نے تھاپ لگائی۔
"رام دہائی! رام دہائی!" سب کی ملی جلی آواز۔
"وہ اپنا دامن چھڑا کر چلی گئی۔ کام روپ کے پاس جا کر رکیں گے اس کے قدم۔" اولاد احمد نے کہا۔ اشارہ بن پھول بائی کی طرف۔

براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو — ہرن کے سینگ پر عاشقوں کی برات۔
کچھ اور پوچھیے، یہ حقیقت نہ پوچھیے!
پھولوں جیسے بازو، تھکن سے چور!
اپنی گڑیا کا بیاہ رچائی جگنی گاتی رہی:

دھوئیں دھوئیں! تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

بن پھول کو دیکھ کر رفوگر بادشاہ بن جاتا۔ گویا اس کے ہاتھوں میں اشرفیاں کھنکنے لگتیں۔

تیس دن، چالیس میلے
میلے میں سب لوگ اکیلے
ہم کہاں سب سے الگ؟

آج پردیا چلی کچھوا کے بعد!

مرنے والے کی نہیں، جینے والے کی موت ہے!

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!

"میں تو بن پھول کو چتر لیکھا سے کم نہیں مانتا۔" پنا لال کا اعلان۔

وہ سوچتا ایک دن بن پھول سڑک پر چلتے چلتے ڈھیر ہو جائے گی۔ اور اس کی ارتھی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بھیڑ کندھے بدلتی رہے گی۔

کارواں سرائے کا یہی احساس کہ علی جو امام جس کا بھی کام کرتا ہے، بڑی ایمانداری سے اور دن رات ایک کر کے۔

وہ تو گاہک کو اَن داتا مانتا تھا۔

اس کی نظر پرندوں کے اسپتال پر، جس کا سنگِ بنیاد لال صوفی نے رکھا تھا۔

چنچل سنگھ بات کو گھیر گھار کر لاہور تک لے آیا:

"لاہور شہر،

گربانی کا شبد — جانے کون سا اشارہ۔

"یہیں رہنا ہے، جب تک سوئی دھاگے کا ساتھ ہے۔" رفوگر کا اپنا انداز۔

"تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا!" اولاد احمد نے اپنی کتاب کا حوالہ دیا۔

"سو سال جئیں، سو سال دیکھیں۔" آچاریہ مہادیو کی تان یہیں ٹوٹتی کہ مندر میں دیوتا جاگے۔

چنچل سنگھ یہ کہہ کر دم لیتا کہ وہ پانی ملتان رہ گیا!

اولاد احمد کے زورِ قلم کا نتیجہ "ادھورا آدمی، آدھی کتاب۔"

پنا لال کا قد — سوا تین فٹ مگر اس کا یہی دعویٰ:

"میں لنکا سے آیا!"

جیسے وہ اپنے آپ کو باون گزا مانتا ہو۔

گلی آئینہ خانم کی شان — ڈگرے کی زیارت، سب پر مہربان۔

گڑیا سے باتیں کرتے کرتے جگنی بول اٹھی:

"اللہ اللہ لوریاں، دودھ بھری کٹوریاں!"

راگ راگنی ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔

"پاؤں تلے پرکھوں کی ہڈیاں۔" آچاریہ مہادیو گیان بگھارتے۔

سر کٹے دھڑ کو دفنا کر مزار گل شہید کا نام دیا گیا۔

لال صوفی کا ایک اور نام — گل شہید۔

اولاد احمد کی کتاب کا انتساب — گل شہید کے نام۔

"لوگوں کے دماغ بھی رفو ہونے چاہئیں!" رفوگر مسکرایا۔

آنکھ کی پتلی — پتلی بائی!.. کارِ جہاں دراز ہے!

موتی جھیل غائب — اب وہاں چتر لیکھا کالونی کی چہل پہل۔

گاندھی گارڈن — کمپنی باغ کا نیا نام۔

کبھی آواز کا چہرہ، کبھی پہچان چہرے کی!

خوشبو سے کہو یہ کہ ہماری طرف آئے!

بھُس میں آگ لگا کے جمالو دور کھڑی!

"کہیں بھی آگ لگے، بیچاری جمالو بدنام۔

آسام سے آیا کام روپ، جسے بن پھول نے الکھ نرنجن مان لیا۔

پیروں میں گھنگھرو باندھے، وہ اس کے آگے ناچتی رہتی۔

پاگل بھکارن کی اور بات، جو سڑک پر کھڑی آنے جانے والوں کو دعائیں دیتی رہتی۔

کام روپ کو دیکھ کر آسام سامنے آ جاتا۔

اوور کوٹ — سرگوشیاں ہی سرگوشیاں۔

بن پھول کے جوڑے پر گجرے کی خوشبو۔

گفتگو — گل شہید کے مزار تک۔

علی جو امام یہ بتانا نہ بھولتا کہ وہ سورج اگنے سے پہلے ہی پیدا ہوا اور اسی روز اس کوٹھری میں ابابیل کا بچہ انڈے سے باہر نکلا۔

آچاریہ مہادیو جب کبھی "کشمیری بے پیری!" کہہ کر چھیڑتے تو رفوگر کہتا:

"مہاراج! میں تو آپ کو بھی بے پیر مانتا ہوں۔"

وقت کا احساس جیسے جنگلی کبوتر کی اڑان۔ اڑتا ہی جائے بس اڑتا ہی جائے!

دنگے فساد شروع ہو گئے تو کام روپ مارا جائے گا۔ اور اسے الکھ نرنجن مان کر پیروں میں

گھنگھرو باندھے اُس کے آگے ناچنے والی بن پھول کی جھنکار بھی ختم ہو جائے گی۔

کبھی میوزک کانفرنس، کبھی کتابوں کی نمائش، کبھی آل انڈیا مشاعرہ۔

ہیرا لال کا بیٹا موتی لال اور موتی لال کا بیٹا پنّا لال۔ تینوں بونے۔ مگر نفرت کے خلاف جہاد، ان کا ایمان: جیسے بسم اللہ خاں کی شہنائی یا پنّا لال کا بانسری وادن۔

پٹھان کا پوت —— کبھی اولیا، کبھی بھوت۔

مغل کی اور بات۔

اب کیا شاہانہ آن بان!

تاتاری کا قصہ ختم!

لال صوفی — تاتاری سوداگر کے خاندان کی آخری کڑی۔

"برف کے پھول سے اٹھتا ہے دھواں دیر تلک!

رفوگر رفو کرتے کرتے گنگناتا رہا۔

اتہاس گوسوامی کا نام آتے ہی، مس فوک لور اور گل ہما کا نام آئے بغیر نہ رہتا۔

گل ہما یعنی برف کا پھول۔

اتہاس گوسوامی کی "نیل کنٹھی" میں لال صوفی کو شردھانجلی دی گئی۔

بہار آئی ہے جوبن پر ابھار آیا۔

پیچھے رہ گیا بھٹیاری کا رنگ محل۔

ناک کے سیدھ چلے جاؤ تو کتاب محل کا ریڈنگ روم۔

کبھی گری کا روناکہ چیل انڈا چھوڑے!

کبھی کڑاکے کی ٹھنڈ کہ بلبلیں مر گئیں اکڑ کے تمام!

(۲)

ایک روز اچاریہ مہادیو بس پر سوار ہونے سے پہلے نیند کی چودہ گولیاں کھا گئے اور بس سے اتر کر کارواں سرائے کے بارہ ٹوٹی چوک میں نیلا گنبد کے فٹ پاتھ پر گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔

کسی نے ٹیگور اسپتال کو فون کر دیا۔ اسپتال کی وین آئی اور اچاریہ مہادیو کو لے گئی۔

وہاں انھیں مردہ سمجھ کر مردہ گھر میں بھیج دیا گیا۔

اگلے روز ان کا پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔

صبح چار بجے آچاریہ مہادیو کو ہوش آیا تو اس کے ساتھ کئی مردے۔

اپنے آپ کو مردہ گھر میں پا کر ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا سکے۔

دروازہ کھلا تھا۔

وہ سرکتے سرکتے باہر اندھیرے میں جا پہنچے اور پہرے داروں سے بچتے بچاتے اسپتال کے احاطے سے باہر۔

کئی گھنٹے تک یہی احساس رہا کہ موت دبے پاؤں ان کا پیچھا کر رہی ہے۔

یہی خدشہ لگا رہا کہ کہیں سرکار اقدامِ خودکشی کے الزام میں نہ دھر پکڑے۔

پرانے دوستوں میں سے، جس سے بھی ملے، وہی انھیں بھوت سمجھ کر سہم گیا۔

علی جو امام نے اولاد احمد اور وارث معصوم کو ساتھ لے کر ٹیگور اسپتال سے پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ بارہ ٹوٹی چوک کے فٹ پاتھ سے لائی گئی لاوارث لاش کو سرکاری خرچ پر جلا دیا گیا۔

جب آچاریہ مہادیو اچانک یک ایبٹ پریس کے پروف ریڈر پنّا لال کے سامنے آئے تو وہ انھیں بھوت سمجھ کر اتنا خوفزدہ ہوا کہ تین دن تک اسپتال میں رہنا پڑا۔

"میں بیراگی بھیا انوراگی۔۔" جانے کس کس بات پر زور دیتے رہے آچاریہ مہادیو۔

چاند تاروں کے تلے، کون سا قصہ چلے!

ہماری پہچان —— رفوگر کی دوکان۔

بھاری ڈیل ڈول، لمبی داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں پر چشمہ۔ ہاتھ میں سوئی دھاگا۔

سگریٹ جلانے کے لئے ماچس نہیں، لائٹر —— گل ہما کی سوغات۔

"لونگ لو مس فوک لور! اور گل ہما زندہ باد!"

اولاد احمد نے تھاپ لگائی:

کبھی تو ہنسائے، کبھی یہ رلائے —— زندگی کیسی ہے پہیلی ہائے۔۔"

"ہم تو ہر آدمی کو اپنے سے آگے مانتے ہیں۔ اس کا پیار ہمیں ملے نہ ملے۔ وارث معصوم نے جیسے اندھیرے میں روشنی کی پگڈنڈی پر اتہاس گوسوامی کو چلتے دیکھا۔ دائیں مس فوک لور، بائیں گل ہما۔

اب کیا ہوگا، کیسے خبر! لوک یان کے لئے جینا اور مرنا اتہاس گوسوامی کا دھرم ایمان۔

"پیار کر کے بھلانا نہ آیا ہمیں۔۔" رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔

کتاب محل بڑھیا لائبریری ہے جیسے کسی مفلس نے پرانے خزانے کا پتہ چلا لیا۔

"یہ کون سی پستک تھی، جو تم پڑھ رہے تھے۔" پنالال نے چنچل سنگھ سے پوچھا۔

جتنی پرچھائیاں، اتنی سیڑھیاں —— ساتھ صدیوں پرانا ہے اپنا!

"دکھیا کیوں اتنا سنسار!" نظم بن پھول کا۔

اٹ پٹا سا بول "بگلا کہیں کا!"

اپنے دھاگے، سدا آگے۔ کہیں خیر مقدم، کہیں الوداع۔

سوئی ڈگر ہو یا ہو میلہ۔ تشریف لائیے حضور!

"رفوگر کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے میں جان ہو۔" رفوگر نے رفو کرتے کہا۔

"اب تو اپنے آپ پر آئے نہ وشواس۔" چنچل سنگھ بول اٹھا۔

بال بچے دار پنالال نئی دلہن بیاہ لایا۔

دلہن نے اسے نیا خطاب دے ڈالا:

"جیونٹیوں بھرا کباب!"

گفتگو ہوتی رہی گھنٹوں۔

چنچل سنگھ کو یہی بات ناگوار گزرتی کہ کوئی اسے ہوٹل مہاراجہ سمجھ کر ہی اس کا احترام کرے۔

ہم کنسٹرکٹ کے روئے جب لال صوفی کا دھڑ ملا، سر غائب۔

وارث معصوم گنگناتا رہا:

قصیدے سے نہ چلتا ہے، نہ یہ دوہے سے چلتا ہے،

حکومت کا ہے جتنا کام، سب لوہے سے چلتا ہے،

وہ کون تھا، جو مسکرا کے پاس سے گزر گیا؟

آچاریہ مہادیو نے جوگی بننے کا سپنا دیکھا۔

یوگ آشرم سے لگاؤ،

شادی سے دور۔

اس ہپی کا ناش ہو، جس کی دوستی کے کارن انھیں مینڈرکس کی لت پڑ گئی۔ مٹی میں مل گیا یوگ کا سپنا

ہاتھ میں اخبار کا سنڈے ایڈیشن۔

چرخے نے پنشن کیش کر دیا اخبار میں

قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

اب کس بات کا پردہ، جب نغمہ گونج اٹھا؟

"بارہ دری" نے سدھارتھ سنیما میں گولڈن جوبلی منائی۔

رفوگر کو کیا چاہئے؟ چاک گریباں یا پھٹا ہوا دامن۔

بلبلیں مرتی ہیں اپنی بات پر!

لال صوفی کے مزار پر پھول چڑھا کر چنچل سنگھ نے دعا مانگی۔

دولت خاں کی دولت کا کرشمہ کہئے یا جادو، جو سر چڑھ کے بولا۔

وہ تین بار لوک سبھا کا ممبر چنا گیا۔

یہ تہذیب کس نے سکھائی ہمیں؟

کون سے رسم الخط میں لکھتا رہا وارث معصوم؟

کالج کی کتاب پر مجگتی کا اتنا ہی اعتماد، جتنا گڑیا کے کھیل پر۔

دھک دھک دھک دل کی ڈفلی

ڈم ڈم ڈم ڈم ڈمرو بلے!

واہ رے اگیا بیتال!

سامنے اس موڑ پر پرندوں کا اسپتال۔

مرالوں سے چھن کر آتی دھوپ۔

سو کے قریب پرندے ہر ہفتے علاج کے لئے آتے۔ آشیاں سے دور، بڑھیا علاج۔

(۳)

کارواں سرائے گل ہما کی طرح اپنی ہی باہنوں میں سمٹ جاتی اور کبھی نفرت کی آندھی پر جھنجھلائی سی لگتی۔

پنالال استاد کے لئے چلم بھر لاتا۔

سوالوں کی راتیں، جوابوں کے دن۔

جب آچاریہ مہادیو اخبار پڑھ کر سناتے تو پنالال اور سادلا احمد انھیں مذاق کا نشانہ بنانا نہ بھولتے۔ ٹیگور

اسپتال میں ایک بار انھیں لاوارث لاش مان لیا تھا۔

دنگے فساد کی خبریں سنتے سنتے کبھی رفوگر کی سوئی سے دھاگا نکل جاتا، کبھی سوئی ہاتھ میں چبھ جاتی اور خون

کی بوند چھلک جاتی۔

بادلو! او بادلو! او بادلو

مر گیا طوطا ہمارا مر گیا!

علی جوا امام کو پسند کرنے والوں کے ڈھیر سارے نام۔

"دیکھ لیے جھوم گیا ندیا کا درپن!" بن پھول کا نغمہ۔

جانے کون کون سی یاد فضل کا دامن تھامتی رہی۔

چائے آئی اولاد احمد نے تھاپ لگائی:

چائے آئی چائے آئی
دگنے بھاؤ کی چائے آئی

(۴)

آچاریہ مہادیو نے لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور کش لے کر گنگناتے رہے:

"دوری نہ رہے کوئی، آج اتنے قریب آجاؤ!"

"چاندنی جب مل گئی، ہم چاندنی سو لیے۔۔" اولاد احمد کی تھاپ۔

ہم نے تو ہر طرح کے پھول ہار میں پرو لیے۔۔" وارث معصوم کی تان۔

قصہ پنالال کا۔

رفو کرتے کرتے علی جوا امام کو جانے کیا خیال آیا کہ اٹھ کر چلے گئے۔

جانے سے پہلے جیب سے نکال کر پچاس کا نوٹ چوکی پر رکھ دیا۔ شیشے کے پیپر ویٹ کے نیچے۔

اتنے میں پنالال آیا اور چپکے سے نوٹ اٹھا کر نو دو گیارہ۔

اولاد احمد نے اسے نوٹ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔

رفوگر واپس آیا تو اولاد احمد نے پنالال کی شکایت کی۔

"وہ نوٹ تو اسی کے لیے تھا۔" رفوگر مسکرایا۔

رحمان یہ خبر لایا کہ دولت خاں نے کام روپ اور بن پھول کے لیے دونوں وقت کھانے کا انتظام کر دیا سامانِ
ریستوران میں۔

ووٹ حاصل کرنے کا نیا ہتھکنڈا۔" وارث معصوم ہنس پڑا۔

"آن تصے کو پھپھوندی لگ گئی!....." اولاد احمد گنگناتے رہے۔

(۵)

قاتل بڑا بے رحم تھا، جولال صوفی کا سر کاٹ کرلے گیا اور دھڑ جھاڑیوں میں چھپا گیا۔

سوال پوچھو، جواب دیں گے۔

"قتل ناحق صوفی معصوم کا!" اولاد احمد کی تھاپ۔

ذرا سی بھول یہ رنگ لائی۔

اب کہاں وہ کتھا گھاٹ!

پرندوں کا اسپتال —— کارواں سرائے کی شان۔

اسپتال کی نئی عمارت پر دولت خاں نے دولت نچھاور کی۔

سدھارتھ سنیما کا مالک —— دولت خاں۔ بک لینڈ پریس کا بھی وہی پروپرائٹر۔

سنیما —— بیوی کے نام

پریس —— چھوٹے بھائی کے نام

اصل بنیاد تو عقیدت ہے۔۔ یہی ایمان کی حقیقت ہے۔

سدھارتھ سنیما میں نئی فلم" لوگ کہتے ہیں۔"

مر گئے، کھو گئے، جاتے رہے۔۔

اللہ اللہ لوریاں —— دودھ بھری کٹوریاں۔۔

رشوت کا ایک نام —— چاندی کی لگام۔

کارواں سرائے پر علی جوا امام کی چھاپ۔ اس کی دوکان کارواں سرائے کی پہچان

(۶)

پگلی بھکارن سوکھے پیڑ کے تنے پر پانی ڈالتی رہی۔

پیڑ پر نئے پتے آ گئے۔

خواب میں ہم اپنے ہی جنازے کے ساتھ چلتے رہے۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!

پنالال کے دماغ پر سوار —— بن پھول۔

وہ مدھومتی کے کنارے موجود رہتا، جب بن پھول مدھومتی سے نہا کر نکلتی۔

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

"میں نے پیروں میں گھنگھرو باندھے، جتنے کھرا تنے گھنگھرو بولیں۔" ناچنا شروع کرنے سے پہلے بن

پھول کا اپنے الکھ نرنجن سے یہی نویدن۔

دولت خاں، جو تھی بار لوک سبھا کا انتخاب جیت گیا۔

علی جو امام کی اور بات۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کا احترام
ہو مبارک اور علی جو او امام

سکھ دکھ رہتے جس میں مل کر، جھلمل بستی اس کا نام۔

لال صوفی کا سر کاٹ کرے گیا ہتیارا

آج تک اس کا پتہ نہ چل پایا۔

پرندوں کا اسپتال —— اس کی بھی یادگار۔ وہ جب تک زندہ رہا، پرندوں پر جان چھڑکتا رہا۔

مارا گیا لال صوفی —— جو نفرت کو اپنے خون سے تولتا رہا۔

مزار میں دفن —— سر کٹا لال صوفی۔

لوگوں کا گل شہید، جو زندگی بھر نفرت کے خلاف لڑتا رہا۔

لال صوفی کا مرثیہ —— اولاد احمد کی کتاب کا حرف آخر:

بانس کے پتے پر یہ شبنم   ماتم والے بولے کم کم
آنکھوں سے پلکوں کی باتیں   پھر ڈھو ڈھو روتے رہے ہم

آنسو کی کیا آب و تاب   کیسے پڑھتے رہے کتاب
یہ زندہ اور مردہ لوگ   آنسو میں موتی کی آب

کیسا پلٹا ہے یہ موسم   دم توڑے پتوں پر شبنم
وہی سوال اور وہی جواب   کہاں گیا وہ اپنا ہمدم

کھنڈر کے پیچھے چاندنی رات میں چمپئی کے منڈوے تلے سو رہی تھی بن پھول۔

اسے ناگ نے ڈس لیا۔

اس کی ارتھی کے ساتھ علی جو امام دوکان سے شمشان تک چونیاں اور اٹھنیاں نچھاور کرتا رہا۔

اب کہاں بن پھول کی جھنکار!

اولاد احمد کی زبان پر جاپان کا ایک ہائیکو:

بس ایک تتلی —— ننھی جان
مندر کے گھڑیال پر
بے خبر سوتی رہی!

کارواں سرائے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

بن پھول کے الکھ نرنجن کام روپ کی آتما بھی پنجرا خالی کر گئی۔

کارواں سرائے ارتھی کے ساتھ ساتھ۔

چھتیس گڑھ کے چودھری بھی شامل ہوئے

"رام رام ست ہے" کے ساتھ "اللہ ہو" کی آواز بھی بلند ہوتی رہی۔

چنچل سنگھ نے چندن کی چتا سجائی۔

آچاریہ مہادیو نے چتا کو آگ دکھائی

تیرہ دن تک کارواں سرائے کام روپ کا سوگ مناتی رہی —— چولہے آگ نہ گھڑے پانی۔

بچوں کا شور: دھوئیں دھوئیں تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

(۷)

آج مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔

اپنا لال صوفی —— کارواں سرائے کا گل شہید۔

یاد رہے گا اس کا نغمہ:

وہ ہندو ہوں کہ مسلم ایک ہی مٹی کے برتن ہیں
کوئی ہیں شیخ جی ان میں، کوئی ان میں برہمن ہیں

دائیں رحمان اور خلیل، بائیں اولاد احمد اور وارث معصوم۔

بیچ میں آچاریہ مہادیو۔

چپ کیوں ہو گئے؟ جواب دو۔

علی جو امام کیوں نہ آیا ہمارے ساتھ؟

رفوگر کی دوکان سے چل کر وہ بیگم پل سے گزرے۔ دائیں کھچڑی پور، بائیں چترلیکھا کالونی۔

بارہ دری سے ہو کر عید گاہ مارگ پر چلتے چلتے کتاب محل کو پیچھے چھوڑا۔

جھلمل بستی سے آگے مزار گل شہید۔

شیطان طوفان، اللہ نگہبان، ہم قربان!

ان کا یہی احساس کہ یہاں نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ نہ راجہ نہ بھکاری، نہ داتی اور داسی کے بیچ کوئی دیوار!

جہاں ڈر، وہیں ہمارا گھر!

اب وہ زمانہ کہاں کہ سونا اچھالتے جاؤ۔

اولاد احمد کی یہی شکایت کہ اتہاس گوسوامی تشریف نہ لائے۔

جھوٹی قسم کون کھائے:

وارث معصوم کہہ رہا تھا کہ گل ہما اور رس ٹوک لوری چلی آئیں۔

آچاریہ مہادیو بولے:

"اگر رس ٹوک لور کو بھی فرصت نہ تھی تو گل ہما ہی چلی آتی۔"

ہر طرف جنگل نظر آنے لگا

وصل ہو یا وصال ہو یارب!

ہم قربان!

سات قرآن درمیان!

سب نے نہا کر کپڑے بدلے!

قوالی کی رات!

سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی پہلی منزل ہے۔

اس وقت کی گردش یاد کرو، جب ساز ملائے جاتے ہیں!

وارث معصوم اور اولاد احمد یہ دیکھ کر جھوم اٹھے کہ اتہاس گوسوامی پہلے سے محفل میں موجود ہیں۔

مٹی میں گلاب کی سگندھ۔

آچاریہ مہادیو نے ہاتھ جوڑ کر اتہاس گوسوامی کو پرنام کیا۔

جانے کون سی ان بوجھی پہیلی بوجھی جا رہی تھی۔

اپنے تو ہیں سو سو یار دھنئے، جُنگر اور منہار

دل کی دنیا بہت اندھیری اندھیارے میں کاروبار

اچانک درگاہ کے اندر ایک آدمی آکر چلایا:

"فساد شروع ہو گیا!"

بکھرے بال، کندھے گھائل، سر لہولہان۔

چیختے چلاتے وہ گر پڑا۔

قوالی کی محفل درہم برہم۔

اب کیا ہوگا؟

خلیل اور رحمان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اولاد احمد اور وارث معصوم بولے:

"چلو آچاریہ مہادیو! اب بھاگ چلیں۔"

وہ چلتے رہے، گرتے پڑتے چلتے رہے۔

افراتفری، وحشت غم کا پہاڑ۔

بلند عمارتیں آگ کی نذر۔

گلیاں لہولہان۔

کالی سڑکیں سرخ ہو گئیں۔

راہیں لاشوں سے پٹ گئیں۔

اپنی ہی دوکان کی سیڑھیوں پہ مارا گیا علی جو امام۔

سفید گھوڑے کا کالا شہسوار

اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے ـــــ گھوڑے کی ایال پر!

آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، گرتے رہے!

مارا گیا علی جو امام:

ایک ہاتھ میں سوئی، دوسرے میں دھاگا!... .. □

قرۃ العین حیدر

دریں گرد سوارے باشد

۱۔ جو رہی سو بے خبری رہی

"ـــــ عالم جلیل و فاضل بے عدیل تھے۔ اپنے تمام بھائیوں میں افضل۔ گلاب کے پھول کی طرح حسین ـــــ"

نیم تاریک غلیظ گلیوں میں سے گذرتے ہوئے اچانک کسی ڈیوڑھی کے اندر کھلے تیز سرخ گلاب کی جھلک نظر آجاتی ہے، بہت عجیب لگتا ہے۔

"یہ قدیم دانشکدہ، یہ جزیرہ سخنوراں آشنا گندا ـــــ کیوں؟" سائیکل رکشا پر وسیع جھیل کے کنارے سے نکل کر بھول بھلیاں میڈیول گلیاں طے کرتے ہوئے میں نے اپنے کزن سے پوچھا جو اس مشہور و معروف قصبے کے ہر چوتھے شخص کی طرح اچھے خاصے شعر کہتا تھا۔

"ان گلیوں کی نالیوں کی نکاس ـــــ" اس نے سائیکل پر ساتھ ساتھ آتے ہوئے جواب دیا ـــــ "جن کھیتوں میں ہوتی تھی وہاں کارخانے بن گئے۔ پانی رک گیا۔ اب نکاس کا کوئی راستہ نہیں۔"

"راستہ بنایا نہیں جا سکتا ـــــ؟"

"کسی کو پرواہ نہیں۔ اور آبادی بڑھتی جا رہی ہے بے تحاشا۔"

کیا یوروپ کے شہروں میں آل موسٰی کے GHETTO اسی طرح بنے تھے؟

ایک تاریک پھاٹک کے سامنے ایک خستہ حال بوڑھا میلی چادر پر مونگ پھلیاں اور سستے بسکٹ چُنے سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر اچانک ماموں میاں کی سفید ڈیوڑھی اس کے اندر سے سرو و شمشاد کی جھلک گویا سمرقند یا طوس یا دسویں صدی عیسوی کے قرطبہ یا اٹھارویں صدی عیسوی کے مرشد آباد یا دلی کا جھپٹا۔ صدر دروازے پر غریب برقعہ پوش عورتیں اور ان کی گھر دھان۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹی۔ وی۔ فلم۔" شاعر کزن نے جواب دیا۔

اندر زنانے صحن میں ہینڈ پمپ پر ممانی جگر جگر کرتے جہازی لوٹے میں وضو کے لیے پانی بھر رہی تھیں گلاب کی کیاری کے نزدیک ریٹائرڈ ماہر تعلیم ماموں میاں آرام کرسی پر نیم دراز پیچوان کے کش لگانے میں مصروف ان کے ایک پروفیسر شاگرد جو ان سے ملنے کسی دوسرے شہر سے آئے تھے ایک مونڈھے پر مودب بیٹھے تھے۔

"اے بیٹا تم نے اپنے جدِ اعلیٰ زید شہید کی شمشیر کی زیارت اب تک نہ کی؟" ممانی نے دریافت کیا۔

"جناب زید شہید کی شمشیر یہاں کیسے پہنچی؟"

"لوگ اور ان کی چیزیں کہاں کہاں کیسے پہنچ جاتی ہیں۔" ماموں نے کہا۔

"اے بی سرو بیگم کی بھی کچھ خیر خبر ملتی ہے؟" ایک پڑوسن نے بلبل چشم کے تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ وہ بھی فلم دیکھنے آئی تھیں۔

"سرو باجی کا تو بیاہ ہو گیا کراچی میں کب کا۔"

"اے لو ـــــ کس سے؟"

"میر حسن لندنی کے پڑپوتے سے۔" میرے بجائے ماموں نے جواب دیا۔

میں نے کان کھڑے کیے۔

"اور نعمت خاں عالی کا اصل نام کیا تھا ـــــ؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"مرزا محمد ـــــ سنبھل کے رہنے والے تھے۔" انھوں نے جواب دیا۔ میں نے فوراً پرس سے نوٹ بک نکالی۔ "ان کے پڑپوتے سے سرو بیگم کی پھوپھی ممتاز بیگم بیاہی تھیں۔" ماموں نے اضافہ کیا۔ بطور فٹ نوٹ۔

"ایک آل انڈیا پڑپوتا ایسوسی ایشن بنایا چاہیے۔" شاعر کزن نے کہا۔

"مجھے ان دنوں میر قاسم کی بہت ٹوہ ہے۔" میں نے کہا۔

"فخر النساء بیگم ـــــ" ماموں پیچوان گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ "بنت سعادت علی خاں ـــــ غازی الدین حیدر کی سگی بہن ـــــ میر قاسم کے بیٹے نواب میر کلو سے بیاہی تھیں۔"

"اے ذرا کلو کو آواز دیجیو ـــــ چلتی ہو شمشیر کی زیارت کرنے؟" ممانی نے نماز کے لیے تخت پر بیٹھتے ہوئے دہرایا ـــــ "شبیز ـــــ کلو سے کنار کشائے آوے کل سویرے ـــــ"

"ہسٹری محض فاتح قوم کا پروپگنڈہ ہے ـــــ" ماموں نے اچانک کہا۔ "بقول شخصے خود عہد نامہ قدیم میں یہودیوں کا پروپگنڈہ ہے۔ کسی نے آج تک اشوریہ والوں کا پوائنٹ آف ویو معلوم نہ کیا۔"

"مجھے ظفر نامے کی بہت تلاش ہے تاکہ پلاسی اور بکسر کے متعلق اپنا پوائنٹ آف ویو معلوم ہو ـــــ یہ

کرم علی کون صاحب تھے؟ مظفر جنگ کے ملازم تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سراج الدولہ کے عتاب سے بچنے کے لئے پٹنہ چلا گیا تھا۔ جہاں مظفر نے اسے ملازم رکھا۔ انگریزوں نے جب مظفر جنگ کو نائب نظامت سے معزول کیا، کرم علی نے اپنے آقا کا غم غلط کرنے کے لئے مظفر نامہ لکھا۔"

"ہم ذرا غم غلط کرنے کے لئے ٹیلی ویژن اون کر آویں۔" شاعر کزن نے کہا اور اٹھ کر دیوان خانے کی سمت چلے گئے۔

"سید محمد رضا خاں مظفر جنگ مرشد قلی خاں کے زمانے میں دلی سے بنگال پہنچے تھے۔" ماموں نے پھر اچانک بات کی۔ دور دھوبنیں بے سُری آواز میں مسلسل گائے جا رہی تھیں۔ چھت پر کبوتر کابکوں میں واپس آ رہے تھے۔ سرو شمشاد شام کی ہوا میں سرسرائے۔ ہرجائی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھری۔ پالکام کے جنگلہ دار محمد رضا خاں۔ سمندر کنارے مدھو کا کھلی ہے۔

"محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔" دور سے ماموں کی آواز آئی۔

محمد شاہ پیا سدا رنگیلے۔ موسیقی کی پریاں گوڑ ملہار کے بادل بکھیر رہی تھیں۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں کی چلمن کے عقب سے وہ بانکے لوگ نکلے مرشد آباد جانے کے لئے بہار اسپ تیار ہے اور چوڈولہ۔

"اجی میں نے کہا رکشا ابھی لے آؤں ——— ؟" درمیانی ڈیوڑھی میں سے آواز آئی۔ چار خانہ تہمد، چگی داڑھی، سیاہ مخملیں ٹوپی، اچھی قمیص ایک بزرگ کانپتے کھانستے دروازے میں نمودار ہوئے۔

"کہئے نواب میر کلّو ———" شاعر کزن نے کہا جو دیوان خانے سے واپس آ چکے تھے۔ "مزاج عالی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ میاں۔"

"شکر ہے تو کھانس کیوں رہے ہو۔ علاج کرواؤ۔"

"علاج ———" وہ ہنسے۔ "میاں کی باتیں! بارہ آدمیوں کا ٹبر۔ آٹھ بچے۔ چار بیوہ لڑکی کے ———"

"ہاں۔ ہاں۔ روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ ———" شاعر کزن نے جماہی لے کر مجھے مخاطب کیا۔ "کلّو خاں مُرشد آباد کی باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ کیوں حضرت، ذرا اپنا مُظفر نامہ بٹیا کو سنائیے۔"

"بٹیا ہمارے پُرکھے مُرشد آباد والوں کے خانہ زاد غلام تھے۔ ہم اب رکشا چلاتے ہیں۔"

"بچپن میں یہاں آ گئے تھے۔ لب و لہجہ بھی یہیں کا ہو گیا ہے۔" شاعر کزن نے کہا۔ "اور اپنی ہسٹری بتاؤ ـــ"

"اجی ہماری کیا ہسٹری۔ وہ تو آپ لوگوں کی ہوتی ہے۔"

"تاریخ خدا کا VISION ہے۔" پروفیسر شاگرد نے خالباً کسی اور خیال میں محو اچانک ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔

"یہ خوب!" اگنوسٹک شاعر کزن نے تبسم کیا۔ کلّو خاں آرام کرسی کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

"خدا تاریخ کے ذریعے اپنا پلان ورک آؤٹ کرتا ہے ———" پروفیسر شاگرد نے کہا۔

"اچھا پلان ہے۔" شاعر کزن بولے۔

"یہ مابعد التواریخ ہے۔" پروفیسر شاگرد نے کہا۔

"سبحان اللہ! الفٹ ونگ شاعر کزن دبی زبان سے بولے۔

میں دوسرے صحن میں چکر لگا کر آئی۔ دیوان خانے میں ٹیلی ویژن اسکرین پر ہندوستانی ہیرو ہیروئن ایفل ٹاور کے اوپر کودنے، اچھلنے اور ڈوئیٹ گانے میں مصروف تھے اور آس پاس کے فرانسیسی بھونچکے سے ان کو تک رہے

"جو لاکھوں برس پہلے ڈینوسار تھے اب چھپکلی ہیں۔" ماموں نے کہا۔

"ارتقاء اب جاری کیوں نہیں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے کم از کم خچر گھوڑا بن جائے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی ہو رہا ہے۔" شاعر کزن بولے۔

"اب مظفر جنگ کر لو ———" ماموں نے بات شروع کی۔ "ارتقا کا الٹ ——— عروج سے زوال ———

"جی ہاں۔ مظفر جنگ کو لیجئے ———" میں نے کہا۔

ممانی نماز اور وظائف ختم کر کے نماز کے تخت سے اتریں۔

"اب آپ ممو جی باشی بن جائیے اور ہمارے لئے کافی بنائیے۔" ماموں نے فرمائش کی۔ اس وقت وہ استانبول کے میں تھے۔ پھر گویا ہوئے "پلاسی کے بعد فرنگیوں کو حکومت مل گئی تھی مگر ملک کے انتظام سے ناواقف تھے محمد رضا خاں کے تجربے کو دیکھتے ہوئے میر جعفر کے انتقال کے بعد بنگال کونسل نے ان کو نائب دیوان بنگال، بہار، اڑیسہ مقرر کیا۔ پچھتر ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ۔ اب وہ کمپنی کی طرف سے نائب دیوان اور نابالغ نواب نجم الدولہ کی طرف سے نائب ناظم تھے۔ مغل شہنشاہ نے ان کو بہار میں علاقہ ترہٹ کے اندر جاگیر دی تھی جو مظفر پور کہلائی۔ نواب مظفر جنگ خطاب ملا تھا۔ اٹھارہ لاکھ روپیہ جو کمپنی نظامت کے اخراجات کے لئے میر جعفر کو دیتی تھی۔ محمد رضا خاں کو دینے لگی۔ راجہ شتاب رائے ان کے نائب تھے۔

"لیکن جب عین نصف النہار پر گھپ اندھیرا چھا جائے ایسا محمد رضا خاں کے ساتھ ہوا۔ وارن ہیسٹنگز نے استمراری بندوبست شروع کر کے ایڈمنسٹریشن اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مظفر پور پر قبضہ کیا۔ سید محمد رضا خاں کی پنشن مقرر کر دی۔"

"کل بی بی کی صحنک ہے۔ بلاوا دینے آئی تھی۔" ایک محلے والی نے قریب آ کر ممانی کے کان میں کہا۔

ماموں نے سن لیا۔ بولے "نور جہاں بیگم نے اپنی سوت کو طعنہ دیا تھا۔ موئی بن کی پکڑی مارواڑن۔ اسے بھی دن لگے — اس مارواڑن نے بی بی کی صحنک شروع کرکے بدلہ لیا۔"

"انھی اپریل روپوں کے نتائج —" شاعر کزن نے بات ادھوری چھوڑی اور آسمان پر سے اترتے ہوئے کبوتروں کو دیکھنے لگے۔

"مظفر جنگ کی جیت پور والی چار ہزار بیگھہ زمین کی وجہ سے فورٹ ولیم کالج کے کاغذات میں اُن کو محض "نواب جیت پور" لکھا گیا۔ بعد میں اس کے باقی ماندہ حصے پر کسی مارواڑی نے جوٹ مل بنائی۔" ماموں نے کہا۔

"موئے بن کے پکڑے مارواڑی نے —" شاعر کزن نے اضافہ کیا۔

"مظفر جنگ نے انگریز کو معزول کیا اور ان کی زمین پر مارواڑی نے قبضہ کرکے جوٹ مل بنائی — یہ واقعہ بذاتِ خود ایک اہم علامت ہے۔" میں نے کہا۔ "انڈین سول سروس کے جان بیم نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ جنگ پلاسی محض ایک ہندوستانی صوبے پر ایک یوروپین تاجر کمپنی کی فتح نہیں تھی بلکہ ایک FOREIGN MOHAMME-DAN POWER پر ہندو دیشی تاجر اور برٹش مڈل کلاس طبقات کی مشترکہ فتح تھی۔ محمڈن حکومت کے زوال کا باعث اس کا اندرونی نفاق تھا۔ اور انگریز ہندو مرچنٹ کلاس سے گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ کارل مارکس نے یہی بات اس طرح لکھی کہ فیوڈل نظام پر نئی مرچنٹ سرمایہ داری کی فتح ہوئی۔"

"لیکن انگریز جو اپنی کتابوں میں مسلمانوں کو FOREIG POWER لکھ گیا اس بے ایمانی اور شرارت کا نتیجہ ہم آج تک یہاں بھگت رہے ہیں —" شاعر کزن بولے۔

مرزا ابو طالب اصفہانی — مجھے یاد آیا — مظفر جنگ کے وارڈ تھے۔ اسی خاندان کی ایک لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں مرزا صاحب لندن پہنچے وہاں ایک انگریز کے گھر میں انھوں نے نواب شیر جنگ کے لٹے ہوئے نوادرات اور کتب خانہ دیکھا — ۱۷۹۹ء — اسی سال کاویری کے کنارے ٹیپو گرا تھا۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن میں ٹیپو کا خود رکھا ہے۔ اس پر فارسی میں کندہ ہے۔ "یہ خود آبِ زمزم سے دھویا گیا ہے اس پر دشمن کا کوئی ہتھیار اثر نہ کرے گا۔"

ٹیلی وژن پر فلم میں ہندوستانی ہیرو ہیروئن اب ہائیڈ پارک لندن کے اندر دوڑتے بھاگتے ڈوئیٹ گا رہے تھے۔

"مرشد آباد پہنچ کر سراج الدولہ نے التجا کی تھی۔ مجھے گزارہ دے دو اور تھوڑی سی زمین پناہ کے لئے

اس کی لاش کو ہاتھی پر رکھ کر گشت کروایا گیا۔" میں نے بآوازِ بلند کہا۔ "جب ہاتھی اس کے محل کے سامنے سے گذرا اس کی والدہ روتی ہوئی محل سے نکلیں اور ہاتھی کے پاؤں سے لپٹ گئیں —"

"سراج الدولہ کی بڑی خالہ بڑی سیاست داں عورت تھیں۔ گھسیٹی بیگم — اپنے لڑکے شوکت جنگ کی جانشینی کے لیے کیا کیا جوڑ توڑ کئے —" ماموں نے اظہارِ خیال کیا۔

"جوڑ توڑ، سازشیں، تشدد۔" شاعر کزن بولے "بڑا تشدد تھا اس زمانے میں۔"

"آج نہیں ہے —؟" ماموں نے دریافت کیا۔

"نیچے کروڑں کیڑے مکوڑے اور اوپر چند ہزار گدھ —" شاعر کزن نے آسمان پر نظر ڈالی۔

"لیکن محمد رضا خاں سے ہمدردی کیوں؟ نہ ان کے پاس جدید سائنس تھا نہ ٹیکنولوجی نہ عقلیت پسندی جس سے کلائیو اور وارن ہیسٹنگز لیس ہو کر آئے تھے۔ جب مظفر جنگ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز سے مصافحہ کرتے ہوں گے لگتا ہوگا عہدِ وسطیٰ نئے سائنسی دور کو سلام کر رہا ہے —" میں نے کہا "اور ان جدید مغربیوں کا بسایا ہوا کلکتہ جسے دیکھ کر مرزا غالب ششدر رہ گئے تھے۔"

"سارے مفتوحین کلکتہ میں بسائے گئے —" ماموں نے کہا۔

"مظفر جنگ کی اولاد — ٹیپو کی اولاد — مرشد آباد والے میر جعفر کی اولاد — اور ان سب کے بعد جان عالم — اور سب وہاں عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ آپس میں یہ مفتوحین ایک دوسرے سے رشتے ناتے کرتے اور اسی میں خوش رہتے۔" ماموں نے کہا۔ "ٹیپو کے پوتے پرنس غلام محمد کی لڑکی سے مظفر جنگ کے پوتے دلدار جنگ نے اپنے لڑکے کا بیاہ کیا —"

"وہ مرحومہ ہمارے ابا کی تائی تھیں۔ سید اصغر علی دلیر جنگ کی بیوی —" ممانی بولیں۔

کلو خاں سر آگے بڑھائے غور سے سن رہے تھے — اچانک بولے — "ہمارے پردادا مرشد آباد والوں کے ہاں سے آکر دلیر منزل میں ملازم ہو گئے تھے اور ان کے بڑے بھائی رابرٹ صاحب کے ہاں خدمت گار تھے۔ رابرٹ صاحب اس وقت کپتان تھے —"

"کمپنی کے متعلق عوام ایک گیت گاتے تھے — کمپنی نشان — بی بی مرگیا دمدمہ اُڑائے بے نشان — بڑا صاحب، چھوٹا صاحب، بانکا کپتان۔ دیکھ میری جان۔ لیا بے نشان۔ کسی بانکے کپتان کے دستے نے شاید سراج الدولہ کے کسی نشانچی سے اس کا پھریرا چھینا ہو جب یہ گیت بنا۔ جس کے بعد انھوں نے دمدمہ جا کر بڑا کھانا اڑایا ہوگا۔" ماموں نے کہا۔

"دمدمہ انھوں نے ڈم ڈم بنایا۔ محرم میں حسین یا حسین کی صدائیں ان کو HOBSON JOBSON

سنائی دیتی تھیں۔ ٹیپو کا لباس اور پگڑی فتح کی نشانی کے طور پر انھوں نے اپنے چپراسیوں کو پہنائی۔ آزاد برِصغیر کی حکومتوں کے چپراسی آج تک یہی لباس پہن رہے ہیں ــــــ" میں نے کہا۔

"طرّہ ہے کا کوئی تو تیغِ ستم کی یادگاروں میں۔" شاعر کزن گنگنائے۔

"کلکتہ شہر میں کتنے گاڑیاں چل رہی تھیں۔ صبح کو صاحب لوگ میدان میں شہسواری کرتے۔ شام کو لیڈی لوگ گاڑیوں میں ہوا خوری۔ امریکہ سے برف امپورٹ کی جاتی تھی۔ بنگال کلب۔ ریس کورس۔ کرکٹ پولو فاتح انگریزوں کے مشاغل تھے۔ مسلم مفتوحین کی اولاد کے پاس سوائے تفریح کے کوئی کام نہ تھا۔ سب کو وافر پنشنیں ملتی تھی۔ بڑی بڑی کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ ٹیپو کے پوتے اور مرشد آباد کے عالی جاہ سوشل سرگرمیوں میں نمایاں تھے۔ جے۔ پی۔ بنا دیئے گئے تھے۔ مظفر جنگ کے پڑپوتے اصغر علی دلیر جنگ لندن سے بیرسٹری پڑھ آئے تھے ان کے چھوٹے بھائی سید احمد علی بیحد صاحب آدمی تھے۔ شاید ہندوستان کے پہلے براؤننگ صاحب۔ اپنی کوٹھی بمبو ولا میں بالکل انگریزوں کی طرح رہتے تھے۔ کیپٹن فریڈرک رابرٹ سے بہت دوستی تھی۔ اکٹھے پولو کھیلتے تھے۔ فتح کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور انگریز مسلم مفتوحین کی اولاد سے برابری سے ملتا تھا۔ غدر سن ستاون میں لکھنؤ کی خورشید منزل جو بعد لا مارٹینز گرلز اسکول بن گئی اس پر فتح کا پرچم کیپٹن فریڈرک رابرٹ نے نصب کیا تھا۔

"رابرٹ صاحب کی ایک بہت حسین بہن تھی مارگریٹ۔ سید احمد علی خوبصورت لکھ پتی نوجوان تھے۔ سید محمد رضا مظفر جنگ کے نوادرات اور ہیرے جواہرات کے وارث۔ اس سے زیادہ افسانوی "انڈین پرنس چارمنگ" اس وقت طامس مور کی "لالہ رخ" ہی میں مل سکتا تھا۔ مارگریٹ اور سید احمد علی کی شادی ہوگئی۔ اسلامی نام اشرف النسا بیگم رکھا گیا۔ تین بچے پیدا ہوئے۔ سید یوسف علی، فاطمہ بیگم، احمدی بیگم۔ چودہ برس تک یہ خاندان ریجنٹ اسٹریٹ لندن میں مقیم رہا جہاں نواب احمد علی نے ایک عالی شان مکان کرائے پر لے رکھا تھا اور لندن کی اعلیٰ ترین سوسائٹی میں شامل تھے۔ اسی سوسائٹی میں بے چارہ مہاراجہ دلیپ سنگھ بھی مصنوعی انگریز بن کر وکٹوریہ کے "بیٹے" کی حیثیت سے زیست کر رہا تھا" ماموں نے بات ختم کی۔

"ہماری دادی کی دادا جان سے ناچاقی رہنے لگی۔ کلکتہ واپس آکر کچھ عرصے بعد لندن واپس چلی گئیں۔ پھوپھی احمدی کو ساتھ لیتی گئیں۔ پھوپھی احمدی سایہ پہنتی تھیں پردے کا کیا سوال۔ وہیں لندن میں ایک مصری پاشا سے بیاہ کر لیا۔" ممانی نے کافی بناتے ہوئے کہا۔

"مارگریٹ اشرف النسا کے بھائی نے بہت ترقی کی۔ فیلڈ مارشل بنے۔ لارڈ کا خطاب اور ارل کا رینک حاصل کیا۔ اینگلو افغان وار میں مشہورِ عالم مارچ ٹو قندھار کی جنرل رابرٹ نے قیادت کی تھی۔" ماموں کی

پیتے ہوئے بولے۔ "لارڈ ڈفرن وائسرائے کے عہد میں انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف تھے۔ انھوں نے صوبہ سرحد اور افغانستان کے دروں کی قلعہ بندیاں مستحکم کیں اور رؤسائے ہند کو فوج میں بہتر عہدے دیئے۔ ان کے بھانجے بھانجی یوسف علی اور فاطمہ کی پرورش ان بچوں کی لاولد تائی بیگم دلیر جنگ نے کی ــــــ وہی جو ٹیپو سلطان کی پڑپوتی تھیں ــــــ"

"اصغر علی دلیر جنگ کی دوسری بیوی سے دو لڑکے تھے۔ نادر جنگ اور بابر جنگ۔ دو لڑکیاں روشن آرا اور گیتی آرا۔ روشن آرا پھوپھی کا دلا کلکتے میں کسی مپرسی کے عالم میں زندہ ہے۔ ایک سینما گھر میں ٹکٹ بیچتا ہے ــــــ کیوں کہ تعلیم کا شوق اس نسل کے بعد سے اٹھ گیا تھا۔

ممانی نے کہا۔ "دادی مارگریٹ کے لندن واپس جانے کے بعد ہمارے دادا جان نے ایک سجادہ نشین کی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ وہ ہماری پھوپھی فاطمہ بیگم سے ملنے بمبو ولا آیا کرتی تھیں۔ دھرم تلہ میں مولا علی کی درگاہ تھی۔ شیخ گلاب اس کے تکیہ دار فقیر تھے۔ نصیبن ان کی بیٹی تھیں۔ خانم صاحب کہلاتی تھیں۔ سونے کی کنجیوں کا گچھا ڈھکی ململ کی ساری کے آنچل میں باندھے رہتی تھیں۔ ناک نقشے کی اچھی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ محمد حسین۔ سید احمد علی نے ان کا بیاہ واجد علی شاہ کی پوتی سلطنت آرا بیگم سے کیا۔ فرخ مرزا کی لڑکی سے۔

"سید یوسف علی ہمارے ابا کی شادی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ان کے والد سید احمد علی نے ان کا بیاہ واجد علی شاہ کی ایک بیٹی سطوت آرا حلیمہ بیگم سے کیا۔ وہ گل اندام محل کے بطن سے تھیں۔"

ے "یہ اختر جو ہے خاکپائے جہاں
یہ شاہِ اودھ تھا کبھی اے جواں"

شاعر کزن گنگنائے۔

"سید یوسف علی بھی دس مہینے کے تھے جب ماں باپ کے ساتھ لندن گئے تھے۔ پورے چودہ برس بعد واپس آئے۔ شکلاً اور مزاجاً بالکل انگریز۔ شاید ٹیابرج میں شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نکاح کے دوسرے روز ہی رنگون چلے گئے جہاں ان کی پھوپھی زاد بہن رہتی تھیں جن کے میاں وہاں تاجر تھے۔ چند روز بعد یوسف علی نے برما میں کہیں پر یاقوت کی کان پر پہرہ دار کی نوکری کرلی ــــــ برما پولس میں بھرتی ہو گئے۔"

"یہ ہم جو وکٹورین امپیریلسٹ انگریز جنرل لارڈ رابرٹ کے خون کے ورثے کا اثر تھا۔ ورنہ اس وقت کے ہندوستانی مسلمان کی مہم جوئی شاعروں اور مجروں تک محدود تھی۔" پروفیسر شاگرد نے اظہار خیال کیا۔

"ایک چور نے بندوق چلادی۔ گولی کان کے پاس سے گذر گئی۔ اخبار میں چھپا۔ باپ نے گھبرا کر واپس بلا لیا۔ رخصتی کے لئے بارات لے کر ٹیابرج گئے۔ واجد علی شاہ کے سارے بیٹے تقریب میں جمع تھے۔ پرنس بابر مرزا وغیرہ۔

انھوں نے دولھا سے تین سو روپے ماہوار پاندان کا خرچ باندھنے کے لئے کہا۔ انھوں نے جواب دیا میں اس پر قادر نہیں ہوں۔ باپ کا دست نگر ہوں۔ باپ کو بہت غصہ آیا۔ بہرحال دلہن رخصت ہو کر بمبوولا آئیں۔ بعارضہ تپ دق تین سال بعد انتقال کیا۔"

"نواب احمد علی خود بیحد انگریز تھے۔ پانچ بجے شام کو سگار پیتے ہوئے بمبوولا کے برآمدے میں ٹہلتے تو لوگ اس وقت گھڑیاں ملاتے۔ نواب صاحب سگار پی رہے ہیں۔ پانچ بج گئے۔ دو گھوڑی برساتی میں سیڑھیوں سے لگتی۔ ایک پاؤں سیڑھی پر، دوسرا پائیدان پر، تیسرا گاڑی کے اندر۔ نواب یوسف بہت خودسر تھے۔ ان کا کہا نہیں مانتے تھے۔ ایک دن انھوں نے سگار پیا۔ باپ نے دوسرے دن کہا — سید نواب میری گاڑی میں سگار نہیں پیا جاتا — یوسف علی کلکتہ سے چلے آئے۔ لکھنؤ آکر ریلوے میں نوکری کر لی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں نواب احمد علی بیمار پڑے لکھنؤ تار دیا۔ جب تک یوسف علی بمبوولا کلکتہ پہنچیں باپ کا انتقال ہو چکا تھا — ابا نے دوسری شادی لکھنؤ کی ایک رئیس زادی سے کی۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔

"سنہ ۳۲ء میں میں ٹیابرج گئی تھی۔ اس وقت تک سلطان خانے کے حوض میں ایک مچھلی سونے کی نتھ پہنے میں نے بھی دیکھی تھی —" ممانی خاموش ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد بولیں — "ابا کے تایا دلیر جنگ سات زبانیں جانتے تھے۔ گوہر جان مجرے کے لئے دلیر منزل آیا کرتی تھیں اور ان کی ماں ملکہ جان گانا سنانے بمبوولا بلائی جاتی تھیں۔ ٹیپو سلطان کے ایک پڑپوتے نے ملکہ جان کے لئے قصیدہ لکھا تھا —"

"یہ ہے اصل بات ٹیپو کا پڑپوتا ملکہ جان کے لئے قصیدہ لکھتا ہے۔ طاؤس و رباب آخر —" شاعر کزن نے اظہار خیال کیا۔

"میں نے کتاب میں اس طرح پایا ہے کہ لوگ صورت مثال کو اصل سمجھ بیٹھے —" ماموں اپنی دھن میں کچھ کہے جا رہے تھے۔

دفعتاً میں نے کہا۔ "ماموں نے کہیں پڑھا تھا کہ ۴ مئی سنہ ۱۷۹۹ء کے روز یوم پنجشنبہ صبح سویرے بطور صدقہ ایک — بورہ سیاہ تل، ایک سیاہ بیل، تانبے کے ننانوے پیسے ٹیپو کے لئے خیرات کئے گئے تھے۔ درمیان عصر و مغرب شہید ہوا۔"

خاموشی چھا گئی۔

"وہ کس لئے ہارا کیوں کہ ہم لوگ مچھلیوں کو سونے کے نتھ پہنا رہے تھے۔" ماموں نے چند لمحوں بعد کہا۔

فرانس کے انقلابیوں نے ٹیپو کا نام اپنے کلب کے رجسٹر میں یوں درج کیا تھا —

CITIZEN TIPU, MEMBER, REPUBLICAN CLUB میں نے یاد کیا۔

"ابھی کس کس بات کا غم کرو۔" شاعر کزن نے موضوع تبدیل کیا۔ "پچھلے سال ہمارے ہاں کا شاندار محرم دیکھنے دلی سے کئی روسی اور امریکی آئے تھے۔"

"کچھ روپے سے اگر آپ ان گلیوں کی صفائی —" میں نے کہنا شروع کیا۔ شاعر کزن اٹھ کر دیوان خانے کی طرف چلے گئے جہاں ٹی۔ وی۔ پر ہندوستانی ہیرو ہیروئن اب سوئیٹزرلینڈ میں ڈوئیٹ گا رہے تھے۔

"ٹیابرج ایک غلیظ SLUM ہے جس میں واجد علی شاہ کے نام لیوا بستے ہیں۔ سولہ سولہ آدمی کے کنبے میں پاؤ بھر دال پکتی ہے۔ وہی حال ہے جو لکھنؤ کے وثیقے داروں کا ہے۔ اسی غربت میں پیسہ پیسہ جوڑ کر ہر سال دھوم کا محرم کرتے ہیں۔ بہت سی شہزادیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں۔ بڑھیا ہوگئیں۔ مگر مطالبہ دس لاکھ کا مہر باندھنے کا قائم ہے۔ اب بتاؤ اتنا بڑا مہر کون باندھے گا۔ پچاس روپیہ مہینہ وثیقہ۔ صبح کو چا، اور رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کرتی ہیں۔ عبرت۔" پروفیسر شاگرد نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔ ان کی بیوی بھی ٹیابرج سے تعلق رکھتی تھیں۔

"حضرت زید شہید کی شمشیر میں یہ کرامت ہے کہ جب کوئی بھاری مصیبت آنے والی ہو اس کی سطح پر ایک دھبہ سا پڑ جاتا ہے۔ غدر سے پہلے بھی سنا ہے پڑا تھا اور اس کے بعد بھی کئی مرتبہ۔" کلو خاں بولے۔ "پرچھائیں سی پڑ جاتی ہے۔"

"تو اب تک اس کی سطح پر پرچھائیاں ہی پرچھائیاں ہوں گی۔" میں نے کہا۔

دوسری صبح جب میں اور ممانی کلو خاں کی رکشا پر سوار ہو کر گلی میں سے نکلے اور مزید پیچدار گلیوں میں سے گزرے دونوں طرف گندے سیاہ پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ اچانک مجھے شدت کا ردعمل ہوا۔ پرانی تاریخ اور میڈیول قصبوں اور تاریخی بستیوں اور افسانوی کھنڈروں کے لئے میرا فیسی نیشن بالکل غلط، بیکار، احمقانہ اور لایعنی ہے۔ یہ بالکل ٹھہرا ہوا پانی ہے۔ سیاہ۔ کائی آلود۔ منجمد۔ غلیظ تو کیا اس تہذیب یا اس کے آثار کو اب محض لائبریری اور میوزیم میں بند کر دینا چاہیے؟ شاعر کزن جو سائیکل پر ساتھ ساتھ آ رہے تھے انھوں نے غالباً میرے خیالات پڑھ لئے بولے۔ "یہیں کے پلے بڑھے ہمارے عزیز کراچی سے چند روز کے لئے آکر اس اچنبھے اور احساس برتری سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے پہلے زمانے میں بددماغ انگریز نیٹوز کو دیکھتا تھا۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے قصبوں کا موازنہ کراچی سے کرتے ہیں تینتیس، چونتیس سال اور چلی ہی یہ تہذیب۔ اب اسے ہم اپنے ہاتھوں سے ختم کر رہے ہیں۔"

"کیوں کہ آپ کی ترجیحات PRIORITIES بالکل غلط ہیں۔ جب انگریزی پریس آپ کو بحیثیت 'بیک ورڈ'

کلاس، "شیڈولڈ کاسٹس کے ساتھ بریکٹ کرتا ہے تو آپ خوش ہوتے ہیں کہ آپ کو بھی مراعات ملنی چاہئیں۔" میں نے پوچھا: "سینما، مشاعرے، قوالی اور محرم۔ اس کے علاوہ امت مرحومہ کی دلچسپیاں کیا ہیں؟ سارے ہندوستان کے سینما گھروں میں فلمیں آپ کی سرپرستی کی وجہ سے جوبلی مناتی ہیں ——"

"بٹیا —" کلو خاں نے رکشا چلاتے چلاتے اشارہ کیا —— "ادھر نکھی نورتن کا امام باڑہ ہے۔ لال قلعہ دلی سے یہاں آئی تھیں۔"

"ایک امپیریل ماضی کسی قوم کے لئے بڑا نقصان دہ اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے شاعر کزن سے کہا۔ سید محمد رضا خاں مظفر جنگ کی اس POST-MUGHAL دنیا میں آخری وارث گمانی جان برقعے میں لپٹی رکشا میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھیں۔

"بٹیا" — کیا کہئے —— کلو خاں کو کیا یاد آیا —— برطانوی امپیریل کلکتے کے سہانے دن —— اچانک بولے —— "گوہر جان نے دلیر منزل میں بیم پلاسی کی ایک چیز سنائی تھی —— ہم دس بارہ سال کے تھے خوب یاد ہے خدا بخشے ہمارے باپ بھی نادر جنگ کے خواص تھے —— شاگرد پیشے سے آکر ہم برآمدے میں بیٹھ جاتے تھے اور سنا کرتے تھے۔ یہ نرگس کی ماں جدن بائی بھی آیا کرتی تھی اور گوہر جان نے اس روز گایا تھا —— سماں بندھ گیا تھا —— بیم پلاسی میں گایا تھا۔ جاؤ سدھارو میری جان تم پہ خدا کی امان ——"

وہ خاموش ہو کر رکشا چلاتے رہے۔

شمشیر بکف ٹیپو خود پہن کر ہر مئی کو دوپہر میدان جنگ میں جانے کے لئے گھر سے نکل رہا ہے ——

ایک اور خیال: جعفر علی خاں مرشد آباد سے آن کر کلکتے میں جہاں رہے تھے اور اپنے لواحقین کے لئے کوٹھیاں بنوائی تھیں وہ جگہ علی پور کہلاتی ہے کہ جعفر علی خاں نے اسے بسایا تھا۔ اور وہاں پٹیوں کا بڑا سناٹا ہے اور ڈوئل لڑنے والے فرنگیوں کی آہٹ جو درختوں کے سائے میں چل رہے ہیں اور سراج کی پسپائی کی آوازیں۔ نیچے نگاہ کی، کلو خاں کے شکستہ، گرد آلود چپلوں میں اٹکے پاؤں یکسانیت سے رکشا کے پیڈل چلائے جا رہے تھے۔

ایک گلی کے سرے پر ایک شکستہ پھاٹک نظر آیا جس کی اینٹوں میں گھاس اور پیپل کے پودے اگ آئے تھے پھاٹک سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور ڈیوڑھی تھی جس کی سیڑھیوں کے نیچے سیاہ پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ ایک مہترانی گھونگھٹ کاڑھے جھاڑو ٹوکرا لئے سامنے سے گذری۔ ہم لوگ رکشا سے اتر کر ڈیوڑھی کے اندر گئے۔ عین سامنے صحن میں لپی پتی دیوار کے کنارے گلاب کا ایک پھول کھلا ہوا تھا۔ ہرے ڈنٹھل پر ہری پتیوں سے گھرا تیز سرخ گلاب کا صرف ایک پھول جیسا پہلے زمانے میں اشراف روزری کی شیشی پر بنا ہوتا تھا۔

اندر دالان میں ایک لڑکی مشین پر سلائی کر رہی تھی۔ طاق میں رکھا ریڈیو ودھ بھارتی کے فلمی گانے سنا

رہا تھا۔ میں اور گمانی جا کر لڑکی کے پاس دوسرے کھرّے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ لڑکی نے سلام کیا۔ ریڈیو بند کر کے پان بنانے لگی۔ انگنائی کی دیوار کے ادھر سے ایک ضعیفہ اونچی آواز میں کسی سے مخاطب تھیں —— "تیرہ تیزی، بارہ وفات، میرانجی، شاہ مدار، خواجہ جی، مریم روزہ —— اے لو پورا سال گذر جاتا ہے پر تم نہ آئیں پاکستان سے۔ کیا میرا چالیسواں کرنے آئیں گی۔"

ایک اور ضعیفہ دوہری کمر، کمانی جیسی ٹانگیں کمرے سے برآمد ہوئیں۔ ہاتھ میں بڑا سا کنجیوں کا گچھا۔ دعا سلام کے بعد ان کے ہمراہ ہم لوگ انگنائی پار کر کے ڈیوڑھی میں پہنچے۔ گلی میں اترے۔ کیچڑ سے بچتے اس قدیم پھاٹک میں داخل ہوئے جو گلی کے سرے پر استادہ تھا۔ اندر اینٹوں کے وسیع صحن میں زرد خودرو پھول اُگے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ایک عالی شان حویلی کے کھنڈر۔ سامنے ایک اجاڑ برآمدے میں دیوار کے نزدیک ایک طویل چوبی صندوق رکھا تھا۔ فرش پر چٹائی۔ ایک کونے میں کسی کتاب کے بوسیدہ پیلے اوراق کسی نے چٹائی کے نیچے سرکا کر اوپر اینٹ رکھ دی تھی۔ زرد کاغذوں پر چھپی دھندلی عبارات چٹائی کے ایک بڑے سوراخ میں سے جھانک رہی تھیں —— جب حلیمہ بیگی آغا ولایت شیروان سے تشریف لے گئیں —— قول آنجناب اکثر چنیں بود کہ وقتیکہ در گوش من آواز دوں دوں از نقارہ بر می آید خیال میکنم کہ اگر نادر شاہ ——

ان کی مادر گرامی کا نام لوراد تھا۔ مختار بن ابو عبیدہ ثقفی نے چھ سو دینار میں خرید کر مع چھ سو اشرفی خدمت میں امام عالی مقام کے گزرانا تھا۔ کنیت ابوالحسین اور بسبب کثرت تلاوت کلام اللہ حلیف القرآن بھی مشہور تھے۔ عالم جلیل و فاضل بے عدیل تھے۔ اپنے تمام بھائیوں میں افضل —— گلاب کے پھول کی طرح حسین

"اے باجی بیگم میں بھی آ جاؤں زیارت کرنے؟" دیوار کے ادھر سے آواز آئی۔

"جم جم آؤ بہار آرا بیگم۔" ہماری میزبان ضعیفہ نے جواب دیا۔

چند لمحوں بعد ایک اور بڑی بی جھکی جھکی دوسرے صحن سے دالان میں داخل ہوئیں —— بوڑھی پھونس دھندلی آنکھیں —— لیکن کراری آواز —— شاید کچھ دیر قبل یہی پاکستان سے بچوں کے نہ آنے کا شکوہ کر رہی تھیں۔ اور ان خزاں رسیدہ بی بی کا نام بہار آرا بیگم تھا۔ وہ بھی آن کر چٹائی پر اکڑوں بیٹھ گئیں۔ میری نظر پھر اس سوراخ سے جھانکتی عبارت پر پڑی۔ "جب حلیمہ بیگی آغا ولایت شیروان سے تشریف لے گئیں۔"

ایک خاتون کا نام حلیمہ بیگی آغا بھی کیا بالکل ترک تازی والا نام تھا۔

بہار آرا بیگم بڑھیا انگلش کارڈیگن پہنے ہل ہل دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ یہ کارڈیگن یقیناً ان کے کسی پوتے نواسے نے گلف سے یا انگلستان سے بھیجا ہو گا۔ محلے محلے قصبے قصبے غریب مسلمانوں کے گھروں سے افلاس کے آثار مٹتے جا رہے تھے۔ کماؤ بیٹوں کے سمندر پار سے بھیجے روپے اور خود اپنے دیس میں نئے کاروبار اور گھریلو صنعتوں

کی بیرونی دنیا میں بڑھتی ہوئی مانگ نے ان لاکھوں کاریگر مسلمانوں کے دن پھیر دیئے جن کے بے شمار آبائی ہنر یہ گھریلو صنعتیں تھیں۔ قالین بافی کے مرکز ایک چھوٹے سے قصبے میں مغرب کے تمام بنکوں کی شاخیں کھل چکی تھیں۔

ہر طرف نئے مکان بن رہے تھے۔ دینی مدرسے، مساجد۔

"تمہارے ملک کے ہر فرقے میں مذہب کا غلبہ شدت سے بڑھتا جا رہا ہے۔" کل شاعر کزن نے کہا تھا اور اس کے بعد خود فخریہ اپنے ہاں کے محرم کی تصاویر دکھائی تھیں۔

میزبان ضعیفہ نے کنجیوں کا گچھا چھنکا کر طویل صندوق کا قفل کھولا۔

رات ماموں میاں نے تفصیل سے سمجھایا تھا۔ اکبری منصبدار سید ابوالحسن یہاں آتے ہوئے گڑھ کتیشر میں کنارِ دریا سرائے میں ٹکے۔ وہاں ان کی ملاقات ان کے مرشد میاں اللہ بخش گنج بخش سے ہوئی جنھوں نے یہ مقدس تلوار اور نیزہ انھیں عطا کیا۔ ان کو ان کے مرشد شیخ مبارک بالادست جھنجھانوی نے اور ان کو ان کے مرشد میر علی عاشقاںؒ شطاری جونپوری سرائے میر والے عارف باللہ نے کہ زید شہیدؓ کی اولاد میں سے تھے۔

"تم کو معلوم ہے ـــــ" ماموں میاں نے پیچوان کی نے رکھ کر اچانک پوچھا۔ "پہلے زمانے میں صوفی لوگ فقراء اور درویش ایک دوسرے کو سلام کس طرح کرتے تھے؟ ایک کہتا یا علیؑ ـــــ دوسرا جواب دیتا مولا علیؑ گویا وعلیکم السلام ـــــ اچھا تو میاں اللہ بخش درویش نے یہ شمشیر اور نیزہ سید ابوالحسن منصبدار کو عطا فرمایا اور بولے یاد رکھو کرامت اس شمشیر کی یہ ہے کہ جب کوئی بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہو اس پر داغ پڑ جائیں گے

"سابق میں یہ تبرکات جن صاحب کے پاس تھیں ان کے ورثا میں سے ایک کی زوجہ ثانی ہمشیر حکیم غلام حسین خاں کی تھیں۔ حکیم صاحب نے یہ تبرکات نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور کو دے دیں۔ نواب کے ایک اہلکار کو ان کی حقیقت معلوم نہ تھی۔ اس نے تلوار اور نیزہ اسلحہ خانے میں جمع کر دیا۔ اسلحہ خانے میں آگ لگ گئی۔ ایک بزرگ نے خواب میں آکر نواب سے کہا کہ تبرکات فوراً واپس کر دو۔ چنانچہ نواب نے ہاتھی پر طلائی ہودہ کسوا، اس میں تبرکات رکھ بصد عزت و تکریم انھیں واپس کیا۔ یہاں لاکر زیارت کے لئے نکالا گیا تو شمشیر پر چتے نظر آئے بعد چند روز کے غدر پڑا۔ انگریز سرکار نے رعایا کو نہتا کیا۔ یہ مقدس تلوار بھی کلکٹر ضلع نے اپنے قبضے میں کر لی۔ بعد کچھ عرصے کے اسے واپس کیا۔"

جو رہی سو بے خبری رہی۔

فرنگی کلکٹر بھی بے خبر تھا۔

ممانی جان واقف ہیں۔ صندوق کے سرہانے بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہیں۔ ان کی انگریز دادی کے بڑے بھائی فیلڈ مارشل ارل رابرٹ نے اپنی ولایتی تلوار سے افغانستان میں اہلِ ایمان کی کشتوں کے پشتے لگا

دیئے تھے۔ وہ بے خبر تھا ـــــ لیکن ہم جو واقف ہیں۔

سن سینتالیس میں بھی اس شمشیر پر دھبے پڑ گئے تھے۔" ضعیفہ نے کہا۔

اس مکان میں کوئی نہیں رہتا؟" میں نے دریافت کیا۔

"سن سینتالیس میں یہاں شرنارتھی آباد کر دیئے گئے تھے۔ وہ چند روز بعد کہیں اور چلے گئے۔"

"ان تبرکات کو کسی کمرے میں مقفل کیوں نہیں رکھتیں؟" میں نے پوچھا۔

"بابی جب بھی اس صندوق کو کمرے میں رکھ کر تالا لگاؤ تو تالا آپ سے آپ کھل جاتا ہے۔ حکم نہیں ہے۔"

انھوں نے صندوق کا پٹ کھولا۔ احتیاط سے پہلے حضرت شرف الدین شاہ ولایت کے تبرکات نکالے تراشیدہ کہربا کی ایک انگشتری، ایک بڑا کڑا جس پر آیات قرآنی کے اعداد نقش تھے۔ ایک عصا۔ ان کو واپس رکھنے کے بعد قدیم بوسیدہ کپڑے میں لپٹی ایک تلوار نکالی۔ کپڑے کی پٹیاں کھولیں۔ تلوار نیام سے برآمد کی۔ تلوار کا دستہ چوبی تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ سطح پر جگہ جگہ چتیاں سی پڑی تھیں۔ تلوار کی قدامت جن کی سائنٹفک توجیہہ ہو سکتی تھی۔ بھالا بھی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ دو منٹ بعد ضعیفہ نے دونوں چیزیں صندوق میں واپس رکھیں۔ جناب علیؑ حضرت زید شہید ابن امام زین العابدینؑ کی تلوار اور نیزہ ـــــ کمال ہے۔

صحن میں سناٹا تھا۔ ممانی دعائیں پڑھنے میں منہمک تھیں۔ تیز دھوپ میں خودرو زرد پھول لہلہا رہے تھے۔ چند کوے فرش پر ٹہلتے پھر رہے تھے۔

سُرماندی کنارے مدھو کا کھلی ہے۔ ہرجائی ہوا جنگل جنگل ـــــ

میزبان ضعیفہ اور بہار آرا بیگم کو خدا حافظ کہہ کر ہم لوگ باہر آئے۔ کلو خاں رکشہ کے پاس اس طرح مستعد کھڑے تھے گویا سید محمد رضا خاں مظفر جنگ کے چوبدار مغرق ہاتھی یا چوڈوے کی نگہبانی کرتے ہوں۔

اسی وقت مہترانی ٹوکرا اٹھائے گلی کی سیاہ کیچڑ میں پچ پچ کرتی دوبارہ پاس سے گزری۔ کیچڑ کی چند چھینٹیں اڑیں۔ کلو خاں توبہ تلا کرتے اُچک کر ایک طرف کو ہو گئے۔ "لاحول ولا قوۃ ـــــ صبح صبح ـــــ نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ لے کے کمبخت نے نجس کر دیئے ـــــ ہمارے پاس اتنے کپڑے بھی تو ناں ہیں کہ بار بار بدلتے پھریں۔ توبہ توبہ۔" اپنے شکستہ لباس پر نظر ڈال کر انھوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور ہم لوگوں کو سوار کرا کے گلی سے نکلے۔

۲۔ قائم کی بیریاں

شہر ہماری طرف بڑھتے رہے اور ہم میں شامل رہے اور ہمارے پاس سے اور ہمارے اندر سے

ہو کر نکل گئے۔ ہم نے بہتے دریا کے کنارے خیمہ کیا تھا۔

۱۸۵۴ء میں وہ کوٹھی خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای۔ نے لکھنؤ سے آکر پنجاب جانے سے قبل بنوائی تھی۔ پوری URBUN ESTATE تھی۔ وسیع احاطہ۔ متصل فیض گنج۔ ایک طرف دوکانوں کی قطار۔ احاطے کا پھاٹک اور اونچی دیوار اب بھی باقی ہے۔ احاطہ، میر قایم علی کی ایک پڑپوتی ثروت آرا بیگم کو ورثے میں ملا تھا۔ کوٹھی ثروت آرا کی بہن نذر سجاد حیدر کو۔ دوکانیں ایک پڑپوتے میجر حسنین کو ملی تھیں۔ سڑک کے اس پار عین مقابل میں قلعے کی سفید مسجد آم کے گھنے درختوں میں پوشیدہ۔ کچھ فاصلے پر قلعے کی شکستہ فصیل۔ اس کے احاطے میں گورنمنٹ کالج کوٹھی کے عین سامنے چوراہے کے ادھر میر قایم علی کے ایک بڑے جاگیردار کزن کا شہری مکان۔ اس مکان کے بالاخانے کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازے میں گرمیوں کی بھری دوپہروں میں سامنے کا پر فضا منظر بےحد سہانا معلوم ہوتا تھا۔ کبھی اودا، کبھی نیلا، کبھی ہرا، کبھی نارنجی، دنیا منظر سب سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میر قایم علی کہیں پر بیریوں کے درخت بھی لگائے تھے۔ وہ محلہ اب تک قایم کی بیریاں کہلاتا ہے۔ صاف ستھری گلیاں، صاف ستھرے محلے۔ اس شہر آئینہ کے اس رنگ برنگے شیشوں والے مکان میں صبح شام بہشتی زینے کے دروازے پر آواز لگاتا ــــ پردہ کر لیجئے۔ کبھی مہتر بہو نہ آتی اس کا آدمی یہی ہانک لگاتا ــــ اس وقت آنگن میں نیم تلے بھائی مہدی اپنی انٹلکچوئل گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑ دیتے۔ یہ نظام کس طرح بدلے گا۔ وہ جوش سے کہتے۔ تین ہزار سال سے ایک پوری آبادی کو NIGHT SOIL اٹھانے کے کام پر لگا رکھا ہے۔ اور خود کو مہذب کہتے ہیں۔ خود ہمارے تہذیب کے بھائی علی مہدی ہمیشہ NIGHT SOIL ہی کہتے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد بھائی علی مہدی خود تو امریکہ جا بسے وہ آبادی اس طرح NIGHT SOIL اٹھایا کی۔

آزادی کے پندرہ بیس سال بعد تک قایم کی بیریوں پر خاصی بے رونقی اور اداسی چھائی رہی۔ پچھلے چند سال سے اس پورے شہر پر ایکدم زروں کی بہار آگئی تھی۔ تین سال ادھر میں وہاں گئی تو ایک نواب زادہ کزن مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے۔ ابھی اب تو میں بھی سماوار ایکسپورٹ کر رہا ہوں۔ منجھلے بھیا کراچی سے آکر بتا جایا کرتے تھے کہ ان کے ہر لڑکے لڑکی کے پاس الگ الگ TOYOTA موٹریں ہیں۔ ہم دم بخود سر جھکائے سنا کریں تھے۔ تو بھئی ہم بھی اس کاروبار میں لگ گئے۔ پرانی نکال کر نئی ایمبیسڈر خریدی۔ اب انشاءاللہ سامنے والی زمین جو خالی پڑی ہے اس پر شوروم بنواؤں گا اور جو باہر سے ــــ ابھی مڈل ایسٹ، یوروپ، امریکہ سے برتنوں کے خریدار آویں گے ان کے ٹھہرنے کے لئے گیسٹ ہاؤس..."

مصر قدیم میں موت کا تصور یوں تھا کہ موت کا ملاح نیل کی موجوں پر اپنی کشتی کھیتا شمال کی طرف سے اور جنوب کی سمت منہ کئے رہتا ہے۔ روحوں سے لدی کشتی الٹی سمت کو بہتی رہتی ہے۔ سامنے جو دریا بہہ رہا ہے

اس پر ایسی کشتیوں کی ایک قطار گذرتی جا رہی ہے۔ جب کشتیاں آگے جا کر موت کے دھندلکے میں کھو جاتی ہیں ایک اور قطار نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ مردے آدھی رات کو قبروں سے اٹھ کر SYNOGOGUE میں جا کر عبادت کرتے ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ پرسوں جلے ہوئے کارخانوں میں رات بھر کھٹ کھٹ ہوا کی۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ جیسے جلد از جلد سارا مال تیار کر کے نقش و نگار سے مکمل پیک کر کے دریا پر پہنچا دیا جائے جہاں خالی بجرے منتظر تھے اور ان کے ملاح خاموشی سے جنوب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کوٹھی میر قایم علی کی جگہ اب دو منزلہ عمارت کھڑی ہے جس میں متعدد ڈاکٹر رہتے ہیں۔" ابھی ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ دو مریض عورتیں اندر گئیں زندہ واپس نہ آسکیں۔ کسی نے کہا۔ سفید مسجد آم کے گھنے درخت، ثروت خالہ مرحومہ کے احاطے کا پھاٹک۔ سامنے رنگ برنگے شیشوں والا مکان، دور قلعے کی فصیل، بہتا دریا، سب چیزیں اسی طرح موجود تھیں۔ شاعر کزن جو قصبہ دانشمنداں سے آئے ہوئے تھے حسبِ عادت آسماں کو دیکھ کر بولے ابھی ابھی کس بات کا غم کرو۔

ہم لوگ کالج کے احاطے میں داخل ہو کر فصیل کی سمت چلے۔ شاعر کزن بولے ــــ HOLOCAUST کے فوراً بعد کلکتے کے اس بےحد اہم مشہور انگریزی اخبار کا مسلمان ایڈیٹر یہاں آیا تھا۔ مجھ سے پوچھا کیا آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے؟ میں نے جواب دیا اندلس سے جب لوگ نکلے مراقش پہنچ کر اپنے اندلسی مکانوں کی کنجیاں دیواروں پر ٹانگ دی تھیں کہ ایک روز واپس جائیں گے، کبھی نہ جا سکے۔"

"یہ اندلس والی پوزیشن ہرگز نہیں ہے۔ ایک رپورٹر بولا۔ میں نے کہا حضت سب پوزیشن جہاں تک جان و مال کی تباہی، ہلاکت اور خونریزی کا تعلق ہے یکساں ہیں۔ مشرقی پاکستان کی پوزیشن کیا تھی؟ جو لوگ وہاں سے جان بچا کر کھٹمنڈو اور کلکتے پہنچے تھے کیا وہ اندلس سے نکلے تھے؟ ان کو ان کے ہم مذہبوں نے مارا اور نکالا تھا ــــ اس نے پوچھا اب کیا ہوگا۔ میں نے کہا میں تری کال درشی نہیں ہوں کہ بھوت، ورتمان بھوش کا حال ایک ساتھ بتا دوں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ دھوپ چھاؤں۔ اسی طرح گاڑی چلتی رہے گی جب تک سارا معاشی نظام نہیں بدلتا ــــ"

ہم لوگ کالج کے احاطے میں سے ٹہلتے ہوئے فصیل تک پہنچے۔ گذشتہ سال ایک شام کو میں یہاں شاعر کزن اور نواب زادہ کزن کے ساتھ چہل قدمی کے لئے آئی تھی۔ ایک دلچسپ منظر دیکھا تھا۔ فصیل کی اندرونی دیوار میں ایک طاقچے میں چراغ روشن تھا، پھول رکھے تھے، اگربتی سلگ رہی تھی۔ یہ کسی پیر کا چلّہ تھا۔ اس کے نیچے ایک دوسرے سے دور کچھ فاصلے پر دو غریب مسکین صورت آدمی چپ چاپ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک دھوتی پوش۔ ایک لمبی داڑھی والا۔ یہ دونوں کالج کے چپراسی ہیں۔ شام کو دونوں یہاں بیٹھتے ہیں۔ آپس میں معاً

ہے۔ اس چلّے کے مجاور بن گئے ہیں۔ ہندو مسلمان جو چڑھاوا چراغی کا نذرانہ لاتے ہیں اسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔" نواب زادہ کزن نے محظوظ ہو کر بتایا تھا۔

میں کچھ دیر گھڑی دیکھا کی۔ دونوں صبر سے ان چند پیسوں کی آس لگائے بیٹھے تھے جو کوئی عقیدت مند اس طاقچے پر چڑھا جائے۔

"تمھیں جان بیم کی بات یاد ہے جس کا میں نے پچھلے سال نواب مظفر جنگ کی زمین اور مارواڑی کی جوٹ مل کے سلسلے میں تذکرہ کیا تھا پچھلے سال ماموں میاں کے ہاں؟" اس وقت قلعے کی شکستہ فصیل کے نیچے میں نے شاعر کزن سے پوچھا۔

"نئے کاروباری طبقات کے مفاد ـــــ؟" اس نے کہا۔

"ہاں لیکن اگر کم از کم اس شہر کے لوگ ان دونوں مفلس چپراسیوں سے عقل سیکھ لیتے کہ نئی خوشحالی میں جو نفع ہو اسے مل بانٹ کر کھاؤ ـــــ وہ دونوں ہیں کہاں؟"

"کون ـــــ؟"

"وہی دونوں خود ساختہ مجاور جو گذشتہ برس یہاں دھونی رمائے بیٹھے تھے۔"

"شاید زندہ ہوں۔ انسان بڑا سخت جان ہے۔"

"اور شاید پھر یہاں چراغ جلا کر بیٹھ جائیں۔"

"جی ہاں۔ انسان بڑا سخت جان ہے۔ چلئے قایم کی بیریوں میں چھبن آپا کے ہاں۔ ان کا بڑا لڑکا کویت سے آیا ہوا ہے۔ اس کی منگنی کی دعوت ہے۔" شاعر کزن نے گھڑی دیکھ کر یاد دلایا۔

قایم کی بیریوں کے اس مکان میں بڑی چہل پہل تھی۔ انگنائی زرق برق کپڑوں میں ملبوس مہمان بیبیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس وقت ہم لوگ وہاں پہنچے اسی وقت چھبن آپا کا چھوٹا لڑکا ڈنمارک واپس جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو رہا تھا۔ سب ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔

"سدھارو۔ امام ضامن کی ضامنی اور بی بی سیدہ کی چادر میں دیا ـــــ" لڑکے کی دادی کی جھرجھری آواز بلند ہوئی۔

اتنے میں پچھلے دروازے کی کنڈی کھڑکی ـــــ اور ایک کرارا نعرہ ـــــ "ابھی میں نے کہا پر دہ کرلو۔"

"توبہ ہے۔ نگوڑے کو عین اسی وقت آنا رہ گیا تھا۔ مُجن بیٹے دس منٹ رک جاؤ ـــــ" دادی نے جھنجھلا کر کہا۔ "دور پار۔ چھائیں پھوئیں۔"

ڈھاٹا باندھے، ٹوکرا اور جھاڑو اٹھائے ذرا لنگڑاتا ہوا مہتر آنگن میں داخل ہوا۔

"اے کلّو تم صبح نہ آئے ـــــ" ایک اصیل نے شکایت کی۔

"کیا کرتا۔ تلوے میں شیشہ چبھ گیا۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ اتنی تکلیف تھی۔ دو گھنٹے دواخانے کی لین میں کھڑا رہا۔ اور صاحب کان کھول کر سن لو۔ میرا نام کلّو نہیں کلّو خاں ہے۔"

کلّو خاں ـــــ میں چونکی۔ انھوں نے جھاڑو ٹوکر زمین پر رکھا۔ بغل سے نکال کر دستانے پہنے۔ پھر جھاڑو ٹوکرا اٹھایا اور بیت الخلا کی طرف سر جھکائے اس طرح چلے جیسے ان کے بزرگ سراج الدولہ کے ساتھ پلاسی سے لوٹے تھے۔

"کلّو خاں ـــــ" میں نے بھونچکی آواز میں دہرایا۔

میری للکار پر وہ ٹھٹکے۔ پلٹ کر دیکھا۔ ڈھاٹا منہ ناک پر سے اس طرح سرکایا گویا میدان جنگ میں ڈٹے ہوں اور چہرے پر سے خود اٹھاتے ہوں۔

"بات یہ ہے بٹیا ـــــ" انھوں نے کھنکار کر کہا۔ "اس قیامت کے بعد سے اس شہر کے خاکروبوں نے بائیکاٹ شروع کر دیا ہے گا۔ جھگڑا تو انہی کا شروع ہوا تھا۔ کیا کرتے۔ تیس پینتیس آدمی اس کام میں لگ گئے۔ میں بھی شہر آگیا۔ اس میں پیسہ بہت مل جاتا ہے۔ رکشہ کھینچنے، ٹھیلہ چلانے سے کہیں زیادہ بڑھاپا ہے۔ پھیپھڑے ناکارہ ہو گئے۔ رکشا نہ چلائی جاتی۔ بارہ جنوں کا ٹبر، کمانے والا اکیلا میں۔ دوسری بات یہ ہے ـــــ یہ جتنے باہر کے ملک ہیں اسلامی اور کرسچین، ان میں بھی تو یہ کام لوگ باگ خود ہی کریں ہیں۔"

میرا کوئی جواب نہ پا کر چند سکنڈ کھڑے رہے۔ پھر بولے ـــــ "اور آپ اپنے ماموں ممانی سے ملنے نہ گئیں؟ مل آئیے۔ چراغ سحری ہیں دونوں ـــــ"

"انھوں نے آپ کو کیسے آنے دیا ـــــ؟"

"ان کو بتایا ہی کاں ـــــ؟ چپکے سے سٹک لیا۔ آپ بھی نہ بتلائیے گا ـــــ اچھا اللہ بیلی۔"

ڈھاٹا منہ ناک پر واپس کھسکا کر وہ لنگڑاتے ہوئے غسل خانوں کی سمت چلے گئے۔

کبھی عبرانیوں نے قامیوں کو پانی بھرنے اور لکڑی چیرنے والے بنایا تھا کبھی قامیوں نے عبرانیوں کو۔

نوشیرواں عادل کے محل میں آگ روشن ہے۔

اس نے بیم پلاسی کے سُر اتنے اونچے کئے کہ شیشہ ٹوٹ گیا۔

الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے۔

اس شہر آئینہ بے جواب شہر کابوس ہے۔ چند میل دور اس قدیم قصبہ دانش منداں میں اپنے مغلیہ مکان کے اندر سرو کے نیچے آرام کرسی بچھائے والدہ مرحومہ کے کزن اور کو کلتاش جواب بھی لال قلعے کی زبان کے بچھیڑے میں

ہیں، افسردگی سے کہیں گے ——— عبرت۔ بے چارہ کلو بھی آخورچی بن گیا۔

اور اسی قصبے کی ایک اجاڑ حویلی کے دالان میں ایک داغ داغ شمشیر کے صندوق کے سامنے وہ بوڑھی عورتیں شاید سرنگوں بیٹھی ہوں۔ بہار آرا بیگم اور ان کی پڑوسن۔

یاصاحب العصر والزماں۔ الاماں۔ الاماں۔ الاماں۔

۲۲ جنوری ۱۹۸۱ء کا لکھا ہوا چھبن آپا کی لڑکی کا خط۔

باجی جان تسلیم۔ یہاں کے حالات معمول پر آرہے ہیں۔ کاروبار زور سے شروع ہوگئے ہیں۔ پہلے جیسا ماحول نظر آتا ہے لیکن ابھی تلاشیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ انشاء اللہ اب حالات صحیح رہیں گے کیوں کہ لوگ کاروبار میں مصروف ہیں۔ انھیں افواہیں سننے کی بھی فرصت نہیں۔ چند روز قبل ایک افواہ سارے شہر میں گشت کررہی تھی کہ محلہ لال باغ کے فساد میں شہید ہونے والے بتن خاں کی روح رات کو آکر اپنے دشمنوں سے بدلہ لیتی ہے۔ لیکن چند روز بعد اس افواہ نے دم توڑ دیا۔ پڑھے لکھے لوگ بھی یقین کرنے لگے تھے۔ اب سوچ کر ہنستے ہیں۔

کلو حلال خور بھی خیریت سے ہے۔ سلام لکھواتا ہے۔ □

انتظار حسین

پاکستان

انتظار

وہ گلی کے اس نکڑ پر سکوٹر لئے کتنی دیر کھڑا رہا۔ کتنے انتظار کے بعد وہ آئی اور کتنی گھبرائی ہوئی تھی۔

"بہت دیر لگائی۔"

"بہت مشکل سے نکل کے آئی ہوں۔ اصل میں آج ہمارے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ بہت بہانے کرنے پڑے۔" پھر ادھر ادھر دیکھ کر گھبرائے لہجہ میں بولی۔ "کوئی دیکھ نہ لے۔"

"تم آج گھر سے نئی تو نہیں نکلی ہو۔"

"وہ نکلنا اور ہوتا تھا۔ اس طرح تو کبھی نہیں نکلی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس ملاقات کو نارمل طریقہ سے نہیں لے رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو کہ یہ چاہنے والوں کی ملاقات ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔ ایسی باتیں کریں گے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ تم اس ملاقات کو کسی دوسرے رنگ میں مت لو۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اس ملاقات کو کوئی رومانٹک ملاقات سمجھ رہی ہوں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ خواہ مخواہ مجھے اپنے آپ کو ایک رومانٹک ہیرو تصور کرنا پڑے گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "! کہیں واقعی آپ اپنے کو ہیرو تو نہیں سمجھ رہے۔"

"ہیرو اگلے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ سکوٹر کے ساتھ کون آدمی اپنے آپ کو ہیرو تصور کرسکتا ہے۔"

"اچھا یہاں سے تو سرکو۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔"

"دیکھنے کی فرصت بھی اگلے زمانے ہی میں تھی جب ہی تو عشق کا آنا چرچا ہوجایا کرتا تھا۔ آج کی مصروف زندگی میں کسی کو دیکھنے کی فرصت کہاں ہے۔"

"اچھا جلدی کریں۔ اور چلنا کہاں ہے۔"

"اچھا بیٹھو۔ ایسا کرتے ہیں کہ شہر سے نکل کر کسی خاموش سے چائے خانے میں بیٹھتے ہیں۔"

وہ گھبرائی "میں بہت دور نہیں جاؤں گی۔"

"پھر یہیں قریب میں کہیں بیٹھے جاتے ہیں۔"

"مگر کوئی دیکھ نہ لے۔"

"جب ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ دور چل کر کسی خاموش جگہ بیٹھتے ہیں۔"

"مگر سکوٹر پہ آپ کیوں آئے ہیں۔"

"اس لئے کہ میرے پاس کار نہیں ہے۔"

سکوٹر کے پیچھے بیٹھتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی "سکوٹر پہ میں اس طرح بیٹھی ہوئی کیسی لگوں گی۔"

"اس طرح جھجکو گی تو کسی دوسرے کو تو بعد میں شک ہوگا۔ پہلے مجھے خود اپنے آپ پر شک ہونے لگا کہ میں شاید تمہیں......"

اس نے فوراً بات کاٹی "بس بس جلدی کرو۔"

"تو پھر جلدی بیٹھو۔"

وہ سکوٹر کی عقبی نشست پہ بیٹھی۔ اس نے آگے بیٹھ کر سکوٹر سٹارٹ کیا۔ مختلف بازاروں سے وہ کس تیزی سے گذرا۔ بازاروں سے گذر کر جب خاموش کشادہ سڑک پر آیا تو اس نے رفتار اور تیز کر دی۔

"آہستہ چلائیے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" ڈرنے کی بات بھی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی کے ساتھ سکوٹر پہ اس طرح بیٹھی تھی۔ اور سکوٹر اتنا تیز جا رہا تھا کہ وہ جیسے اڑی جا رہی تھی۔ جیسے کسی صبا رفتار گھوڑے پر شہسوار کی کمر میں بازو حمائل کئے بیٹھی ہے۔ گھوڑا سنسان راہوں پر سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اس کی لمبی زلفیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں اس تندرست کمر کو اور زیادہ شدت سے جکڑ لیا۔

چلتے چلتے وہ ایک سنسان مقام پر پہنچے۔ سامنے ایک عمارت کھڑی نظر آئی۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے اس دروازے پر دستک دی "کوئی ہے؟"

ایک سفید ریش نے اندر سے جھانکا "اس غیر وقت میں یہاں کون آیا ہے۔"

"اے شخص ہم مسافر ہیں کہ ہرج مرج کھینچتے یہاں ایسے وقت میں پہنچے ہیں جب شام پڑ رہی ہے اور رات سر پہ کھڑی ہے۔ اس سنسان بیابان میں یہ دروازہ نظر آیا۔ گویا امید کی کرن نظر آئی۔ سوچا کہ کوئی سرائے ہے یا کسی مہربان کا دولت کدہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ در ہماری دستک پہ وا ہو اور چندے سر چھپانے کے لئے جگہ ملے۔"

وہ در دستک پر وا ہوا۔ اور جب انھوں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ شمعیں روشن ہیں، فانوس

جھلملاتے ہیں۔ مسندیں بچھی ہیں۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ سامان نائو نوش ہے۔ خدام دست بستہ کھڑے ہیں۔ خادمائیں آجا رہی ہیں۔ سفر کی ساری تکان دم بھر میں اتر گئی۔ جی باغ باغ ہوا۔ وصل کا شوق تیز ہوا۔ لب سے لب ملے۔ سینے سے سینہ ملا۔ یک جان دو قالب۔

جب مرغ نے بانگ دی تب وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اب اس کی آنکھیں کھلیں۔ گھر کی یاد آئی۔ خوف سے لرزنے لگی۔ تب اس نے دلاسا دیا کہ جان من، تشویش مت کرو۔ میرا رہوار صبا رفتار ہے۔ یہ کہہ کر اس نے لپک جھپک گھوڑے پہ زین کسی، لپک کر خود بیٹھا، آغوش میں لے کر اسے بٹھایا۔ گھوڑے کو ایڑ دی۔ اس برق رفتار نے اشارے کو فوراً سمجھا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

جدائی کے مقام پر پہنچ کر وہ گلے ملے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے۔ وعدے وعید ہوئے۔

وہ آبدیدہ ہو کر بولا "کیا یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔"

"نہیں۔"

"پھر طے ہو جانا چاہیے کہ کب اور کیسے ملاقات ہوگی۔"

وہ چپ رہی۔ تب اس نے تجویز پیش کی "کل شام پڑے۔ یہیں اسی مقام پر۔ ٹھیک وقت پہ آؤ گی نا؟"

"اگر میں ٹھیک وقت پر نہ آئی تو تم چلے جاؤ گے؟"

"نہیں۔ انتظار کروں گا۔"

"کب تک انتظار کرو گے۔"

"جب تک تم نہیں آؤ گی۔"

"فرض کرو کہ میں عمر بھر نہ آؤں۔"

"میں عمر بھر انتظار کروں گا۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔

"اچھا فرض کرو کہ میں نہ آؤں۔"

"نہیں تم آؤ گی۔"

"فرض کرو۔"

"انہونی کو کیسے فرض کر لوں۔ آؤ گے اور مقررہ وقت سے پہلے آؤ گے اور میرے آنے تک انتظار کرو گے۔

"ہماری وفا پر اتنا اعتماد ہے۔"

دونوں پھر کھلکھلا کر ہنسے۔ کتنا ہنسے اور کتنی ہنسی خوشی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

اُدھر ادھر اور ہی گل کھلا تھا۔ آئے مہمانوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا۔ خالہ بی کہہ رہی تھیں کہ "فرخندہ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"مگر خالہ بی، میں تو ..."

"میں تو کیا" خالہ بی نے فوراً بات کاٹی "تمھارے امتحان ابھی بہت دور ہیں۔ بہت وقت پڑا ہے پڑھنے کے لئے۔ میں جلدی واپس بھیج دوں گی۔"

اس نے بہت حیلے بہانے کئے۔ کوئی حیلہ بہانہ نہ چلا۔ جانا اس کا ٹھہر گیا تھا۔

وہ وقت مقررہ پر اس مقام پر پہنچا اور انتظار کی گھڑیاں گننے لگا۔ گھڑیاں گذرتی گئیں۔ اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ کھڑا رہا۔ کھڑا رہا۔

ایک نظر شناس نے کہ زمانے کا گرم سرد دیکھے ہوئے تھا۔ اسے تاڑا۔ اس کے پاس آیا اور بولا "اے جوان میں دیکھتا ہوں کہ روز تو یہاں کوئی امید لے کر آتا ہے، کھڑا رہتا ہے، راہ تکتا رہتا ہے، جانے کس کی اور پھر افسردہ و رنجور واپس چلا جاتا ہے۔ کچھ کہہ کہ تو نے اپنا یہ حال کیوں بنایا ہے اور وہ کون ہے جس کا تو یہاں آکر انتظار کرتا ہے۔"

اس نے ایک آہ سرد بھری اور کہا "اس کا جسے ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی آرزو ہے۔"

اس نظر شناس نے غور سے نوجوان کو دیکھا اور ہمدردانہ بولا "اب میں سمجھا۔ کسی نازنین کے تیر نظر نے تجھے گھائل کیا ہے۔ اے جوان اپنی جوانی پہ رحم کھا اور اس خیالِ خام سے باز آ۔ ایک دفعہ دیکھے کو غنیمت جان۔ دوسری دفعہ دیکھنے کے خیال سے درگذر ورنہ جان لے کہ دربدری خاک بسری تیرے مقدر میں لکھی گئی۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لاکر بولا "اے میرے مشفق، یہ تو کیا کہتا ہے۔ میں اس کے وعدے کو کیوں کر فراموش کرسکتا ہوں۔ صبح رخصت ہنوز میری آنکھوں میں رم رہی ہے۔ کس دکھے دل کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ کس خلوص سے اس نے شام پڑے اسی مقام پر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔"

وہ شخص تلخ ہنسی ہنسا "نادان نازنینوں کے وعدوں پر مت جا۔ عورت اور وقت جاکر واپس نہیں آیا کرتے۔"

انتظار کی گھڑیاں اس شام اس پر بہت سخت گذریں۔ جوں توں کر کے اس نے وہ گھڑیاں گذاریں۔ اور جب پلٹا تو اسے لگا کہ وہ ڈھے چکا ہے۔

"عورت اور وقت" وہ بڑبڑایا۔ دن بھر وہ ایک کرب کے عالم میں رہا۔ انتظار اسے اب لاحاصل نظر آرہا تھا۔ اے مرے دل، اس راہ جانا اور اس کی راہ تکنا بے سود ہے۔

پر دن ڈھلے اس نے اپنے آپ کو پھر اسی مقام پر پایا، اسی شہر سنگ دل کے کنارے، اس شام بھی اس نے بہت انتظار کھینچا۔ تھک کر سکوٹر پر بیٹھا بڑبڑایا، عجیب لڑکی ہے۔ آج بھی نہیں آئی۔ سکوٹر اسٹارٹ کیا اور واپس چلا گیا۔ □

جیلانی بانو
حیدرآباد

ظلِ سُبحانی

سا ــ رے ــ گا ــ ما ــ پا ــ دھا ــ نی

ظلِ سبحانی بھیرویں کے سُروں پر پلکیں جھپکانے لگے۔

محل کا بوڑھا موسیقار آج اپنے حجرے کی بجائے ظلِ سبحانی کی خواب گاہ کے نیچے بٹھایا گیا تھا۔ تاکہ پَو پھٹنے سے پہلے بھیرویں کے سروں پر ظلِ سبحانی کو جگا سکے۔

ہوا یوں کہ کل دربارِ عام میں محل کے ایک شاعر نے نکلتے سورج کے حسن پر اتنی دل نشین نظم سنائی تھی کہ جہاں پناہ نے نکلتے سورج کا حسن ملاحظہ فرمانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

اس خبر کے عام ہوتے ہی سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ دربارِ عام کے جھروکے سے نظر آنے والے در و بام کو خوبصورت بنانے کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ بعض اونچے پرانے مکانوں کو گرا دینا پڑا، تاکہ ظلِ سبحانی سورج کے حسن کو کسی رکاوٹ کے بغیر دیکھ سکیں۔ پرانی سڑکوں اور بدصورت عمارتوں پر رنگ کیا گیا۔ محل کے سامنے سے گذرنے والی ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لئے پولیس کے خصوصی دستے ساری رات انتظامات میں مصروف رہے۔

پھر جب زلفِ شب کمر تک لہرانے لگی تو بوڑھے موسیقار کی آواز محل کے اندھیرے میں ایک ننھے سے تارے کی طرح لَو دینے لگی۔

سا ــ رے ــ گا ــ ما ــ پا ــ دھا ــ نی۔

بھیرویں کے سات کومل سُر مل کر ایک رس ساگر بنے اور سارے محل میں بہنے لگے۔ بھیرویں کے سُروں کا یہ سمپورن سنگار روپ اندھیرے میں جھلملانے لگا تو گہری تاریکی میں لپٹا ہوا سورج بھی جیسے بے کل ہو اٹھا اور ظلِ سبحانی نے اپنے پاس لیٹی ہوئی عورت کو لات مار کے سونے کے نقشی چھپر کھٹ سے ڈھکیل دیا اور زور سے چلائے۔

"یہ کیسا شور ہے ـــ؟

"ظلِ سبحانی! آج حضور کے حکم کے مطابق محل کا بوڑھا موسیقار عالی جاہ کو صبح کا راگ گا کر جگا رہا ہے تاکہ عالی جاہ نکلتے سورج کا خوبصورت نظارہ کر سکیں۔"

"تو کیا سورج نکل گیا ـــ؟ انھوں نے غصہ میں ریشمی تکیے کو پٹخ ڈالا۔"

"جی ـــ جی ـــ حضور ـــ اب نکلنا ہی چاہتا ہے۔"

اصل بات یہ ہے کہ سورج تو ابھی محل سے بہت دور تھا۔ مگر بوڑھے موسیقار کی گنگناہٹ نے چاروں اور ایک جوت سی لگا دی تھی۔

سا ــ رے ــ گا ــ ما ــ پا ــ دھا ــ نی

"نہیں، جب تک ہم اسے دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہو جاتے سورج نہیں نکل سکتا۔"

"جو حکم عالی جاہ" وزیرِ اعظم نے دونوں ہاتھوں سے ڈھیلی ڈھالی پتلون کو اوپر سرکایا، سامنے کی طرف جھکے اور پھر الٹے پیروں ہوم منسٹر کے پاس دوڑے۔

"سرکار کا حکم ہے کہ جب تک وہ تیار نہ ہو جائیں، آج سورج نہ نکلے۔"

"ہائیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــ؟ ہوم منسٹر نے اپنی گنجی چندیا پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ اور پھر کچھ سوچ کر وہ سر پہ پاؤں رکھ کر، بھاگے کلچرل افیئرز کی منسٹر کے پاس۔

"کیوں جی یہ چاند، سورج، ستارے، تو سب کلچرل افیئرز کی منسٹری کے تحت آتے ہیں نا ـــ؟

"چاند، سورج، ستارے ـــ؟ ہائے اللہ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

کلچرل افیئرز کی منسٹر ایک خاتون تھیں، جو دن رات اپنی منسٹری میں مصروف رہتیں۔ یعنی آئینے کے سامنے بیٹھی اپنی بھوئیں، پلکیں اور زلفیں سنوارا کرتی تھیں۔

"ہاں ہاں، بالکل ہے ـــ" ہوم منسٹر نے پاؤں پٹک کر کہا۔

"چاند، سورج، ستارے، یہ سب اسٹیج ڈراموں اور کلچرل پروگراموں ہی میں تو کام آتے ہیں، تو میں ظلِ سبحانی کا حکم ہے کہ آج جب تک وہ تیار نہ ہو جائیں سورج نہ نکلے۔"

"اوئی اللہ ـــ" کلچرل افیئرز کی منسٹر نے کمر پہ ہاتھ رکھا اور انگلی ناک پر ٹکائی ـــ "نکلتے سورج کو میں کیسے روکوں گی جی ـــ؟

"مت روکو ـــ اپنی منسٹری سے بھی ہاتھ دھولو۔"

سورج کی باگ ڈور کلچرل افیئرز کے منسٹر کو سونپ کر، وہ دوڑے دوسرے انتظامات کی دیکھ بھال کرنے۔"

"اے ہے! اب کیا کروں!" شریمتی منسٹر نے دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچا اور پھر انھیں ایک ترکیب سوجھی۔ "ابھی فلم ڈویژن والوں کو فون کرتی ہوں کہ نکلتے سورج کی ایک فلم لاکر محل کے سامنے دکھا دیں۔"

اب وہ پھر اطمینان سے میز کے سامنے بیٹھ کر اپنی لپ اسٹک درست کرنے لگیں۔ اتنی دیر میں دیکھتے دیکھتے بھیرویں کے سُر ظلِ سبحانی کو دس نوکروں کی مدد سے تیار کروا کر جھروکے تک لے آئے تھے۔ خواب گاہ سے جھروکے تک تمام راستے کو سُرخ گلابوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ جھروکے کے بیچ میں سونے کے فریم والی سُرخ مخمل کی گدے والی بڑی سی کرسی بچھی تھی۔ آس پاس فرانسیسی عطر میں ڈوبے ہوئے مورچھل ہاتھوں میں تھامے دو خادمائیں پتھر کی مورت بنی کھڑی تھیں۔

درِ تانا دیرے نادیم تانہ نا
یالالعی یالالعی یالوم تانا دیرے نا

موسیقار اب اجالے کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ ہیلاوے دے رہا تھا۔ بجلی کی طرح کبھی ادھر چمکتا کبھی ادھر دمکتا۔

"ملاحظہ فرمائیے عالی جاہ، یہ کرنوں کا راجہ اب اجالے کی رتھ پر سوار ہو کر ہوتے ہوتے ہماری اور بڑھ رہا ہے۔" شاعر ایک کونے میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اپنی رنگین بیانی سے اس منظر کو اور خوبصورت بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈگمگاتے قدموں اور کانپتے ہاتھوں سے، کئی خادموں کی مدد سے ظلِ سبحانی مسند پر جلوہ نشین ہو گئے۔

"یہ یہ سورج کدھر سے نکل رہا ہے ـــــ؟ رات کی سرشاری کے کڑوے ذائقے اور تھکا دینے والی رنگینیوں کی وجہ سے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ہاتھ پانوں قابو میں نہ تھے۔

"جی ـــ جی سرکار ـــ؟ وہ ـــ وہ ـــ" وزیرِ اعظم نے سٹپٹا کر ہوم منسٹر کی طرف دیکھا۔ ہوم منسٹر بھی نہیں جانتے تھے کہ سورج کس طرف سے نکلتا ہے۔ اس لئے انھوں نے فوراً اربن ڈیولپمنٹ کے ڈائریکٹر کو ٹھوکا دیا۔ اور اس نے جلدی جلدی شہر کا نقشہ سامنے پھیلا کر، ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"مشرق سے عالی جاہ۔"

"مہ مہ مشرق سے ـــ؟ ظلِ سبحانی نے گرج کر پوچھا۔

"مہ مہ مشرق سے کیوں ـــ؟ ہمارے ملک کا سورج مشرق میں کیوں جاتا ہے ـــ؟ ادھر تو ہمارے دشمن کا علاقہ ہے!

"عالی جاہ! اس وقت اپنا چہرہ مبارک سورج کی طرف رکھیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ نور کی ایک چادر سی آسمان پر تنی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔

سورج تو حضور روز مشرق ہی سے نکلتا ہے۔ مغرب میں ہی ڈوبتا ہے۔"

شاعر نے بڑی عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

درِ تانا دیرے نادیم تانہ نا ـــــ

موسیقار کی آواز سے جیسے روشنی کی پھوار سی پڑنے لگی تھی۔

"یہ مغرب میں ڈوبتا ہے روزانہ! یعنی کہ یورپ میں! ظلِ سبحانی نے اپنی بوجھل آنکھیں کھول کر ہکلاتے ہوئے شاعر سے پوچھا۔

"مغرب کی بے حیائی اور بے دینی دیکھنے کے لئے سورج روز رات کو وہاں رنگ رلیاں منانے جاتا ہے ـــ؟ ہوم منسٹر ـــ!

ہوم منسٹر تھر تھر کانپتے، اپنی گنجی چندیا کو سامنے جھکائے، ہاتھ جوڑے آگے بڑھے۔

"ہوم منسٹر! آج سے ہمارے ملک کا سورج مشرق سے نکلے گا اور نہ مغرب میں ڈوبے گا ـــ کیا سمجھے ـــ؟

"جی سمجھ گیا جہاں پناہ۔" وزیرِ اعظم نے جلدی جلدی فرمان مبارک کو سنہرے فریم لگے قرطاس پر سونے کے قلم سے لکھتے ہوئے کہا:

"ہاں! ما بدولت اپنے ملک میں بے دینی اور بداخلاقی پھیلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ انھوں نے تمام درباریوں کو داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

ان کے پیچھے وزیرِ اعظم، ہوم منسٹر، وزیر دفاع، کوتوال شہر، اور تمام اہم وزیر ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے تھے کہ کیا پتہ کس وقت، کس کی طلبی ہو جائے وہ سب دل ہی دل میں شاعر کو کوس رہے تھے، جس نے آج رات ان سب پر نیند حرام کر دی تھی۔

حضور! اس منظر کے لئے ایک شاعر نے کہا ہے کہ ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

شاعر نے ہاتھ اٹھا کر جھومتے ہوئے شعر سنایا۔

"یہ یہ کس کا شعر ہے ـــ؟ ظلِ سبحانی اچھل پڑے۔ نعوذ باللہ، یعنی اگر رسول نہ ہوتے تو ایک پیالی کافی سے کام چل جاتا اس ملعون شاعر کا!

کون ہے وہ دہریہ ـــ اسے ہمارے سامنے پکڑ کر لاؤ۔

"جی مناسب عالی جاہ" ہوم منسٹر سر پہ پیر رکھ کر اس شاعر کو پکڑنے دوڑے اب ظلِ سبحانی نے آنکھیں چندھیا کر سامنے کی طرف دیکھا تو دور آسمان پر سفید بگلوں کی قطاریں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔

"یہ یہ پرندے کہاں جا رہے ہیں ــــ؟" انھوں نے فائر کرنے کے انداز میں وزیر اعظم کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"جی حضور، یہ تو جنگل کے آزاد پنچھی ہیں، صبح سویرے دانے دُنکے کی تلاش میں ادھر سرحد کے پار جنگلوں کی طرف جاتے ہیں۔" وزیر اعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون توند پر سرکا کر دانت نکوسے ــــ

"کیا ــــ کیا ہمارے ملک میں اناج کا قحط ہے جو یہ پرندے سرحد کی طرف جا رہے ہیں۔ اس سے ہمارے ملک کی بدنامی ہوگی ــــ وزیر اعظم، کل سے سرحد کی طرف اڑنے والے تمام پرندوں کو ہلاک کر دیا جائے۔"

"جی بہت اچھا جہاں پناہ۔" وزیر اعظم نے ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کر جلدی جلدی فرمان مبارک کو سنہرے فریم لگے قرطاس پر سونے کے قلم سے لکھتے ہوئے کہا۔

"عالی جاہ! اب ملاحظہ فرمائیے اس خوبصورت منظر کو، یہ جو بادلوں کے پیچھے سے سنہری روپہلی کرنیں آسمان پر ــــ

لیکن دوربین کو آنکھوں پر فوکس کرنے کے بعد ظلِ سبحانی کو سنہری روپہلی کرنیں تو زمین پر بکھری نظر آئیں۔ چالیس پچاس لڑکیاں رنگین تتلیوں کی طرح چہلیں کرتی کہیں اکٹھی جا رہی تھیں۔

"وہ ــــ وہ ــــ ظلِ سبحانی نے اپنے رعشہ سے کانپتے ہاتھ کو اٹھایا۔

"جی وہ ــــ یا وہ؟ ادھر تو یونیورسٹی ــــ ہے عالی جاہ۔ لڑکیاں ہاسٹل سے نکل کر صبح سویرے چہل قدمی کرنے جا رہی ہیں۔ ہوم منسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"اتنی بہت سی لڑکیاں ــــ" ظلِ سبحانی تھوک نگل کر دیکھنے لگے ــــ "یہ سب کنواری لڑکیاں ہیں ــــ؟ ان کے ماں باپ پر ان کی شادیوں کا کتنا بوجھ ہوگا! ہم اپنی رعایا پر اتنا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے ــــ وزیر اعظم ــــ!

"جی ــــ جی ظلِ سبحانی، میں آج ہی ان سب لڑکیوں کو حرمِ مبارک میں پہنچا دینے کا انتظام کر دوں گا ــــ" اور وزیر اعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کے جلدی جلدی سنہرے فریم والے قرطاس پر سونے کے قلم سے ــــ

جاگا کرنوں والا۔ چاروں اُور ہوا اُجیارا۔

بوڑھا موسیقار اب راگ کی سرشاری میں وہاں تک پہنچ گیا تھا، جہاں فضا میں ہر طرف نور ہی نور

تھا۔ رنگ ہی رنگ بکھر رہے تھے۔

"اف کتنا خوبصورت منظر ہے! عالی جاہ! یہی وہ وقت ہے جس کی تعریف میں کوئی، سنگیت کار ادھورا ــــ

"ہاں ہاں بہت اچھا ہے۔ مابدولت نے پسند فرمایا اس منظر کو ــــ

اور پھر انھوں نے دوربین سے اپنا چہرہ ہٹا کر، آنکھیں چندھیا کر، دور کسی طرف دیکھا۔

"وہ ــــ وہ کیا بلڈنگ ہے ــــ؟

"وہ سفید سی اونچی بلڈنگ جہاں پناہ! وزیر دفاع نے بڑی مسرت کے ساتھ سامنے کی طرف جھک کر کہا ــــ" وہ اس خادم کے بیٹے کا مکان ہے حضور آپ کا وہ غلام زادہ اس ملک کا بہت اچھا ارکیٹکٹ ہے۔ اس نے اپنا وہ مکان ایک انوکھے ڈھنگ سے بنایا ہے۔"

"اچھا ــــ؟ مابدولت وہ مکان ملاحظہ فرمائیں گے۔" ظلِ سبحانی نے یوں وزیر دفاع کی طرف دیکھا جیسے اسے خلعت سے نواز رہے ہوں۔

"زہے نصیب عالی جاہ۔ جب ارشاد عالی ہو، سواری مبارک غریب خانے پر رونق افروز ہو۔" وزیر دفاع نے جھک کر سات بار سلام عرض کرتے ہوئے کہا۔

"مگر مابدولت اس بھیچر آرکیٹکٹ کے مکان میں نہیں جائیں گے۔ پہلے وہ مکان ہماری ملکیت میں داخل کیا جائے۔"

"ذرہ نوازی ہے سرکار۔" وزیر دفاع نے نہایت مریل آواز میں کہا اور اس بار اس نے چودہ سلام کیے ــــ اور وزیر اعظم نے جلدی جلدی فرمانِ مبارک سنہرے فریم والے قرطاس پر سونے کے ــــ

"یہ ــــ یہ کس کی آواز ہے ــــ؟ کیا کوئی فریادی ہم سے انصاف مانگنے آیا ہے۔؟

"ظلِ سبحانی نے چونک کر نیچے کی طرف دیکھا۔"

ایک بھکاری لڑکا اپنی ٹوٹی ہوئی رکابی کو بجاتا ہوا گا رہا تھا ــــ

اللہ دلوائے گا سو دیوے گا
اللہ کا پیارا کوئی دیوے گا

"یہ تو کوئی بھکاری ہے عالی جاہ۔ صبح سویرے اللہ میاں سے اپنا رزق مانگ رہا ہے۔" ہوم منسٹر نے اپنی گنجی چندیا پر سے پسینہ پونچھ کر عرض کیا۔

"نہیں یہ لڑکا باغیوں کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔" ظلِ سبحانی نے بڑے متفکرانہ انداز میں آہستہ

سے کہا۔

"ایسا لگتا ہے کچھ لوگ ملک میں ہمارے خلاف اللہ میاں سے سازش کر رہے ہیں۔

وزیر اعظم! ان تمام بھکاریوں کو پکڑ کر عمر قید کی سزا دو جو ہماری بجائے ڈائریکٹ اللہ میاں سے اپنا رزق مانگتے ہیں۔"

"جی مناسب بندہ پرور۔" وزیر اعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون اوپر سرکا کے جلدی جلدی سنہرے فریم والے قرطاس پر ——

اب موسیقار نے اندھیرے کو مکمل شکست دے دی تھی اور کرنوں والے دیوتا نے چاروں اُور اُجیارے کی پچکاریاں چھوڑنا شروع کر دی تھیں۔

ظلِ سبحانی اب کرسی کے تکئے سے ٹیک لگائے بڑے مدبرانہ، متفکرانہ انداز میں داڑھی کھجانے لگے۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑے اور سونے کے نقش و نگار والی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مار کے فرمایا۔

"وزیر اعظم! ہمارے ملک میں کسی کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہو رہی ہے۔ کوئی ظالم ہماری رعایا کو پریشان تو نہیں کر رہا ہے ——؟

"بالکل نہیں عالی جاہ۔" تمام درباریوں نے ظلِ سبحانی کی طرف جھک کر بہ آواز بلند کورس گایا۔

ظلِ سبحانی یہ سن کر مسکرائے اور ادھر ادھر دیکھ کر فرمایا۔

"یہ —— یہ گرمی کیوں ہو رہی ہے اس وقت ——؟

یہ سنتے ہی مورچھل تھامنے والی نے پتھر کی مورتیوں کے ہاتھ آہستہ آہستہ مورچھل ہلانے لگے۔

"عالی جاہ، آج اگر نکلتے سورج کا حسن ملاحظہ فرما لیتے تو بہتر تھا۔ کیوں کہ اب دھوپ میں تیزی آ گئی ہے۔ شاعر نے بڑے افسوس کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھا! یہ گستاخ سورج ہمارے سامنے تیزی دکھا رہا ہے ——؟ اچانک ظلِ سبحانی چلانے لگے —— وزیر اعظم! سورج کو ابھی شوٹ کر دو ہمارے سامنے۔ اور اس احمق شاعر کا بھی سر قلم کر دو، جس نے ہمیں اس خود سر سورج کو دکھانے کی زحمت دی ——

ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کے وزیر اعظم نے فوراً دو فائر کیے —— دھائیں —— دھائیں۔

اچانک سارے ملک میں اندھیرا چھا گیا —— کیوں کہ دوسرے فائر کی زد میں سورج کی بجائے بھیروں کے وہ سُر آ گئے تھے، جو روزانہ آکاش اور پاتال کی گہرائیوں سے سورج کو کھوج نکالتے تھے۔ ☐

جوگندر پال

بے مراد

پنڈت بڑا گھبرایا ہوا تھا اور پتہ نہیں، تھیلے کے بوجھ سے ہانپ رہا تھا یا ضمیر کے۔ وہ گویا سڑک کی بھیڑ بھاڑ میں نہیں چل رہا تھا بلکہ یہ سارا ہجوم اس کی تلاش میں اپنے آپ سے نکل کر اس کی نظر میں آ نکلا تھا اور اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا —— پنڈت خجل سی فتح یابی سے مسکرانے لگا —— بڑے شہروں کی چکا چوند کا یہی تو ایک فائدہ ہے کہ کچھ بھی کر لو، کسی کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا، اسی لئے جو بھی کرنا ہو یہاں لوگ کھلے عام کرتے ہیں —— چلتے چلتے کسی بھلی سی عورت سے ٹکرا گئے —— چھما کرو بہن جی —— اور بہن جی کی خنداں آنکھیں پوچھنے لگیں، کیوں؟ تم نے کیا ہی کیا ہے؟ —— تو پھر آؤ بہن جی، پہلے کچھ کر لیتا ہوں ——

پنڈت ہنسنے لگا۔

کوئی پندرہ برس پہلے وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں میں مندر کا پجاری تھا۔ ایک گہری رات کو وہ چھنو کا منہ پرشاد کے لڈوؤں سے بھرنے کے لئے اسے اپنی کوٹھڑی میں لے آیا۔ سب تھک کر سوئے پڑے تھے بس ایک بھگوان کی مورتی ہی جاگ رہی تھی۔ کیا مجال، کبھی جھوٹ موٹ ہی آنکھیں موند لے۔ شور مچا مچا کر سارے گاؤں کو جگا دیا اور پنڈت بے چارہ خواہ مخواہ پکڑا گیا۔

پنڈت نے تھیلا دائیں ہاتھ سے بائیں میں لے لیا اور ٹھڑیاں سہلانے لگا، مانو ابھی ابھی پندرہ برس پہلے کی مار کھا کے اٹھا ہو —— کچھ بھی ہو مار کھا کے کئے کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ورنہ کئے جاؤ اور کلیجے کا بوجھ بڑھاتے جاؤ —— پنڈت کا دل بوجھ ہی بوجھ سے اس کے حلق میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا کہ مل جائے تو پہلے پانی پی لے، مگر یہاں تھالی پانی کہاں؟ —— وہ ایک بار —— کیوں بھائی پانی ملے گا؟ —— ارے اِنا معلوم کیا کر کے آیا ہے کہ پانی مانگ رہا ہے —— جاؤ بابا، جا ہی قدم پر تھانہ ہے۔ پانی ان سے مانگو۔ ہمارا تم نے کیا بگاڑا ہے؟ —— جاؤ!

لال پگڑی والے کو دیکھ کر پنڈت بے سبب بوکھلا جاتا تھا۔ گذشتہ منگل کا ذکر ہے کہ سامنے

کی چوکی کا حوالدار وردی پہنے کھٹ کھٹ مندر میں چلا آیا۔ پنڈت اس وقت بھگوان کرشن کے منھ میں بھوجن ڈال رہا تھا۔ لال پگڑی کی جھلک پاکر اس نے کھانے کا تھال وہیں رکھ دیا اور باہر آ کھڑا ہوا۔

"جے سری کرشن، پنڈت جی۔"

"جے سری کرشن۔"

"کہئے، ہمارا بھگوان کیسے ہے؟"

"بھگوان تو سدا مزے میں ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں، دیکھ کر بتایئے، کہیں مزے سے بیٹھے بیٹھے اس کی آنت تو نہیں اکڑ گئی۔" حوالدار کو اچانک خیال آیا کہ وہ تھانے میں پھنسے ہوئے کسی ساہوکار کا ذکر نہیں کر رہا، اور وہ سنبھل گیا۔ "کیا کریں پنڈت جی، چوبیس گھنٹے چوری، ٹھگی اور ڈکیتی کی رپورٹیں لکھ لکھ کر ہمیں ہمیشہ الٹی باتیں ہی سوجھتی ہیں۔" اس نے پنڈت کے ہاتھوں میں منگوار کے پرشاد کا لفافہ تھما دیا۔

پنڈت نے اطمینان کی سانس لی۔

"جے سری کرشن! —— بنانے والے نے تو آدمی کو آدمی ہی بنایا، پر آدمی آپ ہی آدمی نہیں رہا حوالدار جی۔"

حوالدار جوتے اتارنے لگا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں پنڈت جی۔ آپ سے کیا پردہ؟ کسی خونی کی ماں نے رو رو کر پانچ روپے رشوت دے دی تھی کہ مجھے اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھ لینے دو۔ پیسے تو میں اپنی سگی ماں سے بھی نہ چھوڑتا مگر اسی دم سوچ لیا، ان برے پیسوں کو کسی اچھے کام میں ہی خرچ کروں گا —— جے شری کرشن!"

حوالدار نے نل سے ہاتھ دھو کر انھیں کسی مجرم کے مانند چھاتی پر باندھ لیا اور پنڈت کے پیچھے پیچھے چل کر بھگوان کی مورتی کے سامنے آنکھیں بند کرکے کھڑا ہو گیا۔

پنڈت کو اپنا بایاں بازو بھاری معلوم ہونے لگا تو اس نے تھیلا پھر دائیں ہاتھ میں لے لیا۔

تمھاری مہا اپرم پار ہے بھگوان۔ قانون کی رکشا کرنے والے کے من میں شنکا پیدا ہو یا قانون میں بگاڑ پیدا کرنے والے کے، تم سب کا پرشاد بے جھجک منھ سے لگا کے ان کا منھ بھی میٹھا کر دیتے ہو۔ اچھے اور برے سب چین کی بانسری بجاتے ہوئے تمھارے دوارے لوٹتے ہیں —— دھنیہ ہو! —— تھیلے کو کہنی کی طرف سرکا کے پنڈت نے جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ کے کرشن بھگوان کو پرنام کیا اور پرنام کرتے ہوئے ایک شرابی سے ٹکرا گیا وہ جو ہڑبڑا کر اس سے پوچھنے لگا، "پئے ہوئے ہو؟ بھری سڑک پر ہاتھ باندھ

کے چلتے ہو، کم سے کم آنکھیں تو کھلی رکھو۔"

"مگر آنکھیں کھلنے پر ہاتھ کیسے باندھے گا؟" شرابی کا ساتھی بھی لڑکھڑاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"ہاں، بڑی سمجھ کی بات کہی ہے۔ آؤ، اسی بات پر ایک ایک جام اور چڑھا آتے ہیں۔"

"ہاں، آؤ، اس تلک دھاری کو بھی ساتھ لے چلیں۔"

پنڈت ان سے جان چھڑا کر جلدی جلدی آگے ہو لیا۔ وہ اپنے دوست مدن لعل کے ساتھ اکثر شراب پینے بیٹھ جاتا تھا۔ مدن کو تو سب کو دکھا کے پیتے ہوئے خوشی ہوتی تھی مگر وہ ہمیشہ چھپ کر پیتا تھا۔ اول تو برے کرم سے بچ کر رہو۔" وہ مدن لعل کو سمجھایا کرتا۔ "مگر جینا بس میں نہ رہے تو اتنا تو کرو کہ کسی کا من میلا نہ ہو۔"

"ہو بھی جائے تو کیا ہے؟ ہنستے کھیلتے ان کی ساری میل کو دھو دو۔"

مندر کا فلیٹ ایک بہت بڑی بلڈنگ کی چھٹی منزل پر تھا۔ ہر منزل پر ایک ایک بیڈ روم کے دو دو فلیٹ تھے لیکن اس منزل پر ایک چھوٹا سا مندر تھا اور مندر کے اندر ہی کھلتا ہوا صرف پنڈت کا فلیٹ۔ بلڈنگ کے مالک سیٹھ مول چند کا کہنا تھا کہ بھگوان کرشن خود آپ بیکنٹھ سے چل کے اس کے سپنے میں آئے اور بولے، اپنی اس بلڈنگ کی چھٹی منزل پر میرا مندر بنوا دو۔ میں نے بہت کہا، میرے داتا، آپ کا ایک شاندار مندر الگ سے بنوائے دیتا ہوں۔ لیکن بھگوان اڑ گئے، نہیں، میرے بھگتوں کو ان چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رہنا ہوگا تو میں الگ سے اپنا محل کیوں بنواؤں، سو جسے بھی کرائے پر فلیٹ دیتا ہوں اس سے حلفیہ بیان لے لیتا ہوں کہ وہ بھگوان کرشن کا بھگت ہے۔

"میں نے تو اس بیان پر بخوشی دستخط کر دیئے۔" مدن لعل نے پنڈت کو بتایا تھا۔ "اگر سیٹھ سچ بولتا ہے تو کرشن بھگوان بھی میری طرح مارکسسٹ ہے۔"

مدن لعل مندر ہی کی بلڈنگ کی دسویں منزل پر رہائش پذیر تھا۔ "تمھارے بھگوان سے چار منزلیں اوپر رہتا ہوں —— مگر رہتا کہاں ہوں بس یہ مان کے چلو کہ اپنی خباثتوں کے باعث لوٹتا پوٹتا رہتا ہوں اور تمھارے بھگوان کو ترس آ جائے تو وہ آپ ہی کہہ دیتا ہے، جاؤ مدن لعل پنڈت کے ساتھ بیٹھ کے دو گھونٹ پی آؤ۔"

بھگوان کی آرتی کے بعد کافی رات گئے مدن ایک پورا ادھا لے کر پنڈت کے پاس آ پہنچا۔ پنڈت اس کے آتے ہی فلیٹ کی چٹخنی اندر سے چڑھا لیتا اور پھر مدن کو اپنے سونے کے کمرے میں جانے کا

اشارہ کرکے مندر کا دروازہ بند کرنے کے لئے بڑھتا۔

"دروازہ کیوں بند کرتے ہو؟" مدن لعل اس سے کہتا۔ "وہ میرے ساتھ کئی بار پی چکا ہے۔"

ایسے ہی ایک موقع پر پنڈت میدان صاف کرکے مدن کے پیچھے پیچھے اپنے سونے کے کمرے میں وارد ہوا تو وہ اسے بتانے لگا۔ "پرسوں جب تم یہاں اپنے بھگوان کی آرتی اتار رہے تھے پنڈت، تو وہ میرے پاس پہنچا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے ساتھ خوب ڈٹ کے پی، اور پی کر بڑے گہرے ہوش میں آگیا اور ہمارے یگ کی ایک نئی مہابھارت کا اعلان کیا — "اے ارجن، کان کھول کر سنو — میں نے ہاتھ باندھ کر اسے بتایا کہ میں ارجن نہیں بھگوان، مدن لعل ہوں۔" — "ہاں، تم ارجن کیوں کر ہو سکتے ہو؟ — دھیان سے سنو، مدن لال —"

پنڈت نے اپنے دونوں کانوں کے پٹ سرپٹ کھول رکھے تھے کہ من بھاتے کھانے پینے کی توقع ہو تو انوکھی باتیں بڑی بھلی لگتی ہیں

"جانتے ہو بھگوان نے مجھے کیا بتایا؟ — اس نے کہا، اے مدن لعل، تمہارے یگ میں مہابھارت رن بھومی میں آمنے سامنے لڑ لڑا کر نہیں لڑی جائے گی، بلکہ اس یدھ کو ہر کسی نے ہر وقت ہر جگہ مسکرا مسکرا کر محبت سے لڑنا ہے اور ہر کسی کا اسی طرح ناش کرنا ہے — جانتے ہو پھر کیا ہوا، پنڈت؟ بھگوان کا کہنا سن کر میرا نشہ ہرن ہو گیا اور میں نے اسی کا شکر ادا کیا کہ وہ وہاں تھا ہی نہیں۔"

"بھگوان کے بارے میں الٹی سیدھی مت ہانکا کرو؟" پنڈت کو مدن کی باتوں سے مزہ آرہا تھا مگر اس نے سوچا کہ وہ چپ رہا تو دکھائی دے گا تو بھگوان کی نظروں میں اس کی پوزیشن صاف رہے گی۔

"الٹی سیدھی؟ کیا تمہارا ہی ذہن تو الٹا نہیں، پنڈت؟ بھگوان ایک تمہاری ہی جائداد نہیں، وہ میرا بھی ہے، اور میری خواہش ہے کہ جو کچھ مجھے اچھا لگتا ہے اس سے میرا بھگوان بھی محروم نہ رہے۔" وہ بوتل کا ڈھکنا کھول کر ہنسنے لگا۔ "جاؤ، دروازہ کھول کر اسے بھی لے آؤ۔ کیا حرج ہے؟"

پنڈت نے ہونٹوں پر انگلی باندھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اگر اس کا موڈ ہو گا تو دروازہ کھلا ہو یا بند، وہ میرے یا تمہارے گلاس سے وہیں بیٹھے بیٹھے پی لے گا۔"

پنڈت ہنسنے لگا لیکن جھٹ ہی سنبھل کر اپنے اوپر غصہ طاری کرنے لگا کہ ہنس کیوں رہا ہوں۔

"میں مذاق نہیں کر رہا، پنڈت، میں نے کئی بار یہیں اس کمرے میں اپنی دونوں آنکھوں سے

دیکھا ہے کہ میرا گلاس بھرتے ہی اپنے آپ خالی ہو جاتا۔ بولو وہ نہیں، تو اور کون اسے خالی کرتا ہے؟"

کئی دفعہ مدن لعل پنڈت کے ساتھ پینے کے بجائے پی کر ہی اس کے یہاں آتا اور سیدھا بھگوان کے چرنوں میں جا بیٹھتا۔

"مانا کہ میں بہت برا ہوں بھگوان۔" وہ بھگوان کرشن سے مخاطب ہو کر کہتا، "مگر میں جو بھی کرتا ہوں تمہاری ہی ذمہ داری کو نبھانے کے لئے کرتا ہوں۔ یہ ذمہ داری تمہاری ہے کہ میں زندہ رہوں۔ بولو، ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاؤں تو مجھے کہاں سے کھلاؤ گے؟ بانسری کو منہ سے ہٹا کے جواب دو، میں برا نہ بنوں تو کھاؤں کیا؟ مجھے کوئی منتر پھونکنا نہیں آتا کہ نیکی ہی نیکی سے روٹیاں بنا لوں — نہیں، بانسری بجانا بند کرو اور میری بات کا جواب دو — یا اپنے پنڈت کو اتنی بدھی دو کہ میری بات کا جواب دے سکے۔"

پنڈت کو قبول تھا کہ مدن لعل کی باتوں کا جواب اس سے نہیں بن پڑتا۔

"تو پھر بھگوان کرشن کو چین کی بانسری بجانے دو۔ تم ہمیشہ وہی کرو جو میں کہوں۔"

پنڈت کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ مدن لعل کی باتوں میں آکر میں نے غلطی کی ہے۔ تھیلے کو ہاتھ پر لٹکائے اس کا بازو اکڑ گیا تھا۔ اس نے اسے پیٹھ پر لٹکاتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا، اب بھی واپس چلا جاؤں؟ نہیں، وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے — اس نے اپنی کلائی کو آگے کرکے گھڑی پر سے ٹائم دیکھا — سوا نو بجنے کو آرہے ہیں۔ ساڑھے نو تک مجھے وہاں پہنچ ہی جانا چاہئے — وہ تیز تیز چلنے لگا اور ابھی تھوڑی ہی دیر چلا ہو گا کہ اپنے قدموں کی طرف دیکھ کر ٹھٹھک کے رہ گیا — پٹڑی پرے بھگوان کرشن منہ سے بانسری ہٹائے بغیر اسے آواز دے رہے تھے — پنڈت! — ہو بہو وہی صورت، وہی پہناوا — وہ ہی! — بوکھلاہٹ میں پنڈت نے تھیلے کو کندھے پر سے گرنے سے بڑی مشکل سے روکا اور پھر پٹڑی پر کھنچی ہوئی رنگولی کو گھورتا رہا بھگوان کے وجود پر اور آس پاس پانچ پانچ دس دس پیسے کے کئی سکے پڑے تھے — اس کا ہاتھ لاشعوری طور پر اپنی ایک جیب میں چلا گیا جہاں ایک چونی اور دو چار چھوٹے بڑے نوٹ رکھے تھے۔ چونی کھوٹی تھی مگر پنڈت اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ سکہ کھوٹا ہو یا کھرا، جس کے پاس پہنچ جائے اسے لگا نا ہی ہوتا ہے — اس نے بڑے تعظیم سے چونی بھگوان کے قدموں میں پھینک دی اور وہاں سے پانچ پانچ پیسے سے تین سکے اٹھانے کے لئے جھک گیا — پانچ پیسے مجھے دینا ہی تھے اور اوپر کے پانچ پیسے اس لئے، کہ چونی کھوٹی ہے — مگر تین سکے اٹھانے کے بعد اس نے جلدی سے چوتھا بھی اٹھا لیا — میرے مندر میں جس نے یہ

چونی پھینکی ہوگی، کیا پتہ، وہ اسے لگانے کے لئے ہی لایا ہو اور اپنے پانچوں پانچ پیسے لے اڑا ہو۔
ارے ——— میرا سارا وقت یہیں نکلا جا رہا ہے۔ وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے ——— وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا اور جب اس کے قدموں میں آہنگ پیدا ہو گیا تو اس کے خیالات کی بے آہنگی اس آہنگ میں سمٹنے لگی۔

مدن لعل ٹھیک ہی کہتا ہے، جب ساری دنیا سڑکوں پر آ رہی ہے تو بھگوان بھی اندر پڑے پڑے چڑھاوے کی برفی کھا کھا کر اپنا خون کیوں میٹھا کر رہا ہے؟ وہ بھی پٹڑیوں پر کیوں نہ رہائش اختیار کرے؟ سیٹھ مول چند کا محتاج کیوں بنا رہے؟ ——— کیوں؟

مدن لعل پنڈت کو صرف شراب ہی نہ پلاتا تھا، بلکہ لیڈروں کی تقریریں سنانے کے لئے بھی لے جایا کرتا تھا۔ اس وقت پنڈت کو محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے اندر ایک بہت بڑے میدان میں وہ آپ ہی ہزاروں کی تعداد میں بیٹھا ہے اور اپنے آپ کو بڑے دھیان سے سن رہا ہے ——— کیوں؟
——— اس کا کیا خیال در اصل اس نشیب پر بہہ نکلا تھا کہ سیٹھ مول چند نے اس کی تنخواہ کیوں بند کر دی۔ بیس لوگ بھگوان کے درشن کو آئیں تو بڑی مشکل سے ایک روپے کا چڑھاوا جمع ہوتا ہے۔ بھگوان کا سیوادار بننے کا کیا یہی معاوضہ ہے؟ ——— اے ارجن، کام کر اور پھل کی ابھلاشا مت رکھ! ——— مگر تھوڑا بہت تو ——— "پنڈت جی۔" سیٹھ مول چند نے اس سے کہا تھا۔ "بھگت یہاں پیسے ہی نہیں چڑھا جاتے بلکہ پھل، اناج، اور بھانت بھانت کے پکوان بھی ڈال جاتے ہیں۔ فلیٹ آپ کو مفت میں ملا ہوا ہے۔ آپ کو اور کیا چاہئے؟ ——— " "تمہارا آسرا" مگر اس نے گھگھیا کر جواب دیا تھا۔ "کچھ نہیں، ان داتا!" ——— "پنڈت جی، آپ بھگوان کے نوکر ہیں، سو وہ آپ ہی روز کے روز آپ کی تنخواہ کا پربندھ کر دیتا ہے۔ میں کون ہوتا ہوں جو آپ کو تنخواہ دینے کا دعوے دار بنوں؟"

"میں آپ کا بھی بے دام نوکر ہوں، ان داتا۔"

سیٹھ خوش ہو گیا تھا۔

"آپ دل لگا کر کام کرتے رہیں، پنڈت جی۔ ہم کچھ نہ کچھ بھگوان کے چرنوں میں چڑھا جایا کریں گے۔"

بھگوان کے چرنوں میں دو روپے چڑھا کر حرام خور میری طرف اس طرح دیکھتا ہے گویا بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔ پھل کیا خاک پائے گا؟ ——— جیسے اوروں کو ان کے دھندوں کی تنخواہ دیتا ہے ویسے ہی اپنی نیک نامی کا کام بھگوان کو سونپ رکھا ہے ——— ہاتھ جوڑ جوڑ کر سارے جہان کو ———

بھگوان کو بھی اپنا نوکر بنائے ہوئے ہے۔ دشٹ کا بھلا کیسے ہوگا؟

"بھلا تو تمہارا بھی کیسے ہوگا؟" پنڈت نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ہاں، میں خواہ مخواہ مدن لعل کے چکر میں پھنس گیا۔ جو کام کرنے جا رہا ہوں اس کے خیال سے بھی ڈر لگتا ہے، مگر مدن لعل کہتا تھا، تم بے وجہ ڈر رہے ہو پنڈت۔ بھگوان کا اپدیش یاد کرو ——— جو کچھ بھی ہوتا ہے میری مرضی سے ہی ہوتا ہے، اسے میں ہی کرتا ہوں ——— سو پنڈت میرے بھائی، تم کون اور میں کون۔ ہمارا کام وہی کئے جانا ہے جو ہم کرتے ہیں۔ بے فکری سے اپنا کام پورا کرو۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

فائدہ ہو تو سارا اسی کا ہے۔ کل ہزار روپیہ ملے گا جس میں ڈھائی سو اس کا حصہ ہے اور ——— اور ——— "دیکھو پنڈت" مدن لعل کی بیوی نے اسے دھمکی دی تھی۔ "دو چار سیڑھیاں چڑھ کے خالی ہاتھ آ جاتے ہو، شرم نہیں آتی۔ اگلی بار آؤ تو میرے لئے سونے کا نیکلس لے کے آؤ، نہیں تو شور مچا کر پٹوا دوں گی۔" ——— چیز ہی ایسی ہے ورنہ کون منہ لگائے؟ ——— مگر شاید ان دونوں نے مل کر ہی یہ جال بچھایا ہو ——— مدن لعل کو خبر ہوگی کہ میں اور اس کی بیوی ——— نہیں، ایسے نہیں ہو سکتا۔ مدن لعل شریف آدمی ہے ——— مگر شریف آدمی تو میں بھی ہوں ———

پنڈت کو یکبارگی اپنے پیچھے سے چور، چور کی صدائیں سنائی دیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ اس کے عین عقب میں چند لوگ ایک آدمی کے پیچھے پیچھے دوڑے آ رہے ہیں۔ اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے چور کے آگے آگے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا اور تھیلے کے بوجھ کے باوجود آناً فاناً سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پنڈت نے جب دوڑنا بند کیا تو اپنے آپ کو ایک بڑے اعلیٰ درجے کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑا پایا اور دم لینے کے لئے تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا اور اپنے آپ سے پوچھتا رہا کہ میں نے کس کی چوری کی ہے۔ اگر پکڑا جاتا تو بے سبب شامت آ جاتی۔ وہ خیال ہی خیال میں پچھتا رہا اور گھبرا گھبرا کر مسکراتا رہا ——— جہاں لوگ چور کو پکڑنے کے لئے چور کے آگے آگے بھاگ رہے ہوں وہاں وہ در اصل آپ ہی اپنے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ اتنے فاصلے پر رکھتے ہیں کہ اپنے قابو میں نہ آ پائیں ——— کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے پیچھے واقعی کوئی نہ ہو اور میں اپنے کان بجتے ہی آپ ہی اپنے پیچھے ہو لیا ہوں؟

پنڈت نے جی ہی جی میں زور سے قہقہہ لگایا اور سامنے گیسٹ ہاؤس کا بورڈ پڑھنے لگا ——— دا گریٹ گیسٹ ہاؤس ——— ہاں، مجھے یہیں آنا تھا ——— مگر اندر جاؤں یا لوٹ جاؤں؟ ——— وہ

طے نہیں کر پا رہا تھا کہ جس کام کے لیے آیا ہوں اسے کر دوں یا کیے بغیر واپس ہو لوں ـــــ یونہی لوٹنا تھا تو آئے کیوں؟ ـــــ "تم پنڈتوں کی سدا یہی مصیبت رہی ہے ـــــ مدن لعل اس سے کہا کرتا تھا ـــــ کہ سچ بھی بولنا چاہتے ہو تو بڑے چھوٹے دل سے! ـــــ بچالی کا سچ یہی ہے کہ جیسے کوئی ہو ویسے ہی وہ کھرے کھرے کر دے ـــــ چلو اندر چلو!

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے گریٹ گیسٹ ہاؤس سے مدن لعل برآمد ہوتے ہوئے نظر آیا۔

"ارے پنڈت!" مدن لعل نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "ہم اندر تمھارے انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہو؟ چلو، صاحب خفا ہیں کہ تم ابھی تک کیوں نہیں پہنچے۔"

پنڈت اور مدن تیز تیز چل کر گیسٹ ہاؤس کے ایک دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے مدن نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

"کون ہے؟ آ جاؤ۔"

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو سامنے ہی صوفے پر بیٹھا ایک یورپی اپنے پائپ کے دھوئیں کو تیز تیز آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے بے صبری سے پنڈت کی طرف دیکھنے لگا۔

"لے آئے؟"

"ہاں۔"

پنڈت نے تھیلے سے اپنے مندر کے بھگوان کو نکال کر یورپی کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بائی گاڈ! یہ تو سچ مچ کا گاڈ ہے۔" یورپی مورتی کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھول رہا تھا۔ "پکے پتھر کا انگ انگ نور اور حسن اور زندگی میں رچ بس گیا ہے۔"

اس نے جیب سے بٹوا نکالا، سو سو کے دس نوٹ گنے اور انھیں پنڈت کی طرف بڑھا کر کہا۔

"یہ لو تمھارے گاڈ کی قیمت! گن لو!"

پنڈت نے نوٹوں کو گنے بغیر جلدی جلدی اندر کی جیب میں ٹھونس لیا۔

"ایک بات بتاؤ۔" یورپی اس سے پوچھنے لگا۔ "اپنا گاڈ تم نے بیچ دیا۔ اب تمھاری مرادیں کون پوری کرے گا؟"

"میں نے کچی مٹی پر روغن کروا کے ایسا ہی ایک نقلی گاڈ تیار کروا لیا ہے۔"

مدن لعل ہنسنے لگا۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں، صاحب۔ ہم سب لوگ اپنے نقلی گاڈ کا دیا ہی کھاتے ہیں۔" □

غیاث احمد گدّی
فتح پور لین، جھریا

آخ تھو

بکری گلّے سے کٹ کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔!

قصابوں کے لونڈے تہمد پلٹ کر کمر میں اُڑسے تشویش بھری نظروں سے گلّے کو جانچ رہے ہیں۔ دن بھر جنگل میں بکریوں کو پیڑ سے گرے ہوئے پتے چراتے ہیں، بیڑیاں پیتے ہیں، اپنے موٹے مشٹنڈے توندیلے قصابوں کو گالیاں دیتے اور آپس میں فحش مذاق کرتے کراتے تکنے لگتے ہیں کہ سورج آسمان کے پچھمی کنارے پر سُرخ طشت جیسا، ڈھلان کی طرف جھکتا دکھائی پڑتا ہے۔ یہ بات بکریاں بھی شاید سمجھتی ہیں کہ فضا میں سورج کی حکمرانی کو زوال ہوتے ہی وہ جہاں تہاں سے جمع ہو کر گلّے کی صورت میں، منہ اٹھا اٹھا کر، لونڈوں کو، کبھی قصابوں کے یہاں پہنچانے والی پگڈنڈیوں کو تکنے لگتی ہیں تب "میں۔ میں" کی آواز سے فضا بوجھل ہونے لگتی ہے۔

آج بھی یہی ہوا ـــــ

مگر آج ایک دم سے ویسا نہیں ہوا جیسا روز ہوتا ہے آج بات ذرا الگ سی ہو گئی۔ ریوڑ سے ٹوٹ کر ایک دبلی پتلی بکری الگ اونچائی پر جا کھڑی ہوئی اور غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کمزور روشنی میں ریوڑ کی دوسری بکریوں کو تاکنے لگی۔ گویا آج وہ ان میں سے نہیں ـــــ!

"ابھی تو تھی۔" ایک لونڈے نے لنگی کے اندر ہاتھ ڈال کر کھجاتے ہوئے کہا 'ہو گی' ان ہی میں ہو گی، گن کر دیکھ لو۔"

"تم گن لو...... میں نے تو گن لیا۔" دوسرا لونڈا بولا، پھر ریوڑ کی بکریوں کو دوبارہ گننے لگا، اچھی طرح سے ایک ایک کو پکڑ کر، الگ کر، کر، کے گننے کے بعد اس نے پھر کہا، ایک کم ہے......

"کم ہے پر گئی کہاں......؟" دوسرے لونڈے نے تشویش ظاہر کی، استاد تو اپنی کھال کھینچ لے گا۔

"ہاں بکریوں کو ٹیک کر جیسے ذبح کرتا ہے...... ویسے ہی۔

بالکل درست کہا تم نے......" اس کی باڑ باڑ کانپنے لگی، پر گئی کہاں......؟

بکری بلندی پر سے دیکھ رہی تھی، ریوڑ کو بھی اور چرواہوں کو بھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک آگئی

جب موٹے توندیلے قصاب نے اسے بڑھیا کے یہاں سے سود کے پیسوں کی عدم ادائگی کی صورت میں اس کی رسّی تھام لی تھی، بڑھیا گھگھیاتی رہی، لاکھ چلایا کی، "ارے میں مرجاؤں گی آدھ سیر دودھ دیتی ہے پاؤ بھر پانی ملا کر بیچتی ہوں تب دادی پوتے کا پیٹ بھرتا ہے۔ ارے خدا کی مار ہم کھائیں گے کیا..... ارے قصائی، ارے قصائی......"

مگر قصائی تو قصائی ہی تھا، ہنسنے لگا۔ دودھ ہم پئیں گے مائی ہم..... دیکھو کتنے دبلے ہوگئے ہیں ..... اور رسّی پکڑ، اسے گھسیٹنے لگا۔

دادی کو روتے دیکھ کر بے ماں، باپ کا بچہ بڑھیا کے گلے سے جھول گیا، جانے دے، جانے دے دادی، ہم روٹی نہیں کھائیں گے..... پانی پئیں گے ..... پانی۔!

"پانی۔ آنکھوں کا پانی مرگیا رے بے مروت۔ ارے قصائی کا جنا۔"

پر بے مروت قصائی تو قصائی کا ہی جنا تھا، کسی اور کا نہیں۔ رسّی کو مضبوطی سے پکڑ کر زور زور سے گھسیٹنے لگا۔ بس اسی وقت بکری کی آنکھوں میں جانے کہاں سے ذرا سا پانی آگیا اور اس میں ایسی چمک کہ گھسٹتی ہوئی بکری دیکھ کر قصاب نے پلٹ کر دیکھا تو چونک اٹھا۔

"سالی....." یہ گالی اس نے بڑھیا کو نہیں بکری کو دی۔ دیکھتی کیسے ہے؟ ——کھری جگہ پہنچے ہو جائیں تو....."

پہنچے ہو جائیں تو وہ جھپٹ کر بے مروت قصاب پر جو جھ پڑے، اور اس کی تکا بوٹی کر کے ...... بات الٹی ہو گئی نا..... لوگ بکری کو تکا بوٹی کر کے کھاتے ہیں..... مگر بکری اگر ایسا سوچ لے۔ وہ بھی تکا بوٹی کرنے والے قصاب کے لئے تو......

پر پہنچے کہاں سے ہو جائیں گے، بکری، بکری ہی رہے گی، گوشت نہیں، پتے ہی کھائے گی، ہڈی نہیں چبائے گی اور دے گی دودھ، آدھ سیر بکری کا گاڑھا گاڑھا دودھ، ذرا گرم کرو اونٹو، تو بالائی کی تہہ آجائے گی اوپر، دیکھتے دیکھتے، بالائی کی تہہ..... قصاب نے زبان کو ہونٹوں پر پھیر، مونچھوں کو تاؤ دیا ——پھر تو آنکھوں میں خود بخود چمک آگئی —— سالی یہ آنکھوں کی......

سالی یہ آنکھوں کی چمک بھی کیا چیز ہوتی ہے؟

قصاب کے طویلے میں بکری نے دو دنوں تک کچھ کھایا نہ پیا، سارا دن "میں میں" کرتی رہی، قصاب نے تھنوں کو ہاتھ لگانا چاہا تو لتاڑی جھاڑی، اچھلی کودی، تھن تھے کہ دودھ سے تنے ہوئے تھے، کسمسا رہے تھے۔ موٹے قصاب کی تلچی زبان بار بار ہونٹوں کا طواف کرکے، انھیں گیلا کرکے اندر چلی جاتی، جیسے کچھوے

کی گردن اندر گھس جاتی ہے۔

کسی نے کہا، ابھی نہیں، پرانا گھر چھوڑ کر آئی ہے، دو دن چھوڑ دو، پھسلاؤ بہلاؤ، پھر دودھ دے گی۔ دے گی نہیں تو جائے گی کہاں۔" چنانچہ موٹا قصاب چُنی کھلی، چنا، ہرے پتّے سب کچھ لاکر سامنے رکھتا گیا، مگر بکری نے منہ نہیں دھرا آخر وہ تھک گیا، زبردستی دودھ نکالنے کی کوشش کی، مگر دودھ نام کو نہیں، تھن پتھر ہو رہے تھے، بے حس، بے جان، بالکل پتھر، قصاب کے دل کی طرح!

آخر ہار مان کر قصاب نے چاروں چرواہوں کو حکم دیا، "کل سے اور بکری بکروں کے ساتھ یہ بکری بھی چرنے جائے گی، اس کے نصیب میں جو لکھا ہے وہی ہوگا، کوئی کہاں تک چمکارے، اور وہ قصاب، وہ جو کہتے ہیں کہ گھوڑے نے گھاس سے مروّت کی تو بھوکوں مرا، قصاب نے بھی بکریوں سے رفاقت کی تو.....

میں بھوکوں مرنے والا نہیں، بکری کا دودھ نہیں تو اس کا گوشت ہی سہی، چھوڑوں گا نہیں، خود بھی کھاؤں گا اور لوگو، مطلب گاہکوں کو بھی کھلاؤں گا ——دیکھ لوں گا سالی حرام جادی کو——

قصائی کی چھری——!

قصائی کی چھری سے بچ کے جائے گی کہاں——؟

کہاں——؟؟

ارے وہاں، دیکھ اس ٹیلے پر...... ایک لونڈے کی نظر پڑ گئی۔

ہاں ٹیلے پر، کتنے آرام سے بن مجود چگالی کر رہی ہے، باقی تینوں لونڈوں کی باچھیں کھل اٹھیں۔ بکری ٹیلے پر کھڑی ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی میں شرابور تھی، اور مزے سے چگالی کر رہی تھی، مگر کب تک......

لونڈوں نے چاروں اور سے گھیرا ڈال دیا، اور لگے دوڑانے، وہ کبھی بائیں دوڑتی داہنے کو مڑ جاتی کبھی دائیں کو دوڑتی دوڑتی ایک دم سے پیچھے کی طرف پلٹ جاتی۔ اور لونڈوں کی پکڑ میں آتے آتے یوں مچل کر نکل جاتی، جیسے کسی کنجوس کی ساری عمر کی کمائی پل بھر میں ہاتھوں سے نکل جاتی ہے اور وہ بے چارہ ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے......

گھنٹے بھر کی دوڑ دھوپ (یہاں صرف دوڑ ہونا چاہئے تھا، کیوں کہ آفتاب قریب قریب ڈوب چکا تھا، زیادہ سے زیادہ دوڑ دھند کہا جا سکتا ہے..... مگر یہ اُردو زبان باپ رے باپ.....) کے بعد جب بکری نے دیکھا کہ اب بچنا محال ہے، اور چاروں اور سے لونڈوں نے گالیاں دے دے کر یقین دلا دیا کہ بھاگنا، اور نکل بھاگنا بچنا اور بچ نکلنا ممکن نہیں تو بکری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھاڑیوں سے چھپے ہوئے

کھڈّے میں کود گئی۔

"گئی ــــــ!" لونڈوں کے منھ سے بے اختیار نکلا "گئی سالی لو..... ڈ..... ے میں۔"

"اور ہم گئے ماں کی اس میں" لونڈوں میں سے ایک نے کہا، کلّو استاد کھال کھینچ لے گا۔

بکریوں کو پٹک کر جیسے ذبح کرتا ہے......

بہت دیر تک وہ گردن لمبی کر کے جھانکتے رہے۔ کوئی کلبلاہٹ؟ سرسراہٹ؟؟ کوئی میں پاں کی آواز؟؟؟ کچھ نہیں۔ آخر رونی صورت بنائے بکرے بکریوں کے ریوڑ کو ہانکتے بھاگے قصاب کے یہاں۔ دل میں طوفان لئے......

"وہ قصاب۔"

"کلّو استاد۔"

"مارے گئے......"

ادھر بکری کیسے نہ کیسے کھڈّے سے نکل، پہنچی بڑھیا کے پاس، بڑھیا گھر پر نہیں تھی، پوتا تھا۔ کانٹوں سے بھری، لہولہان بکری کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگا، خوشی سے جھومتا بکری کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ بکری کی وہ ساری رگیں جو کئی دنوں سے تنی ہوئی تھیں ڈھیلی پڑنے لگیں، بکری ہواؤں میں اڑنے لگی، غبارہ کی طرح، آنکھوں میں ایسی چمک عود کر آئی گویا وہ ایک دم سے ماں ہوگئی ہو......

بڑھیا آئی تو بجائے خوش ہونے کے رونے لگی، آنکھوں سے ٹپ ٹپ پانی بہنے لگا، وہ بکری کے گلے باہیں ڈالے سسک سسک روتی رہی...... پھر تھنوں کو دیکھا جو کسمسا رہا تھا بلکہ ٹپ ٹپ دودھ ٹپک رہا تھا دوڑی دوڑی اندر سے مٹی کا آبخورہ لے آئی، تھنوں کو ہاتھ لگایا کہ سفید گاڑھا، اشتہا انگیز دودھ بھر بھر آبخورے میں گرنے لگا۔

ساری دنیا، سیاہ بدہیئت دنیا، اُجلے اُجلے جھاگوں بھرے دودھ، میں یوں نہا گئی کہ ذرہ ذرہ موتیوں کی طرح چمکنے لگا اور سفید جھاگ کے بلبلوں میں، ہزاروں آبگینوں میں، ایک ایک نہ رہا ایک ہوگیا، ایک بڑھیا کئی چھوٹی چھوٹی بڑھیاؤں کی، ایک بکری کئی ننھی ننھی بکریوں کی، اور ایک پوتا، کئی ننھے ننھے پوتاؤں کی صورت میں جلوہ گر، جھلملاتے للچاتے چہچہاتے سارے عالم میں اوپر سے نیچے، اور نیچے سے اوپر اور اُوپر، اور اُوپر نظر آنے لگے، اور یہ عالم سنگ وحشت، رنگوں، کیفیتوں، اور جذبوں، سے بھر گیا...

ادھر کئی گھنٹوں تک کلّو قصاب نے جب اچھی طرح لونڈوں کو پیٹ لیا اور ان کی ماں بہنوں سے بیک وقت رشتے جوڑ جوڑ کر تھک گیا تو اس کے دماغ میں اچانک ایک بات کوندی، پیشانی پر کنکھجورے آگئے، اس کا ہاتھ

آپ ہی آپ مونچھوں پر گیا، پھر وہ لپکا بڑھیا کے یہاں، دیکھا تو سچ مچ اس کا گمان صحیح تھا۔

تب اس نے، اس کلّو قصاب نے پہلے بڑھیا کو ایک دھکا دیا، آبخورے کو ٹھوکر ماری، پھر بکری کو ایک زوردار لات رسید کرنے کو تھا کہ اس کی آنکھیں بکری کی آنکھوں سے ٹکرا گئیں۔

"سالی حرام جادی، دیکھتی ہے کیسی......" وہ منھ ہی منھ میں بدبدایا "چل ابھی ڈنڈا کرتا ہوں.. ...." مادر چود.. حرام خور یہاں دودھ کی ندی بہا رہی ہے، کچھ کھائے پئے بغیر اور وہاں یار کے گھر میں پتھر ہوگئی تھی۔

کلّو قصاب نے کندھے سے گمچھا اتارا اور بکری کے گلے میں ڈال کر اسے طویلے کی طرف گھسیٹنے لگا ......بکری زور سے منمنائی اور دونوں پیروں ہاتھوں کو زمین میں روپ کر بیٹھ گئی، پتھر ہوگئی۔

ایک دم پتھر ہوگئی......!

مگر کلّو قصاب بھی کم نہ تھا، وہ پتھر ہوگئی تو وہ چٹان تھا، پتھر کا بھی باپ، اس نے جھک کر بکری کے آگے پیچھے ہاتھ دیئے اور جھٹکا دے کر اسے گود میں اٹھالیا، بکری چلاتی رہی، ممیاتی رہی، ہاتھ پاؤں پٹکتی رہی لیکن کلّو قصاب پھر کلّو قصاب ہی تھا۔ لوگ باگ رک رک کر دیکھتے، ٹوکتے رہے ہنستے ہنساتے گذرتے رہے۔

لوگوں کا کیا ہے وہ تو پرواز (پرندے) کو بھی نگل جاتے ہیں گلاب کے پھولوں کو بھی (گلقند) کھا جاتے ہیں۔ اور لمبی ڈکارے کر یوں مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں گویا کوئی معمولی بات نہیں، بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اب کلّو قصاب بھی بکری کو گود میں لئے یوں چل رہا تھا، لوگوں کو داد طلب نظروں سے تک رہا تھا گویا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

اس بار وہ طویلے میں آنے کے بجائے بکری کو لئے دیئے سیدھے مذبح پہنچا زور سے پٹخ کر اس پر سوار ہوگیا۔

حرام جادی،...... اب تیری خیر نہیں...... (بکری یا بکری کی ماں کب تک خیر مناتی) وہ چیختی چلاتی، ممیاتی رہی، لاکھ ہاتھ پیر مارے، لیکن سب بیکار۔ کلّو قصاب کوئی معمولی قصاب ہوتا تو شاید دو چار دنوں کے لئے...... نہ سہی گھنٹے دو گھنٹے کے لئے ضرور چھوڑ دیتا، بکری کو ذبح کرنے سے پہلے دو گھونٹ پانی ضرور پلاتا کہ رسم دنیا بھی ہے اور سنت بھی اور دستور بھی۔ مگر اس نے تو ذرا رعایت نہیں کی پاس کھڑے لونڈوں کو اشارہ کیا چمڑے کے نیام سے تیز دھار والی چھری نکالی، دھار پر انگلیاں پھیرنے کو ہوا

تو اچانک چونک گیا۔ مگر کیوں چونکا...... سمجھ نہ سکا...... ہو نہ ہو...... دھار تو کچھ زیادہ ہی تیز ہے......

لیکن جیسے ہی بکری کی گردن پر چھری پھیرنے کو تھا کہ کلو قصاب کی نظر اس کے تھن پر گئی جو دودھ کی حدت سے سرخ ہو رہے تھے، اس کی زبان آپ سے آپ ہونٹوں کی خبر لینے لگی سارے منھ میں گاڑھے ایمان کی طرح کے کھرے دودھ کا ذائقہ پھیل گیا، ہاتھ آپ سے آپ مونچھوں پر پہنچ گیا"......

"بکری کو چھوڑ دو!" اچانک اس زبان سے یہ الفاظ یوں ادا ہوئے کہ اسے خود تعجب ہوا۔

"آئیں..... کیا استاد...؟ لونڈا جو ایک ران بکری کے پچھلے حصے پر، اور دوسری گردن پر رکھے ہاتھوں سے اسے دبائے بیٹھا تھا، چھوڑ دوں''؟؟

ہاں چھوڑ دے ابھی، ہم پہلے اس کا دودھ پئیں گے...... دوڑ کر لوٹا لے آ......!

پر لونڈا لوٹا لے کر آیا، اور استاد نے بکری کو دوہنا چاہا، تو تھن پھر ایک دم سے سخت پتھرا حرام جادی مچراگئی...... اچھا دودھ نہیں تو نہ سہی ہم تیری کھیری کھائیں گے...... کھیری کھائیں گے کھیری کھائیں گے...... دودھ سے بھری کھیری......

پھر چھری لے کر گردن پر رکھ دی......

بسم اللہ حر...... رحمٰن رحیم...... یعنی شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا......

مطلوب ختم......!

یعنی آنکھوں کا تھا قصور، چھری دل پر...... گردن پر ہی سہی...... چل گئی۔

کلو قصاب نے خوب جھوم جھوم کر لطف لے کر کھال اتاری، بوٹیاں بنائیں، دل کھول کر اونے پونے دن ڈوبتے ڈوبتے سارا گوشت بیچ ڈالا۔

چلئے قصہ تمام ہوا، بہت اتفاقی تھی رنڈی...... سارا گوشت بک گیا، اب لوگ باگ مزے لے لے کر بکری کا گوشت کھا رہے ہوں گے۔ جھوم رہے ہوں گے۔ قصاب کی تعریفیں کر رہے ہوں گے......!

مگر دوسری صبح جو پہلا گاہک دوکان پر آیا، اس نے چھوٹتے ہی شکایت کی،

کیا گوشت دیا تھا کلو بھائی...... سارا دن چولہے پر چڑھا رہا مگر گلا ہی نہیں......

ہاں جی ٹھیک کہتے ہو، کلو قصاب نے منھ بنایا گلا نہیں۔ میں نے بھی نہیں......

پھر رات کو کھانے بیٹھا تو......

ہاں، کلو قصاب پہلے ہی سمجھ گیا۔

گاہک نے منھ بنایا، "منھ میں رکھا، چبایا تو ایسا کڑوا ایسا کڑوا تھو، آ

قصاب نے بھی دہرایا...... ہاں تھوہ، آخ تھوہ...... □

۳/۱۵۳ ل، جنک پوری، نئی دہلی

دیویندر اسر

میرا نام شنکر ہے

نئے مکان میں آئے مجھے چند دن ہی ہوئے تھے۔ لیکن مجھے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اس کے پاس کے لوگ میری طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کچھ دن تک مجھے یہ سمجھ میں نہ آیا کہ بھئی کون سی ایسی بات ہے کہ لوگ مجھے حیرت سے دیکھتے ہیں۔ کیا میں کوئی عجوبہ ہوں! لیکن جب ذرا جان پہچان بڑھی تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

——کیا آپ ۱۲ نمبر میں آئے ہیں۔ کسی نے پوچھا۔

——نمبر ۱۲ میں آپ ہی آئے ہیں۔ کوئی دوسرا کہتا ہے۔

——اچھا تو آپ ہی نمبر ۱۲ میں رہتے ہیں۔ کسی اور نے کہا۔

——نمبر ۱۲۔ اچھا۔ اچھا جس میں وہ صاحب رہتے ہیں۔ برساتی میں۔ ایک اور آواز تھی۔

——وہ صاحب کون؟ میں نے پوچھا۔

——وہی جو کچھ کچھ——انھوں نے ہاتھ کی انگلی اپنے سر کے قریب گھمائی۔ یعنی سنکی ہیں۔

تب بات میری سمجھ میں آئی کہ یہ حیرت میرے باعث نہیں اس شخص کے بارے میں ہے جو مکان نمبر ۱۲ کی برساتی میں رہتا ہے۔ اور تعجب کی بات یہ تھی کہ کوئی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ کتنی پراسرار ہستی تھی وہ——

اب جب میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ لوگ کچھ کچھ صحیح ہی کہتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص کو بہت کم دیکھا ہے۔ شاید بالکل نہیں دیکھا۔ محض اس کی پرچھائیں دیکھی ہے جو دن، دوپہر دھوپ میں یا رات چاندنی کی روشنی میں ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے۔ کرتے پاجامے میں یا چادر اوڑھے ہوئے۔ اور کبھی کوئی آواز نہیں سنی سوائے رات کے آخری پہر میں کبھی کبھار ستار کی ہلکی ہلکی سروں کے۔ ایسی آواز جو چھت سے دیواروں کے اندر ہوتی ہوئی میرے بستر کی سلوٹوں میں تیرنے لگتی ہے۔ اس کے کمرے کی روشنی اکثر رات کے تیسرے پہر تک جلتی رہتی ہے۔

یہ شخص کب سوتا ہے؟ کب جاگتا ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ یا کچھ نہیں کرتا! اسے کہیں آتے جاتے بہت کم دیکھا ہے۔ کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا یونہی دھوپ، چاندنی اور ہوا پانی پر زندہ رہتا ہے۔ کئی بار من چاہا کہ سیڑھیوں پر

چڑھ اس سے آمنا سامنا کروں اور اس نے اپنے اردگرد اس کا جو جال بن رکھا ہے اسے تار تار کردوں۔

لیکن ——

اور ایک روز میں نے اپنے آپ کو اس کے دروازے کے سامنے کھڑا پایا۔ بالکل غیر ارادی طور پر تو نہیں لیکن مکمل ارادی طور پر بھی نہیں۔ اس رات بارش زوروں پر تھی۔ چھت پر ٹپ ٹپ بوندوں کے گرنے کی مسلسل آواز آرہی تھی اور اس آواز میں اس کی ستار کی سروں نے مل کر ایک جادوئی اثر پیدا کر دیا تھا۔ ایسا اثر کہ آدمی نہ سو سکے نہ جاگ سکے۔ بس نیم جنون کی حالت میں سر دھن سکے۔

میں نے چائے پینے کے لئے سوچا لیکن ماچس مل نہیں رہی تھی۔ جو ملی بھی وہ شاید بارش کی بوندوں سے اتنی نم ہوگئی تھی کہ جل ہی نہیں رہی تھی۔ سوچا کیوں نہ اس سے ماچس لے آؤں۔ شاید چائے پینے کے بعد کچھ نیند آجائے۔ میں دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ بس اتنا عمل ارادی تھا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ بالکل غیر ارادی تھا۔

اس کا دروازہ نیم کھلا تھا۔ دروازے کے باہر چھت پر روشنی شیشے سے صلیب کی مانند پڑی تھی اور اس شیشے کی صلیب پر بارش کی بوندوں کا مدھما رقص جاری تھا۔ اور ستار کی سریں فرش پر پھیلتی روشنی اور بوندوں میں تھرک رہی تھیں۔ میں چند لمحے سحرزدہ اس طرح خاموش کھڑا رہا اور پھر اچانک میرا ہاتھ دروازے پر دستک کی صورت میں پڑا —— اندر آجائیے۔ آپ اتنی دیر سے باہر بارش میں کیوں کھڑے ہیں؟" اس نے کہا جیسے اسے میرے اوپر آنے کا احساس ہوگیا تھا۔ کیا عجب شخص ہے نہ کوئی خوف نہ استعجاب کہ اتنی رات گئے کون اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اجنبی۔ دوست یا دشمن چور ڈاکو، لٹیرا یا خفیہ کا آدمی مخبر!

میں دھیرے دھیرے اندر داخل ہوا۔

بیٹھئے —— اس نے کہا ——

میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ سامنے اسٹوو پر پانی کھول رہا تھا۔

—— چائے تو آپ پئیں گے ہی۔ اس نے کہا۔

یہ حکم تھا یا دعوت —— میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کرسی سے اٹھا۔ اس نے کیتلی میں تھوڑا پانی اور ڈال دیا۔ میں نے چاروں طرف ایک اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ کتابیں، تصویریں اور رنگ برنگے مختلف اشکال کے کیوبک نما پتھر، اور میز پر پائپ اور ایش ٹرے۔

وہ واپس مڑا۔ میں جیسے خواب سے چونکا۔

—— دراصل میں آپ سے ماچس ہی لینے آیا تھا۔ چائے بنانے کے لئے —— آپ ستار بہت اچھا بجاتے

ہیں۔ میں نے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔

—— آپ نے پوچھا نہیں کہ میں کون ہوں!" میں نے کہا۔

وہ پھر مسکرا دیا۔

—— اس سوال کا جواب تو میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں!"

—— میں اس ۱۲ نمبر میں نیچے والی منزل میں رہتا ہوں۔ ابھی ابھی آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

کیا میں نے کوئی غیر واجب بات کہہ دی۔

اس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا —— آپ کا کوئی نام تو ہوگا ہی۔ یا محض ۱۲ نمبر والے مکان میں رہنے والا کوئی ایک شخص ہے۔"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ بولا —— میرا نام شنکر ہے۔ اور گلی محلے کے لوگ بس اتنا جانتے ہیں کہ میں نمبر ۱۲ کی برساتی پر رہتا ہوں۔" وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا —— اور پھر اچانک بولا۔ جیسے میں حساب کا کوئی ہندسہ ہوں۔"

اس نے چائے کی چسکی لی اور خاموش ہوگیا۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

—— تو آپ کو لوگ نہیں ہندسہ ناپسند ہیں۔ میں نے کہا ——

—— جی ہاں۔ وہ لوگ جو محض ہندسہ بن کر رہ گئے ہیں۔" وہ ۱۲ نمبر کے مکان میں رہتا ہے۔ وہ تین لڑکیوں والا —— وہ جو ۲۰۷ نمبر کی بس پر جاتا ہے —— ہمارا پورا سماج، ہمارا تمام کلچر۔ نظم و نسق چلانے والی مشین، اخبار نویس، اہل دانش —— سب کے سب نے سازش کر رکھی ہے کہ وہ ہر شخص کو ایک ہندسے میں بدل دیں۔ اس کا نام، اس کا چہرہ، اس کی شخصیت، اس کا دل دماغ، احساس، فکر محض ایک ہندسہ بن کر رہ جائے۔ کیا یہ ماتم کا مقام نہیں کہ اخبار والا جو برسوں سے مجھے اخبار دے رہا ہے وہ بھی جب بل لاتا ہے تو اس پر لکھا ہوتا ہے —— "شریمان نمبر ۱۲ جی ——"

اس کے اندر کی جمی ہوئی برف جیسے پگھل کر باہر آرہی تھی۔

لیکن آپ کو یہ احساس کب ہوا۔ اور اس بارے میں آپ زود حس کیوں ہیں۔ یہ تو عام رواج ہے۔ کام کاج کو سہل ڈھنگ سے چلانے کا۔ میں نے کہا

وہ جیسے ماضی میں کھو گیا۔

چند برس پہلے کی بات ہے۔ میں بہت زیادہ بیمار ہو گیا تھا۔ اور مجھے ہاسپٹل داخل ہونا پڑا۔ وارڈ نمبر ۴ بستر نمبر ۹۔ ایک روز میری حالت اچانک خراب ہو گئی۔ سانس کی رفتار جیسے رکنے لگی۔ میرے پہلے میرا کوئی عزیز دوست، رشتے دار نہیں تھا۔ میں نے نرس کو بلایا۔ وہ آئی میری حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی۔ اس نے ڈیوٹی پر ڈاکٹر کو فون کیا۔ بیڈ نمبر ۹ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ شاید کارڈیک ایولیٹ کا خطرہ ہے۔ "میرے جسم میں جیسے ایک دم سے جان آ گئی۔ سسٹر۔ بیڈ نمبر ۹ کی حالت خراب نہیں۔ میری حالت خراب ہے۔ میرا نام شنکر ہے۔" ہاں ہاں۔ بیڈ نمبر ۹ کے مریض مسٹر شنکر کی حالت خراب ہے۔ اس نے کہا۔ جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں سوچنے لگا کہ میں محض وارڈ نمبر ۴ کا بیڈ نمبر ۹ ہوں۔ میرا کوئی نام نہیں، کوئی چہرہ نہیں، کوئی احساس نہیں، کوئی شخصیت نہیں، کوئی شناخت نہیں سوائے ایک ہندسے کے۔ جوں جوں میں سوچتا جاتا میرا اضطراب بڑھتا جاتا۔ میرے ماں باپ نے مجھے شنکر نام دیا ہے۔ مجھے یہ نام پسند بھی ہے۔ لیکن اسکول میں محض رول نمبر ۱۱ بن کے رہ گیا۔ رول نمبر ۱۱ یس سر آج رول نمبر ۱۱ نہیں آیا۔ یس سر۔ ہندوستان چھوڑو تحریک میں میں چند روز کے لئے جیل بھی گیا۔ وہاں میں قیدی نمبر ۵ تھا۔ جس جس مکان میں رہتا رہا اس کا نمبر مجھ سے لپٹتا چلا گیا۔ کہاں تک یہ داستان امیر ہندسہ سناؤں، یہ داستان بہت لمبی ہے۔ ریاضی کی پوری کتاب ہے۔ میں جب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو میرے چہرے پر بے شمار ہندسے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم ہوتے ہوئے کوڑوں کی ضربوں کے نشانوں کی طرح ابھر آتے ہیں۔

آخر تنگ آ کر میں نے اپنے ہی نام کی چادر پرنٹ کروالی۔ لوگ رام نامی اوڑھتے ہیں اور میں شنکر نامی۔ حالانکہ میں دشنومت کا ماننے والا ہوں۔ لیکن شنکر نامی کے باعث شیومت کا پیروکار بن گیا۔

میں نے اب غور سے دیکھا کہ جو چادر وہ اوڑھے ہوئے ہے اس پر مختلف زبانوں میں شنکر شنکر لکھ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ فرنچ، جرمن، روسی۔ اسپینی اور انگریزی میں بھی۔ اس نے چائے کی آخری چسکی لی اور پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے پائپ سلگایا۔ وہ کرسی سے اٹھا۔ سامنے شیلف سے ایک کتاب اٹھا لایا۔ اور ورق الٹتے ہوئے ایک جگہ رک گیا۔

میرے قریب آؤ ـــــ اور قریب۔ اس کے ایک ہاتھ میں کتاب تھی اور دوسرا ہاتھ اس نے میرے کندھے پر رکھا ـــــ سنو ـــــ دشنود گبر ـــــ "

ـــــ میں دشنود گبر نہیں، لشن دیال ہوں۔" میں نے کہا۔

ـــــ خیر دشنو مہاراج جی ـــــ سنو شنکر کیا کہتا ہے

"مہذب تواریخ میں پہلی بار شاید تمام تواریخ میں پہلی بار ہم اس دبائے ہوئے علم کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور کئے گئے ہیں کہ ہماری شخصیت کا سب سے چھوٹا رخ، یا ہمارے خیالات کا سب سے مختصر اظہار یا خیالات کی عدم موجودگی اور شخصیت کے فنا کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اعداد و شمار کے ایک وسیع عمل میں ایک صفر

کی موت پر مجبور نہیں۔ جہاں ہمارے دانت گنے جائیں گے، ہمارے بال محفوظ رکھے جائیں گے لیکن ہماری موت بغیر نام، بغیر تنظیم اور بغیر دکھ کے رہے گی۔ موت کسی کینسر وارڈ میں ہو یا ریڈیو ایکٹو شہر میں۔ آج اس تہذیب نے انسان کی حالت کے لئے آئینہ پیش کیا ہے اور جس نے بھی اس میں دیکھا وہ اندھا ہو گیا ـــــ وہ اندھا ہو گیا ـــــ" اس نے دہرایا

اس نے اپنے گرد سے شنکر نام کی چادر ہٹا کر پرے رکھ دی۔ اور میرے سامنے بالکل سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ میری نبض تیز تیز چلنے لگی دل کی دھڑکنے اور تیز ہو گئی۔ اور رگوں میں خون جیسے تیز و تند سیلاب کی مانند امڈنے لگا۔ اور جیسے جو کچھ بھی میرے اندر ہے جسم کی حدوں کو توڑ کر باہر آنے کے لئے بے تاب تھا۔ سب کے سب بند ٹوٹنے والے تھے۔

ـــــ اچھا شنکر میں چلتا ہوں پھر کبھی آؤں گا۔ میں باہر کی طرف لپکا۔ وہ اس طرح سیدھا تن کر کھڑا تھا شولنگ کی طرح، یونی سے اٹھتا ہوا۔ آکاش کی طرف بڑھتا ہوا ـــــ باہر دروازے سے نکلتی روشنی میں اس کی پرچھائیں فرش پر بے حرکت پڑی تھی اور اس پر بارش کی بوندوں کا ابدی رقص ابھی تک جاری تھا ـــــ ▢

رام لعل
شانتی نکیتن، ڈی ۲۲۹۰ رام ساگر مرا نگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰

کئی سال پہلے کا وہی دن

بیشتر زخم وقت کے ساتھ ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑ جاتے۔

یہ جملے سریتا کے پتی نے ہنستے ہنستے کئی بار کہے ہیں۔ پتہ نہیں اس کا مقصد کیا ہوتا ہے یہ وہ آج تک نہیں جان سکی۔ اس کے ساتھ اس کے پانچ سال بیت چکے ہیں۔ لیکن اسے یہ یقین نہیں ہو سکا مہندر نارنگ نے کبھی کسی سے واقعی محبت کی ہوگی! پشپا اس کی زندگی میں بیس سال پہلے آئی تھی۔ اس سے بھی وہ محبت کا اظہار نہیں کرتا۔ لیکن پشپا نے اس بات کی کبھی شکایت بھی نہیں کی۔ وہ اسی بات سے مطمئن نظر آتی ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ سریتا تو بہت بعد میں آئی ہے۔ اس کے ساتھ بھی اس کی شادی محبت کا نتیجہ ہرگز نہیں تھی۔ ہندوستان میں بیشتر لوگ شادی کے بعد ہی محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نارنگ نے تو یہ دعویٰ بھی ابھی تک نہیں کیا ہے وہ دونوں بیویوں کی موجودگی کو گھر کے بہت ضروری سامان کی طرح سمجھتا ہے۔ فرنیچر، فرج، ٹی وی، قالین، موٹر کار وغیرہ کی طرح۔ اور جس طرح وہ ان ساری چیزوں کی دیکھ ریکھ کرتا ہے اسی طرح پشپا اور سریتا کی بھی۔ دونوں کی صحت ٹھیک رہنی چاہئے، دونوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے اور گہنے وغیرہ ملتے رہنے چاہئیں اور وہ اپنی من پسند غذائیں پوری آزادی سے کھا سکیں اور اپنے اپنے رشتے داروں سے بلا روک ٹوک مل سکیں۔ اور وہ دونوں کے ساتھ اس قدر نرمی اور شفقت سے پیش آتا ہے کہ انھیں ایک لمحے کو بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ان پر دل و جان سے فدا نہیں ہے۔!

سریتا نارنگ نے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے اس کی ان ساری خصوصیات کا اندازہ کر لیا تھا۔ اور یہی سوچا تھا کہ وہ پوری طرح مطمئن رہے گی۔ جب اسے یہ تک یقین دلا دیا گیا تھا کہ پشپا نارنگ اپنی سوت کے ساتھ حسد نہیں کرے گی تو وہ اس سمجھوتے کو قبول کیوں نہ کرتی۔ اسے ایک پتی کی سخت ضرورت تھی۔ ایسے ہی ایک پتی کی جس کے پاس سب کچھ ہو۔ وہ اسے مل چکا تھا۔ لیکن وہ ہر خوبصورت اور جوان بیوی کی طرح یہ بھی گھات لگائے رہی کہ رفتہ رفتہ اپنے آدمی پر پورا قبضہ کر ہی لے گی۔ جو عمر میں اس سے تیس برس بڑا ہے۔ بڑی عمر کے پتی زیادہ بھوکے ہوتے ہیں۔ وہ جوان بیویوں پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ وہ اس کی بڑھیا کو بڑی آسانی سے کسی روز ایک الگ

کونے میں ڈال دینے میں کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی اور صدمہ بھی پہنچا کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ اس کی حیثیت گھر میں ایک جونیئر والف کی ہی ہے جسے ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے وہ کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت یہ اس کے لئے ایک شکست ہے۔ اس کی انا کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اسی کشمکش سے بچنے کے لئے اس نے پھر سے یونیورسٹی کی ملازمت لے لی تھی۔ جسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے وہ اس گھر میں آئی تھی۔ لیکن اب وہ روزانہ پڑھانے کے بہانے سے اس ماحول سے چند گھنٹوں کے لئے دور چلی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کی مصروفیات نے رفتہ رفتہ اسے ایک دوسری راہ پر ڈال دیا ہے۔ جس میں صبر و سکون ہے اور ایک اینالیٹیکل طریقے سے ساری باتوں پر غور و فکر کرنے کی تحریک بھی مل جاتی ہے۔ جب کبھی وہاں کوئی فنکشن ہوتا ہے اور مہندر اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ کبھی کبھی اسے وہاں ڈراپ کرنے کے لئے یا واپس لے جانے کے لئے آ جاتا ہے تو اسے اچانک اپنا وجود بہت اہم لگنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس کے سامنے کسی کی ملکیت ہونے کے احساس میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ان لمحوں کو یکسر فراموش کر بیٹھتی ہے کہ اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے!

گھر لوٹ کر وہ ایک تکلیف دہ معمول میں پھنس جاتی ہے۔ ایک اس کا اپنا کمرہ ہے جہاں اس کی تعلیمی کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہیں، ایک آرام دہ صوفہ ہے، ایک رائٹنگ ٹیبل ہے جس پر ہر وقت ایک ٹائپ رائٹر اور بڑے سے خوبصورت شیڈ والا لیمپ پڑا رہتا ہے اور اسی میز کے قریب اس کا ایک چوڑا آرام دہ پلنگ پڑا ہوا ہے۔ جس پر وہ اکثر و بیشتر تنہا ہی ہوتی ہے۔ مہندر کبھی کبھی اچانک آ بھی جاتا ہے تو زیادہ دم تک نہیں رکتا۔ اور اس کمرے کے ساتھ ہی ملحق اس کا اپنا صاف ستھرا باتھ روم ہے۔ اور اس کمرے کے باہر لمبا سا گول برآمدہ ہے اور ایک شاندار ڈائننگ روم ہے جہاں گھر کے سارے افراد مقررہ وقت پر گانگ کی آواز سنتے ہی ناشتے اور کھانے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور پھر وہ بھی اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اتنے بڑے گھر کے سارے ملازم بھی گھر کے اصولوں اور ضابطوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہر شخص ایک خاص مقررہ تنخواہ پاتا ہے اور ایک خاص مقررہ ڈیوٹی سر انجام دیا کرتا ہے۔ اور وہ سب بھی اس ٹھنڈے گھریلو نظام سے پوری طرح مطمئن نظر آتے ہیں۔ اس گھر کے دونوں الیشیشین تک بڑی خاموشی سے گھومتے رہتے ہیں یا زنجیروں سے بندھے ہوئے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ اس نے کبھی کسی کی اونچی آواز نہیں سنی ہے۔ کسی کو کسی بات پر پروٹسٹ کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ پروٹسٹ تو اس نے بھی کبھی نہیں کیا۔ لیکن اس کے اندر ایک احتجاج یقیناً موجود رہتا ہے۔ بھلے ہی وہ اسے دبا کر رکھتی ہے اور کسی سے کچھ نہیں کہتی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی ہے مہندر نے اس کے ساتھ شادی کیوں کی ہے، وہ اس گھر میں نہ آئی ہوتی تب بھی

اس گھر کے معمولات میں ذرا سا بھی فرق نہیں آتا۔ مہندر نے اسے بیوی بنا کر اپنی کون سی ضرورت پوری کر لی ہے؟ اس کے گھر میں اتنے زیادہ شو پیس موجود ہیں۔ ان میں ایک اور اضافہ نہ ہوا ہوتا تو کون سا بڑا فرق پڑ جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کے مہمانوں کے ساتھ بڑی اچھی گفتگو کر لیتی ہے۔ پولٹکس، سماجیات اور کبھی کبھی لٹریچر پر بھی۔ اگر کوئی مہمان واقعی اس ذوق کا مالک ہوتا ہے۔ مہمانوں میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ خالص تجارتی ذہن کے اونچی سیاسی سطح کے، پروونشیل بیوروکریسی سے قریبی تعلق رکھنے والے اور کبھی کبھی کوئی منسٹر یا گورنر بھی آنکلتا ہے۔ اسے اپنے مہمانوں کے ساتھ تو گفتگو یا ان کے درمیان اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر نارنگ واقعی بہت خوش نظر آتا ہے لیکن وہ اسے بار بار اس طرح خوش کر کے بھی اس پر اپنا قبضہ نہیں جما پاتی ہے۔ وہ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی پھر وہی کچھ بن جاتا ہے جو کچھ وہ ہے ایک باوقار، متین، مہذب اور خاصا آسودہ لینڈلارڈ۔ جس کی جائیداد بہت بکھری ہوئی ہے۔ بڑے بڑے لان اس نے رہائش یا تجارتی بلڈنگوں میں تبدیل کر دیئے ہیں۔ بہت کچھ نیچ بھی چکا ہے۔ سیلنگ کے ڈر سے۔ شاید سیلنگ کے ہی ڈر سے مہندر نے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ تاکہ ایک اور پارٹنر بن جائے۔

اُسے یاد ہے کہ ایک روز مہندر نے اسے صبح سویرے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ اس وقت وہ ایک میز کے سامنے بیٹھا حسب معمول شیو بنا رہا تھا۔ شیو بناتے بناتے وہ اس کے ساتھ جائیداد کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کرتا تھا۔ جس بلڈنگ کو اس نے ایک کمرشیل بینک کے حوالے کر رکھا تھا اسی کو وہ اس کے نام لکھ دینا چاہتا تھا۔ وہ جائیداد کی اتنی بھوکی نہیں تھی اس لئے وہ اس کی ساری گفتگو بھی نہیں سن سکی تھی۔ اس کی نظر شیونگ کریم کی ٹیوب پر ٹکی رہتی تھی جسے اس نے انجانے ہی میں ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔ ٹیوب کے اندر آدھی سے کم ہی کریم ہوگی لیکن اس کے بیرونی حصے پر کوئی شکن نہیں پڑی تھی۔ جس طرح وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کا عادی تھا ویسی ہی احتیاط ٹیوب جیسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو استعمال کرنے میں بھی برتتا تھا۔ ایسی ہی شیونگ کریم کی ایک ٹیوب کو اس نے کئی برس پہلے آدرش کے پاس دیکھا جو بالکل مڑی تڑی ہوئی تھی اور اس کی ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کی بھی ویسی ہی گت بنی ہوئی تھی۔ اس نے آدرش سے مصنوعی غصے سے پوچھا تھا۔ اُفوہ تم کس قسم کے وحشی ہو! اتنی نرم و نازک چیزوں کو بھی ایسی بے رحمی سے استعمال کرتے ہو!"

آدرش بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا ——— "تم نے شاید ان چیزوں میں اپنے آپ کو دیکھ لیا ہے سچ سچ کہنا، تم ڈر گئیں نا کہ کہیں میں تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک نہ کروں؟"

وہ خاموش سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ آدرش نے جو کچھ کہا تھا ممکن ہے سچ نکلتا۔ لیکن یہ بھی تو ایک سچ تھا کہ

وہ بہت زیادہ وحشی واقع ہوا تھا۔ وحشی اور مطلب پرست۔ جب اس نے آدرش کے سامنے شادی کا سوال رکھا تو وہ اپنے خاندان بھر کے بکھیڑے لے بیٹھا۔ فلاں فلاں بھائی بے حد دقیانوسی واقع ہوا ہے۔ میری فلاں موسی میرے خلاف طوفان برپا کر دے گی، اور میرے بیوی بچے تو میری اس حرکت کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے میرا لڑکا جو بے حد ابنارمل واقع ہوا ہے میری جان ہی لے لے ——— کیا تم چاہتی ہو میں مار ڈالا جاؤں؟ میرے بغیر تم میرے گھر میں کیسے رہ پاؤگی! سوچ لو۔"

سریتا کو یہ سوچنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی تھی وہ ایک بہت بڑا سماجی بزدل تھا ——— ڈیم سوسائٹی کا ورڈ! مڈل کلاس سوسائٹی میں زیادہ بہادر عاشق شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اس طبقہ کا آدمی صرف تماشہ دیکھتا ہے بڑی اپنٹکوئل قسم کی بحث کر لیتا ہے اور خوش بھی رہتا ہے۔ محبت کرتا ہے تو محض شغل کے طور پر۔ جس میں کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ خطرہ ہو بھی تو وہ اس کی محبوبہ ہی کیوں نہ اٹھائے! وہ ایک عرصہ تک اسے ایک رکھیل سمجھ کر اس سے ملتا رہا تھا۔ جب جی چاہتا اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ دو چار روز رہنے کے لئے ایک ٹورسٹ لاج میں کمرا بک کرا لیتا تھا۔ معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کے لئے یہ کھیل بہت دلچسپ بن جاتا ہے۔ وہ اسے ایک اڈونچر سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں۔ کیوں کہ وہ فطرتاً اڈونچرس ہی ہوتی ہیں۔ انھیں بچپن ہی سے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکیں گی ——— ماں باپ بھی انھیں ہر وقت یہی احساس دلاتے رہتے ہیں۔ بہت زیادہ محبت کرتے ہیں، بہت اچھے کپڑے دیتے ہیں، بہت اچھی تعلیم و تربیت بھی کہ دوسرے گھر میں جا کر ہمیشہ خوش و خرم رہ سکیں۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ اڈجسٹ کر سکیں۔ اور ان کا نام بھی روشن کر سکیں کہ وہ فلاں گھر کی اولاد ہیں! جو ماں باپ خود ان کے لئے رشتہ نہیں تلاش کر پاتے ان سے یہ توقع بھی رکھنے لگتے ہیں کہ وہ خود اپنا ساتھی تلاش کر لیں گی۔ اس قدر کشادہ دل ہونے کے اشارے وہ کئی موقعوں پر دیتے رہتے ہیں۔ سریتا اپنی زندگی کی بے شمار سوچوں کا سمندر پار کر کے آدرش تک پہنچی تھی۔ لیکن اس کا رویہ کسی مچھلی کو نگل لینے کا ہرگز نہیں تھا ——— آدرش ایک مچھلی جیسا بھی ہرگز نہیں تھا۔ ایک خوش شکل، خوش اطوار اور اعلےٰ تعلیم یافتہ ادھیڑ عمر لیکچرار تھا۔ دونوں کی ملاقات ایک یونیورسٹی کے تعلیمی سیمینار میں ہو گئی تھی۔ اور وہ بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ شروع کی ملاقاتوں میں آدرش نے اسے یہ تاثر ہرگز نہیں دیا تھا کہ وہ سماجی طور پر حد درجہ محتاط واقع ہوا ہے۔ وہ اسے لمبے لمبے محبت بھرے خط لکھا کرتا تھا۔ اس کے شہر میں آ جاتا تو اس کے ساتھ گھومنے پھرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھاتا تھا۔ اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو ——— اس کے پیچھے جو کچھ بھی تھا ——— بیوی، بچے، پوری دنیا ——— اس سے جیسے دور ہو جانے کے لئے ہی سریتا کے پاس چلا آتا ہے۔ سریتا نے اسے اس حیثیت سے بھی قبول کر لیا تھا۔ اس نے کسی نوجوان مرد کے خواب دیکھنا ترک کر دیا

تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا اب اس کی منزل بھی مرد ہوگا جو کسی روز اچانک اپنی بیوی اور بچوں سے الگ ہونے کے مسائل پر اس کے ساتھ گفتگو لے بیٹھے گا۔ وہ اس قسم کی گفتگو میں حصہ لینے کے لئے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھی لیکن اس نے ایسی گفتگو کبھی نہ چھیڑی جس کے لئے اس کے کان ہمیشہ ترستے رہے۔ اگرچہ یہ سوچ سوچ کر اسے دکھ بھی ہوتا تھا کہ آدرش اسی جیسی ایک عورت کو چھوڑ کر اس کے پاس آنے کے لئے تیار نظر آتا ہے جو اس کے ساتھ کئی برس سے رہ رہی ہے۔ وہ اس سے بھی بے پناہ محبت کرتا ہے کیوں کہ اس نے کبھی بھول کر بھی اپنی بیاہتا بیوی کی برائی نہیں کی ہے۔ اس کے بنے ہوئے سوئٹر، اس کی پسند کے خریدے ہوئے کپڑے وغیرہ ہر چیز بڑے فخر سے اسے دکھاتا ہے اور پھر عجیب طرح سے خاموش بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اس سوچ میں مبتلا ہو کہ وہ اس دوسری عورت کی بھی بہت سی باتیں پسند کرنے لگا ہے۔ رہن سہن اور کپڑوں وغیرہ کی پسندیدگی بھی ایک طرح سے محبت ہی ہوتی ہے۔ محبت کا ایک فطری اور جذباتی اظہار! ــــ ایک دوسرے کے دل تک پہنچنے کے لئے کئی راستے ہیں، کئی پگڈنڈیاں اور کئی سیڑھیاں ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے صرف پھولوں کے تحفے لے کر نہیں آتے، اپنی اپنی آنکھوں میں محبت کی قندیلیں ہی روشن کئے ہوئے ایک دوسرے سے نہیں ملتے، نہ ہی ان کے لئے ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کے لئے جسموں کی کشش اور گرمی اور خوشبو کافی ہوتی ہے ــــ ان کے لئے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے، وہی کچھ جو ہر آدمی کی زندگی میں اس کے آس پاس ہوتا ہے ــــ آدرش کے آس پاس جتنا کچھ تھا اسے سریتا مختلف اوقات میں دیکھتی اور پرکھتی رہی تھی ایک بار وہ خوب گہری نیند میں اپنی بیوی کو نام لے کر پکار اٹھا تو اس نے چونک کر پوچھا تھا ــــ "تم نے ابھی اپنی بیوی کو پکارا نا!"

آدرش کتنے لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا سا رہ گیا تھا۔ نیم بیداری کے عالم میں۔ جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ کیا جواب دے۔ وہ اسے سینے کے ساتھ لپٹا کر پھر سو گیا تھا۔ لیکن وہ سوچتی رہ گئی تھی کہ آدرش بہت بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ اس سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی اپنی بیوی سے ــــ ایک آدمی بیک وقت دو عورتوں سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ ایک ہی شدت سے ــــ جس طرح وہ اپنے مرد ساتھیوں سے محبت کرتا ہے کئی کئی مرد ساتھیوں سے محبت اس کے لئے سماجی مسئلہ نہیں بنتی۔ لیکن ایک سے زیادہ عورتوں سے محبت یقیناً مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس معاملے میں عورت بھی آزاد نہیں ہے۔ یہ بندھن پرانے ہیں اور خود انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں جنھیں توڑنے کے لئے وہ ترستا ہے لیکن ایسا کر نہیں پاتا۔ آدرش نے اس کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے کے لئے ایک ہی راستہ تجویز کیا تھا ــــ کہ وہ اسی طرح ملتے جلتے رہیں لیکن سریتا نے اس پروپوزل کو ریجکٹ کر دیا تھا۔ وہ اسے باعزت نہیں سمجھتی تھی۔ وہ خود بھی ایک سماجی بزدل تھی۔ سماج کے ساتھ دور تک لڑنے کی اس

کے اندر بھی ہمت نہیں تھی۔

ایک روز سریتا کو اپنی پرانی یونیورسٹی سے خط ملا۔ جہاں سے اس نے ایم اے کیا تھا پھر وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی اور وہیں اس نے کچھ عرصہ تک لیکچرار کے طور پر ملازمت بھی کی تھی ــــ وہاں اسے ایک کلاس کا وائیوا لینے کے لئے جانا تھا۔ اس نے سوچا ماحول میں تبدیلی کے لئے یہ موقعہ اچھا ہے۔ اس نے اپنے ہسبنڈ کو بتایا تو اس نے اسے فوراً اجازت دے دی۔ اس کے لئے ہوائی جہاز سے سیٹ بھی بک کرا دی اور جس روز اس کی فلائیٹ تھی مہندر نارنگ اسے خود ہی گاڑی میں بٹھا کر ایرپورٹ پر چھوڑ گیا۔

اپنے پتی سے چند روز کے لئے دور ہو جانے میں اسے بڑا سکون ملا۔ جیسے ایک لمبی قید سے پیرول پر رہائی مل گئی ہو۔ اسے اسی ماحول میں پھر واپس چلے جانا ہوگا ــــ جس میں بے پناہ گھٹن تھی۔ بے حد حسین تھا۔ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں پہنچ کر اسے یاد آیا آج تو سترہ اپریل ہے۔ کئی برس پہلے وہ اسی روز ٹورسٹ لاج میں پہلی بار آدرش سے ملی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس واقعہ کو آٹھ برس سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے بعد میں بھی ملتی رہی اور کبھی کبھی انھیں وہی کمرہ مل گیا۔ کبھی کبھی نہیں ملا۔ کسی کے لئے پہلے سے بک ہو جانے کی وجہ سے۔ لیکن اس کمرے کی یاد اس کے دل سے کبھی نہیں نکل پائی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہاں وہ پہلی مرتبہ ایک لڑکی سے عورت بنی تھی۔

سریتا کا جی چاہا اگر وہی کمرہ مل جائے تو وہ وہیں جا کر قیام کرے۔ اپنا سامان ساتھ لے جانے سے پہلے یونہی ٹہلتی ہوئی نکل پڑی۔

اسی راستے پر کئی بار آدرش کے ساتھ چہل قدمی کر چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف یونیورسٹی کے ٹیچروں کے بنگلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لان اور خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے یوکلپٹس اور رات کی رانی کے پیڑ اور پھولوں کی کیاریاں اور دیواروں سے لپٹی ہوئی بیلیں۔ کہیں کہیں ٹیچروں کی سادھارن سے وستروں میں بیویاں، کوئی جوان، کوئی ادھیڑ، اور ادھر ادھر کھیلتے ہوئے ان کے بچے۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں کھیت اور ان میں دھان کی پنیری لگاتے ہوئے کسان۔ سڑک پر جو بھی رکشا نکلی تو اس نے اس کے چالک کی اور چونک کر دیکھا۔ شاید کوئی اسے جاننے والا مل جائے۔ جو اسے ہاسٹل سے ڈپارٹمنٹ یا بستی میں لے کر جایا کرتا تھا اسے کئی رکشا چالکوں کے نام یاد تھے۔ سُندا، رام بلاش کرجی، جہانگیر، نتائی۔ نتائی اگرچہ پہاڑی تھا لیکن اسے بہت سے بنگالی گیت یاد تھے۔ ہاسٹل کی لڑکیاں اسے وزٹنگ روم میں بلا کر اس سے گیت سنا کرتی تھیں۔ وہ گیت گاتے گاتے رو پڑتا تھا تو لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی مسکرانے لگتی تھیں ــــ کوئی پوچھتی ــــ "اچھا نتائی دا، بولو تو، تمار کی کا دو شونگے بھالو باشا چھیلو؟ ــــ نشچے اڑی چھیلو نا!" "نتائی کو پہاڑن پسند نہیں کرتی ہوگی ــــ! اس کا پتہ بتادے

تو ہم تیری سفارش کر سکتی ہیں۔"

بتائی اپنی آنکھیں پونچھتے پونچھتے کہہ اٹھتا تھا۔ "—— تم کیا جانو پریم کیا ہوتا ہے۔ ایتاتے کارو سفارش چولے نا —— اچھا تم لوگ ایک گیت اور سنو ——

جو دی تارے نائیں چینی گو
سیکی آمائیں نیبے چینے
ایٔی نو بو پھاگنیر دینے
جانی نے
جانی نے

اگر اسے ہم نہ پہچان پائے، کیا وہ مجھے پہچان جائے گا، نئے پھاگن میں! معلوم نہیں، معلوم نہیں،

کبھی کبھی اس کا گیت ختم ہی نہیں ہو چکتا تھا کہ وہاں اچانک سپر دیدی پہنچ جاتیں۔ ان کی ڈانٹ پھٹکار شروع ہونے سے پہلے ساری لڑکیاں جلدی جلدی اپنے کمروں کو کھسک لیتیں۔ پھر شامت بتائی بچارے کی آجاتی تھی۔ لیکن وہ کسی کی شکایت کرنے کے بجائے سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکل جاتا تھا۔ وہاں اپنی رکشا کا تالا کھول کر اسے آگے بڑھائے جاتا۔

سریتا کو بتائی پر بہت ترس آتا تھا۔ پتہ نہیں کیسے یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ وہ کسی پہاڑن سے عشق نہیں کرتا ہے۔ اسے یونیورسٹی کی ہی لڑکیاں پسند ہیں جو ہر سال وہاں آتی ہیں کچھ چلی جاتی ہیں کچھ اگلے چند برسوں کے لئے رہ جاتی ہیں۔ انھیں کئی کئی سال تک اپنی رکشا پر بٹھا کر دوڑتا رہتا ہے۔ ان میں کسی کے بھی ساتھ اس کا رشتہ جڑنے کا امکان نہیں ہوتا —— پھر وہ ان سب کو من ہی من میں چاہتا رہتا ہے۔ وہ سب مل کر ایک ہی پورے چہرے کے مانند اس کے دل میں دماغ میں بسی رہتی ہیں —— وہ اس چہرے کا کوئی ایک نام بھی نہیں رکھ پاتا۔ اس کی کوئی ایک شکل بھی قائم نہیں کر سکتا۔ بس ایک تصور کے سہارے وہ جی رہا ہے اور اسی کو گیت سنا سنا کر رجھاتا رہتا ہے۔

سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے سریتا نے چھوٹی چھوٹی دوکانوں کی طرف دیکھا جہاں وہ اکثر آیا کرتی تھی —— پروویژن اسٹور، کلاکیندر، دستوبھنڈار، کیمپ شاپ جس کے بوڑھے مالک سے لڑکیاں نرودھ اور سینیٹری ٹاولز بلا جھجک خرید لاتی تھیں، ایک چھوٹا سا ایرکولاٹی ہاؤس، چمڑے سے منڑھے ہوئے بانس کی مضبوط تیلیوں کے چھوٹے چھوٹے موڑھے اور ایک ماسک ہاؤس، جس کے اندر مختلف جانوروں کے علاوہ درگا، راون اور کئی دیوی دیوتاؤں کے پلاسٹک کے بنے ہوئے رنگ برنگے مکھوٹے دیواروں پر اور شوکیسوں میں سجے رہتے تھے

اور وہاں جاکر ایسا لگتا تھا ان سارے مکھوٹوں کے حقیقی کردار انھیں وہاں ڈیپازٹ کر کے چلے گئے ہوں۔ پھر کبھی نہ لوٹ آنے کے لئے۔

سریتا بے اختیار اس دوکان کے اندر چلی گئی۔ ماسک بیچنے والی ایک عورت تھی۔ وہ ایک کونے کے شوکیس پر جھکی اخبار پڑھنے میں مصروف تھی۔ یہ وہی عورت تھی جو گاہکوں کی طرف اسی وقت نظر اٹھاتی تھی جب وہ اپنی پسند کا ماسک خرید کر اس سے دام پوچھتے تھے۔ اسی دوکان سے آدرش اور اس نے بھی دو ماسک خریدے تھے۔ اور اپنے چہرے پر لگا کر خوب ہنسے تھے۔ ماسک کے پیچھے ان دونوں کی شخصیتیں بالکل چھپ گئی تھیں۔ اس نے ایک اساطیری دیوی کا ماسک پھر سے انتخاب کر لیا۔ اور اسے دام دے کر واپس آگئی۔

وہ ٹورسٹ لاج کو جانے والی سڑک پر مڑی تو اس کی نظر ایک بہت بڑے سائن بورڈ پر جا ٹکی۔ سائن بورڈ اسے گوشت پوست کے ایک زندہ انسان کی طرح لگا۔ مسکراتا اور لاج کی اور جانے کے لئے اشارہ کرتا ہوا —— وہ گھبرا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ جیسے اس نے اسے پہچان لیا ہو۔

کاؤنٹر پر ایک بنگالی دادا دونوں نتھنوں میں نوشی چڑھا کر چھینک مارنے کے لئے منہ کھولے بیٹھا تھا۔ وہ کوئی نیا آدمی تھا۔ ادھر ادھر کوئی بیرہ بھی نہیں دکھائی دیا۔ اگرچہ وہ ایک بڑے مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے اس کے قریب چلے آئے۔ چہرے جانے پہچانے نہ ہوں تب بھی کبھی کبھی ایسی شک ہونے لگتا ہے وہ جان پہچان کے ہیں۔ کوئی چہرہ —— کوئی ایک شاید، اچانک اپنی ایسی ہی بے شناختی میں سے نکل کر اس طرح مسکرانے لگے جس میں اس کی شناخت ثابت ہو جائے! اس نے بڑی بے بسی سے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ماسک کی طرف دیکھا۔ جو بہت ہی مسرور کیفیت کا حامل تھا۔

اس نے پوچھا —— "انتیس خالی ہو گیا؟"

پھر اسے خود ہی ایسا لگا اس نے یہ فرض کیوں کر لیا ہے کہ وہاں پہلے سے ٹھہرا ہوا کوئی مسافر واقعی خالی کر کے چلا گیا ہوگا۔ بنگالی دادا نے سر گھما کر اپنے پیچھے دیوار پر لگے ہوئے کی بورڈ کی طرف دیکھا۔ بے شمار نمبروں پر چابیاں لٹک رہی تھیں۔ کوئی کوئی نمبر خالی بھی تھا۔

"ایکھن اویدی ہائی تی۔ آپ کو بیس نمبر پا سکتا۔ سینگل ہائی۔"

ایک بیرہ دخل انداز ہو کر بولا —— "انتیس نمبر والا پنجرا ابھی نہیں آیا۔ پر آئے گا ضرور۔"

سریتا نے کچھ بنگالی، کچھ ہندوستانی اور کچھ انگریزی میں سمجھایا —— "آئی یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس کو چھوڑ کر یہاں آنا چاہتا —— سمجھا؟ اگر انتیس نمبر!"

"ٹھیک ہائی، ٹھیک ہائی۔ وہ آج نہیں مل سکتا۔ ایک پنجرہ ہر سال آج کے دن ٹھہرنے کے واسطے آتا ہے ایڈوانس منی آرڈر بھیج کے بک کرا لیتا۔ کل مارننگ چھوڑ بھی دے گا تو آپ کے واسطے ہم اسے کل کے واسطے بک کرے گا۔

بھالو!"

"اچھا کھولو تو اسے ذرا۔ میں ذرا دیکھ لوں۔"؟

وہ بیرے کے پیچھے چپ چپ سی کاریڈور میں چل رہی ہے۔ جو ہاتھ میں چابی اٹھائے جا رہا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر ایک کمرے کی چوکھٹ پر لکھے ہوئے نمبر دیکھتی جا رہی ہے۔ وہ چاہے تو آنکھیں بند کر کے بھی چل سکتی ہے اسے معلوم ہے اسے کہاں جانا ہے۔

وہ گردن گھما کر دھوپ میں نہائے ہوئے لان کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ کوئی غیر ملکی جسم پر صرف جینز پہنے پیٹ کے بل لیٹا گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کی ننگی گوری پیٹھ پر پڑا ہوا اخبار ہوا کے جھونکے سے اڑ کر دور جا پڑا ہے ——— ایک گہری کین چیئر میں ڈوبی ڈوبی سی کوئی عورت اپنے تازہ دھلے ہوئے لمبے بال پیٹھ پر بکھرائے سوئیٹر بننے میں مصروف ہے۔

کمرے کے اندر جاتے ہی اسے ایسا لگا وہ ایک پورے مرد کی مضبوط بانہوں میں پہنچ گئی ہے جو اسے منع کرنے پر بھی بار بار چوم رہا ہے ——— اس کی آنکھوں پر، اس کے ہونٹوں پر اور اس کی ناک کے خوبصورت بانسے پر۔ وہ بار بار گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ تو وہ اس کی گردن کی شہ رگ پر اپنے دانت گاڑ دیتا ہے۔ اسے بالکل بے بس کر دیتا ہے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے ایک ہی طرف دیکھتی رہ جاتی ہے۔ جدھر نکلے ہوئے وارڈروب میں سے اسے ہینگر پر لٹکی ہوئی پینٹیں اور شرٹیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اور ایک اسٹول پر رکھے ہوئے سوٹ کیس کے اوپر لاپرواہی پر پھینکا ہوا رنگین تہمد اور فرش پر گرا ہوا ایک میگزین اور باتھ روم میں واٹر ٹیپ کے پائپ پر پھیلا ہوا تولیہ۔

وہ اچانک دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگتی ہے۔ "میں ممی کو کیا جواب دوں گی؟ وہ میری شکل دیکھتے ہی سمجھ جائے گی ——— تم چلے جاؤ یہاں سے ——— پھر کبھی مت آنا یہاں ———"

سریتا کو اچانک ہاتھ میں اٹھایا ہوا ماسک یاد آ جاتا ہے ——— وہ اسے بڑی حیرت سے دیکھتی ہے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس کا کیا کرے ——— ا دونوں نے اپنے اپنے چہرے پر ماسک چڑھا کر ایک گیت کی دھن پر ڈانس کیا تھا ——— پھر اس نے اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹے لیٹے ایک گیت سنایا تھا۔

پُرانو شیئی رینیر کوتھا
بھولے کیرے ہائے او شیئی
چوکھیر دیکھا پرانیر کاتھا
شیکی بھولا جائے

وہ بنگالی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اسے ایک ایک لفظ کا مطلب بھی کہہ سنایا تھا۔

اس پرانے دن کی راحت
بھول جاؤ گے کیا؟
ہائے وہ آنکھ کا ملنا
دل کی بات ہوئی
وہ کیا بھلایا جا سکتا ہے؟

سریتا نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے چہرے پر ماسک چڑھا لیا۔ اور کمرے کو ایک بار پھر دیکھا۔ اِدھر اُدھر گھوم کر۔ وہ اپنا ماسک فرش پر پھینکے پلنگ پر نڈھال سا ہو کر خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی کیفیت سے بالکل بے خبر ——— اسے اچانک غصہ آ گیا ——— اس نے پاؤں سے زور سے ٹھوکر ماری۔ اس کا قدیم مردانہ وجاہت کا ماسک دور جا پڑا۔ میز کے نیچے۔ بالکل الٹا ہو کر کانپنے لگا۔ لال چیونٹے کی طرح آسمان کی طرف ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک ٹھوکر اور ماری۔ پھر اسے زور سے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا ———

"میم صاحب کمرہ خالی کرنا ہوگا۔"

وہ جاتی ہے بیرہ کھڑکی میں سے جھانک کر ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ کتنی دیر سے حیرت زدہ سا اس کی حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ وہ اسے کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل آتی ہے۔ چہرے پر اسی طرح ماسک لگائے ہوئے۔ وہ بھول سی گئی ہے کہ وہ ماسک لگائے ہوئے ہے۔ اسے صرف اتنا یاد ہے کہ اسے وہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ کمرہ آج اسے نہیں مل سکتا کیوں کہ وہ کسی ایسے آدمی کے لئے پہلے سے بک ہے جو ہر سال اسی روز یہاں آتا ہے اسے وہ لمبے کاریڈور کے آخری سرے پر ریسپشن روم کے سامنے ٹیکسی میں سے باہر آتا ہوا دیکھ سکتی ہے۔ ایک بیرا ڈِگی میں سے اس کا سامان باہر نکال رہا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا سر بالکل سفید ہو چکا ہے۔ اس نے اسی رنگ کی ہلکی ہلکی داڑھی بھی اگا لی ہے۔ سریتا کو ایسا لگا جیسے کاریڈور پہلے سے بہت لمبا ہو گیا ہو۔ وہ کتنی دیر سے چل رہی ہے لیکن یہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ اس طرح چلتے چلتے تو کئی یُگ بیت جائیں گے۔ وہ اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے۔ پھر جیسے بھاگنے سی لگتی ہے۔ اور اس کے سامنے سے گزر کر گیٹ سے باہر نکل جاتی ہے۔ □

انور عنایت اللہ

۱۱۸ - یو، چوتھی منزل، بلاک نمبر ۲
پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی - کراچی ۲۹

ثواب کی خاطر

قبرستان کی چار دیواری کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں آثار قدیمہ کے کسی کھنڈر میں آگیا ہوں۔ جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی تھیں اور اس کے ٹیڑھے ترچھے پتھروں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے موسم اور وقت نے اس قبرستان کے ساتھ بھی بڑا ظلم کیا ہو۔

سورج غروب ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود یہاں خاصی روشنی تھی۔ میں بڑے پھاٹک میں سے قبرستان میں داخل ہوا تو یکایک آس پاس کے چھوٹے بڑے، حسین اور بے ہنگم مقبروں میں تیز روشنیاں جل اٹھیں اور دن کا سا گمان ہونے لگا۔ غالباً یہاں ایسے امیر مردے دفن تھے جو اندھیرے کے عادی نہیں تھے۔ اس لئے ان کے ورثا کے علاوہ کارپوریشن نے بھی چاروں طرف تیز روشنی کا انتظام کر رکھا تھا، جب کہ آس پاس کی سڑکیں کچھ زیادہ روشن نہیں تھیں۔

میں نے ایک جگہ رک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا تو دائیں طرف مجھے ایک سیاہ فام موٹا تگڑا شخص نظر آیا جو ایک صاف ستھری پکی قبر پر بیٹھا حقے کی چلم بھر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کپڑے جھاڑتا اٹھا اور مسکراتا ہوا میرے پاس آیا۔ بڑے ادب سے سلام کیا اور جھک کر خوشامدانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"جناب کو کتنی جگہ چاہئے؟ یوں تو سرکار نے یہ قبرستان بند کر دیا ہے لیکن وڈری ہم نے آپ جیسے شریف آدمیوں کے لئے تھوڑی بہت جگہ بچا کر رکھ لی ہے۔ ایک جگہ تو بہت ہی اچھی ہے۔ آپ کے مردے کو یہاں بالکل تکلیف نہیں ہوگی بجلی کا بھی معقول انتظام ہے۔ وڈری ایک درخت بھی نزدیک ہے۔ اگلی گرمی میں اس کا سایہ بھی آپ کو ملے گا۔"

اس نے یہ تفصیلات اتنی تیزی اور مہارت سے بتائیں کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کا کون مرا ہے؟" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"کوئی نہیں ـــــ دراصل آج صبح ہمارے گھر کے عین سامنے ایک غریب چلتے چلتے گرا اور مر گیا۔ خدا جانے کون تھا بیچارہ ـــــ دن بھر ہم پولیس اور تھانوں کے چکر میں رہے۔ شام کو لاش ملی۔ وارثوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پولیس والے خود دفن کرنا چاہتے تھے لیکن مجھے اچھا نہ لگا۔ ثواب کمانے کو بھی بہت جی چاہا۔ اس لئے میں لاش

گھر لے آیا۔ محلے والوں کے ساتھ مل کر چندہ جمع کیا اور سیدھے تمہارے پاس آیا ہوں۔ ایک عدد قبر چاہئے۔ تقریباً ساڑھے پانچ فٹ لمبی۔ اب بتاؤ تم کیا لوگے؟" میں نے تفصیلات بتاتے ہوئے پوچھا۔

میری باتیں سنتے ہی گورکن کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی جھکی کمر آناً فاناً، آپ ہی آپ سیدھی ہو گئی۔ اور اس نے نہایت خشک لہجے میں جواب دیا۔

"ادھر جگہ ذرا مہنگا ہے صاب ـــــ چوں کہ پہاڑ کے اوپر قبرستان ہے اس لئے ادھر کا ریٹ زیادہ ہے۔ آپ یا تو ہم کو ڈھائی سو روپیہ دے دو یا مردے کو لالو کھیت لے جاؤ۔ ہم نے آپ کو رعایتی ریٹ بتایا ہے۔ اپن کو پکا مسلمان ہے صاب۔ اس لئے سب کو قواجگہ دیتا ہے۔ ایک مردے کو نکال پھینک کر دوسرے کو ان میں دفن کرنا، وڈری ہم کو اچھا نہیں لگتا۔ مرنے کے بعد انسان کی عزت تو کرنی ہی پڑتی ہے صاب۔ اس کے آرام کا بھی بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ فٹافٹ ڈھائی سو نکالو ابھی کام شروع کر دیگا!"

یہ سننا تھا کہ فوراً میرے حواس ٹھکانے آ گئے۔ "یعنی ڈھائی سو روپے صرف ایک میت کے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا

"اور نہیں تو کیا اکھا شہر کے؟" اس نے نہایت بدتمیزی سے جواب دیا۔ "ہم نے تو آپ پر ترس کھا کر رعایت کر دیا تھا ورنہ بابو صاب ادھر تو پانچ سو میں بھی قبر نہیں ملتی۔ منظور ہے تو بتا دو ورنہ گھر جاؤ۔ کیوں خالی پیلی ہمارا وقت ضائع کرتا ہے؟"

"نہلانے دھلانے کا کیا ہوگا؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کام ہم نہیں کرتا صاب۔ ہم تو صرف قوم کا قبر کھودتا ہے۔ ادھر شہر میں بڑا ایدھی کومپنی ہے۔ کسی کو بھی ٹیلیفون مارو۔ وہ سب کچھ کر دیگا۔ میرا خیال ہے تم پر ترس کھا کر سو روپے میں کر دیگا!"

اس کے حساب سے پورے ساڑھے تین سو کا نسخہ تھا۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے حساب لگایا تو یاد آیا کہ ہم سب نے مل کر کل ساٹھ روپے پچھتر پیسے جمع کئے تھے۔

"ارے کس سوچ میں پڑ گئے صاب؟ ـــــ جلدی کرو۔" اس نے بےچینی سے پوچھا۔

"ذرا گھر جا کر محلے والوں سے بات کر لوں ـــــ ابھی آکر جواب دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے مڑا۔

"ذرا جلدی جواب دینا صاب ـــــ وڈری، ہم رات کو ساڑھے آٹھ اور صبح کے سات بجے کے درمیان بالکل کام نہیں کرتا۔ اگر کوئی ارجنٹ معاملہ ہے تو اس کا ریٹ دگنا ہے!" وہ بڑی بدتمیزی سے چیخا۔

میں صبح سے بجھا بجھا تو تھا ہی، اب گورکن کی باتوں سے مجھے بڑی وحشت ہونے لگی۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا اور رہ رہ کر مجھے اپنی نئی نویلی دلہن کا خیال آ رہا تھا جو ابھی ہفتہ بھر پہلے ٹنڈو آدم سے کراچی آئی تھی۔ اس بیچاری کے ساتھ تو بہت سے ظلم ہوتے تھے۔ شادی کے فوراً بعد میرا تبادلہ کراچی میں معقول

گھر کا نہ ملنا۔ پھر بڑی مشکل سے ہاؤسنگ سوسائٹی کے اس غیر آباد علاقے میں چھوٹے سے مکان کا ملنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں سے بازار خاصا دور تھا۔ صرف قبرستان محلے کے بیچوں بیچ تھا۔ شاید اسی لئے رہنے والوں کی سہولت کے لئے یہ سوسائٹی آباد بھی کی گئی تھی۔

بہر حال صبح سے میری بیوی نے طوفان بپا رکھا تھا۔ وہ شام کو یہ کہہ کر اپنی ایک سہیلی کے یہاں چلی گئی تھی کہ جب تک غیر کا مردہ گھر میں ہوگا وہ دہلیز پار نہیں کرےگی۔ ادھر ملازم نے علٰحدہ جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ ڈر سے اس کا بُرا حال تھا۔ میری مشکلات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اگر کوئی مومن میرے گھر کے عین سامنے مرتا اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو کیا میں اسے میڈیکل کالج کے حوالے کر دیتا تاکہ لونڈے اور لونڈیاں چیر پھاڑ کر تجربے کریں؛ میں تو انسانی ہمدردی میں اس کی لاش اپنے یہاں لایا تھا۔

اب گورکن سے تبادلۂ خیال کے بعد جو سوال مجھے پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ اگر ساڑھے تین سو روپے جمع نہ ہو سکے تو اس غریب کی لاش کا کیا ہوگا؛ خود میرا حشر کیا ہوگا؛ بیگم حالات کا جائزہ لینے کے لئے صبح لوٹنے والی تھیں ٹھیک سات بجے۔ انھوں نے پورے سترہ گھنٹوں کی مہلت دی تھی اور دھمکی دی تھی کہ اگر اس وقت تک لاش ٹھکانے نہ لگی تو وہ سیدھے میکے کا ٹکٹ کٹائیں گی۔

اسی ادھیڑبن میں جب میں قبرستان سے گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر کا صدر دروازہ چوپٹ کھلا ملا۔ نہ ملازم کا پتہ تھا اور نہ پڑوسیوں کا۔ میت برآمدے میں جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں۔ میں نیا نیا اس محلے میں آیا تھا۔ مجھے تو ان پڑوسیوں کے نہ نام معلوم تھے اور نہ پتے جنھوں نے چندہ دیا تھا۔ ان لوگوں کو تو میں میت کے پاس چھوڑ گیا تھا اب خدا جانے وہ کہاں غائب تھے۔ میں نے بےچینی سے گھڑی دیکھی۔ سات بجے تھے۔ جلدی سے میں نے گھر کا صدر دروازہ بند کیا اور مسجد کا رُخ کیا۔

محلے کی یہ مسجد ابھی زیر تعمیر تھی۔ چوں کہ آبادی کم تھی اس لئے اکثر خالی رہتی تھی۔ اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ منبر کے قریب ایک اسٹول پر لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے نمازیوں کے ساتھ ساتھ مولانا صاحب بھی گھر جا چکے تھے۔ صحن میں مجھے ایک لنگڑا فقیر نظر آیا جو ایک طرف بیٹھا سر کی جوئیں مار رہا تھا۔ میں نے اس سے پیش امام صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "وہ تو گھر چلے گئے۔ اب عشاء کے وقت آئیں گے —— بات کیا ہے؛ کیا کسی کی شادی وادی ہے بابوجی؟" وہ اپنے ٹیڑھے میڑھے زرد زرد دانت نکالے مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"نہیں بھئی —— ایک میت ہے۔ اسے نہلانا دفنانا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے مشورہ کرنا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اجی وہ کیا مشورہ دیں گے بابوجی؛ سارے مشورے تو وہ مجھ سے لیتے ہیں۔ کیا آپ کہیں قریب ہی رہتے ہیں؛"

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا؛ جیسے میری امارت کا اندازہ لگانا چاہتا ہو۔ "ہاں"۔ میں نے جواب دیا۔

"تو بابوجی۔ آپ ۹۸۷۶۳۲ پر ٹیلیفون کر دیجئے۔ ایک اچھی انجمن ہے جو تسلی سے سب کام کر دیتی ہے۔ اس کا نام ہے —— 'انجمنِ فلاحِ گورکن و غسال و کفن فروشان و مرحومین' —— مرحوم کون تھا؛ —— آپ کا رشتہ دار؟"

"نہیں" "ملازم ہوگا۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ گورکن سے بصیرت افروز گفتگو کے بعد میں ذرا محتاط ہو گیا تھا۔

"تو پھر آپ فکر کیوں کرتے ہیں؛ قبر تک کا انتظام وہ انجمن کر دےگی۔ ویسے آپ کرتے تو بہتر تھا کیوں کہ سنا ہے لوگ موقع پا کر ایک ہی قبر میں کئی کئی مردے دفن کر دیتے ہیں —— لیکن بابوجی آپ کر کیا —— آپ کا مردہ نئی میں دفن ہو یا پرانی میں۔ ملازم ہی تو تھا —— جائیے بابوجی جلدی سے فون کھڑکھڑائیے۔"

"اخراجات کیا ہوں گے؛" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اجی بابوجی آپ سے کیا زیادہ لیں گے۔ ان کو آپ سے ایسے موقعے ملتے ہی رہیں گے۔ آپ نوجوان ہیں، دولت مند ہیں —— کنبہ بھی بڑا ہوگا۔ بہرحال یہی کوئی ڈیڑھ سو روپے لیں گے!" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

ڈیڑھ سو روپے؛ —— میں نے گھبرا کر سوچا۔ مزید نواسی روپے پچیس پیسے کہاں سے آئیں گے یکایک مجھے یاد آیا کہ بیگم نے میرے نئے سوٹ کے لئے سو کا ایک نوٹ چھپا کر الماری میں رکھا تھا۔ اس سے مجھے تسلی ہو گئی اور میں نے فوراً اس لمبے چوڑے نام کی انجمن کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور چلنے کے لئے مڑا تو لنگڑے فقیر نے مجھے روکا۔

"اگر کوئی دقت ہو تو مجھے بلوا لیجئے گا بابوجی —— نام میرا جاتو لنگڑا ہے۔ اسی مسجد میں رہتا ہوں۔ اپنا ریٹ کچھ زیادہ نہیں —— صرف پانچ روپلے —— اگر دو چار اور خرچ کریں تو میت کے ساتھ قبرستان تک جانے والوں کا بھی انتظام کرتا ہوں!"

مجھے جلدی تھی اس لئے میں نے اس کی پیش کش پر زیادہ غور نہیں کیا، سیدھے ایرانی کے ہوٹل پہنچا اور انجمن مرحومین وغیرہ وغیرہ کو فون کیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی کے بجتے ہی ریسیور فوراً یوں اٹھا لیا گیا جیسے کوئی بےچینی سے ٹیلیفون کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ "جی؛ کیا فرمایا؛ —— جی ہاں انتظام ہو جائے گا۔ صرف دو سو روپے

لیں گے —— جی ؟ —— جی نہیں جناب۔ رات کا ریٹ دگنا ہوتا ہے۔ دن کو ہم سو روپے لیتے ہیں —— جی نہیں اس سے پائی کم نہیں ہوگی —— خدا حافظ —— جلدی فیصلہ کیجئے گا۔ دفتر رات بھر کھلا رہتا ہے!"

اس کے ساتھ ہی کھٹ سے سلسلہ منقطع ہوگیا اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے ساتھ ہی میرے لئے امید کے سارے دروازے بند ہو گئے! بےبسی سے گھڑی دیکھی۔ صبح کے سات بجنے میں پورے پونے تیرہ گھنٹے رہ گئے تھے اس وقت تک مشکل آسان نہیں تو کیا ہوگا؟ بیوی اور ملازم دونوں سے ہاتھ دھونا ہوگا —— خدایا —— میری مدد کرو —— میری توبہ —— آئندہ جو کسی پر ترس کھاؤں —— بس اس بار نجات کا راستہ دکھا دے —— تیری قسم، ساری عمر ایسے جھمیلوں سے دور رہوں گا۔ قومی کاموں کے بارے میں کبھی سوچوں گا بھی نہیں!

میری دعا یہیں تک پہنچی تھی کہ یکایک اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی جس نے پلک جھپکتے جاؤ لنگڑے کا روپ دھار لیا۔ میں تیزی سے دوبارہ مسجد پہنچا۔ جاؤ وہیں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں نے دبے لفظوں میں اپنی تجویز پیش کی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ پھر اس نے بعض اہم مشورے دیئے۔ چند لمے مزید گفت و شنید جاری رہی۔ آخر کو پورے سو روپے پر معاملہ طے ہوگیا اور میں نے فوراً جیب سے پچاس روپے نکال کر بطور پیشگی اسے دیئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنی جلدی میری سن لی اور میں سستے چھوٹا۔

اس سے معاملہ طے کر کے میں گھر پہنچا۔ لاش جوں کی توں رکھی ہوئی تھی اور ملازم یا پڑوسی، کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر لنگڑوں لولوں اور کانوں کی ایک فوج وہاں آگئی اور بڑی مہارت سے کام شروع ہوگیا۔ سب نے مل کر پانی گرم کیا۔ ایک جا کر کہیں سے پھاوڑا لے آیا۔ دوسرا بس میں صدر گیا اور کفن وغیرہ لے آیا۔ تیسرے نے میت کے سرہانے بیٹھ کر قُل ہُوَ اللہ پڑھنا شروع کر دیا کیوں کہ اس بیچارے کو صرف یہی سورۃ یاد تھا۔ چوتھا جا کر قبر کے لئے پُرسکون اور محفوظ جگہ دیکھ آیا۔ اس دوران میں، میں نے سب کے لئے چائے اور کھانے کا انتظام کیا۔

خدا کے فضل سے دیکھتے ہی دیکھتے سارے کام اطمینان سے ہوگئے۔ رات کے ایک بجے جب دنیا سو گئی اور محلے پر سناٹا چھا گیا تو اللہ کا نام لے کر میت اٹھائی گئی اور ہم اس قبرستان میں جا پہنچے جس کے گورکن نے صرف قبر کے ڈھائی سو مانگے تھے۔ احتیاطاً ہم نے روشنی کا انتظام نہیں کیا تھا ویسے جاؤ نے یہاں کے چپے چپے سے جس طرح اپنی واقفیت کا ثبوت دے رہا تھا اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ اب پروگرام یہ تھا کہ قبرستان کے ایک ویران گوشے میں چپ چاپ قبر کھودی جائے اور میت کو اللہ کا نام لے کر دفن کر دیا جائے۔

جب ہم وہاں پہنچ گئے تو جاؤ ہی نے جنازے کی نماز پڑھائی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بابو جی —— لیجئے ہمارا کام پورا ہوگیا۔ اب آپ کا شروع ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کر پوچھا کیوں کہ اس کا لہجہ مجھے گڑبڑ لگا۔

"اگر ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھیک ہوتے تو ہم کبھی آپ کو تکلیف نہیں دیتے —— یہ پھاوڑا اٹھایئے بابو جی اور فوراً قبر کھودنی شروع کر دیجئے!" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ میرے ہوش اڑ گئے۔

"میں قبر کھودوں؟ —— میرے باپ دادا نے بھی کبھی —— !" میں تقریباً چیخ پڑا۔ اس پر جاؤ نے فوراً مجھے روکا۔ "شی —— ذرا آہستہ بولئے۔ اگر کسی نے سن لیا تو شامت آ جائے گی۔ ہم سے قبر کہاں کھودی جائے گی؟ —— آپ ماشاءاللہ صحت مند ہیں —— جوان ہیں، دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ پھر اتنی پریشانی کیوں؟ —— اٹھایئے پھاوڑا اور کام شروع کر دیجئے کام —— پچھّے لولے نے دو بالٹی پانی یہاں ڈال رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی وقت لگے گا ہی —— یہ سسری زمین ہے بتھریلی —— کورا قبرستان ہوتا تو منٹوں میں کھد جاتی قبر۔" اس نے رسان سے مجھے سمجھایا۔

اس کی بکواس سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن آخر کرتا کیا؟ انکار کرتا تو صبح کو قیامت آ جاتی، نئی نویلی دلہن بگڑ جاتی۔ ان کی ضد سے میں واقف ہو چکا تھا۔ وہ ضرور میکے جا کر دم لیتیں۔ مجھے خاموش دیکھ جاؤ میرے قریب آیا اور اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے بابو جی؟ —— وقت کم ہے۔ شروع کیجئے نا کام؛ سات بجے گورکن لوٹ آتا ہے۔ اس سے پہلے سب کچھ ہو جانا چاہئے۔ آپ تیزی سے ہاتھ چلائیں۔ اتنی دیر ہم ذرا کمر سیدھی کر لیں —— آج بڑا مصروف دن گذرا —— جب چار فٹ کھد جائے قبر تو ہمیں جگا دیجئے گا —— بقیہ کام ہم کر لیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ لنگڑاتا ہوا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے تمام فقیر چپ چاپ اندھیرے میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور اس ہیبت ناک قبرستان میں، اس انجانی میت کے ساتھ میں تنہا رہ گیا۔

دنیا میں بہت سے کام کئے تھے لیکن یہ کام میرے لئے نیا تھا۔ اس لئے خاصی دیر لگ گئی۔ آخر کو خدا جانے کتنی دیر کے بعد قبر تیار ہوگئی اور ہم سب نے مل کر بڑے احترام سے میت دفن کر دی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد میں نے کمر سیدھی کی اور پیشانی کا پسینہ پونچھا تو ساڑھے پانچ بجے تھے اور کہیں اذان ہو رہی تھی —— اللہ اکبر —— اللہ اکبر!!! □

اقبال مجید
آل انڈیا ریڈیو بھوپال

ابھی ابھی

جب اس کا کارڈیوگرام تیار ہوا تو اس کے دل کی کیفیت کے زائچے کا کاغذ ہر ایک نے پڑھا سب کو حیرت ہوئی کیوں کہ حیرت کی بات صرف اتنی تھی کہ اس طرح کی رپورٹ سے ان تجربہ کار لوگوں کا کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

اس کاغذ پر لکھا تھا۔

کوئی محرومی نہیں۔ زندگی نے سب کچھ دیا۔ چھوٹے چھوٹے دکھ اور چھوٹے چھوٹے سکھ۔ تین لڑکے ہوئے، ان کو پڑھایا لکھایا ان کی شادیاں کیں۔ انھیں گھر بسا کر بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے رہتے دیکھا۔ اب جب بھی موت آئے گی آرام سے مرجاؤں گا لیکن موت کیوں آئے گی۔ اگر اسے آنا ہی ہے تو ابھی کیوں آئے گی دو چار دس بارہ سال بعد کیوں نہیں آئے ـــ ہائے تو کیا میں مرجاؤں گا ـــ یہ صبحیں یہ شامیں یہ ہنستے بولتے میرے ننھے ننھے پوتی پوتے میرا لڑکا میری بہویں۔ یہ کرسی جس پر روز منھ ہاتھ دھوکر میں ناشتے کے لئے بیٹھتا ہوں۔" یہ خالی ہوجائے گی، مجھ سے خالی ہوجائے گی۔ یہ کوٹ جو کھونٹی پر ٹنگا ہے جسے بازار جانے سے پہلے میں پہنتا ہوں وہ سڑک کا موڑ جہاں چھوٹا سا پل ہے اور جس پر سہ پہر کو میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا ہوں وہ سب مجھ سے چھوٹ جائیں گے۔ بازار میں سبزی والے ہر شام جو مجھے سلام کرتے ہیں اور ہری ہری سبزیاں تول کر میرے جھولے میں ڈالتے ہیں اور پھر کیلنڈر پر ان تاریخوں پر بنے ہوئے نشانات جن تاریخوں پر مجھے، شادی بیاہ، اور دوسری تقریبات میں دوست احباب کے گھروں پر جانا ہے وہ سب چھوٹ جائے گا ایک پل میں کہیں کھوجائے گا۔

موت آئے گی تو ضرور۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی آجائے۔ ابھی جب کہ میرا بڑا لڑکا پردیس میں ہے کتنے دنوں سے اس نے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ ہائے وہ کتنا بے مروّت ہے! لیکن وہ کر بھی کیا سکتا ہے جہاں روٹی روزی لے جاتی ہے جانا پڑتا ہے ـــ یہی کیا کم ہے کہ میری دو اولادیں میرے پاس ہیں ان کی بیویاں میری خدمت میں لگی ہیں۔ ابھی میری بڑی بہو نے میرے سر کے نیچے میرا تکیہ ٹھیک کیا ہے۔ میری بیوی۔ میری

باوفا، خدمت گزار بیوی وارڈ کے باہر پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ ۳۰ سال سے وہ میری زندگی کے ایک ایک پل کی ساجھے دار ہے۔ کیسا تڑپ رہی ہے وہ ـــ میں مرجاؤں گا تو وہ کیسے جی پائے گی وہ۔ لیکن کیا میں اپنے بڑے لڑکے کو اب کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ اتنی دور سے کیسے آئے گا وہ ـــ ہائے دونوں ہاتھوں سے وہ اپنا کلیجہ نہ پکڑے گا کہ میں اپنے باپ کے آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ کیا میں مرجاؤں گا۔

کارڈیوگرام پر دل کی کیفیت کا زائچہ۔ اس کے دل کی دھڑکنوں اور ان کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ اتنا سب کچھ لکھ رہا تھا کاغذ برابر باہر آرہا تھا اور وہ تجربہ کار لوگ ان اونچی نیچی لکیروں کو غور سے دیکھ رہے تھے انھیں پڑھ رہے تھے۔ تب ان میں سے کسی نے کہا کہ اس کو مارفیا دے دیا جائے۔ لیکن بالآخر یہ طے پایا کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے اور زائچہ کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ انھوں نے پھر کاغذ کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا۔

اے پالنے والے میں نے بہت گناہ کئے ہیں۔ مجھے دوزخ کی آگ سے بچانا۔ اے معبود میں تیرا شکر بجالاتا ہوں اور تیری بخشی ہوئی نعمتوں کے لئے کروٹ کروٹ تیرا احسان مند ہوں۔ میرا منھ اس لائق نہیں کہ کلماتِ تشکر زبان پر لاسکوں۔ لیکن تو رحیم و کریم ہے۔ خطاکاروں کی خطاؤں کو درگزر کرنے والا۔ تیری شان و عظمت کے قربان میری بخشش کر مجھے اپنی رحمتوں کی پناہ میں لے لے۔ میرے پاس تجھے دینے کے لئے کچھ نہیں مجھے بچالے۔ مجھے زندہ رکھ، مجھے بخش دے۔ میں مرنا نہیں چاہتا کہ دوزخ کی آگ، میں نے کچھ یتیموں کو ستایا مگر ـــ اے رحیم و کریم جوانی میں گرمیوں کی دوپہر گھر کی چھت پر اس خادمہ کی لڑکی کے پستانوں پر / میرا ہاتھ دوزخ کی آگ سے بچالے کہ زندگی ابھی مجھے اور دے دے اور وہ ذائقہ ان پاپڑوں کا جو میں چاولوں کے ساتھ کھاتا ہوں کہ سب کچھ تیری رحمت پر منحصر ہے / اور وہ امرود بس ایک امرود جسے ڈاکٹر نے مجھے روزانہ کھانے کے بعد کھانے کے لئے کہا ہے اور بکری کی ہڈیوں کا شوربہ اور پھلکے کہ ان کا ذائقہ جو امرتی گرم گرم ٹکیاں چٹنی اور دہی ڈلوا کر میں چاٹ والے کے ٹھیلے سے لے کر / کھاتا ہوں۔ چوری چھپے وہ بوڑھا تانگہ والا جسے جوانی کے جوش میں میں نے مارا تھا اور کرایہ بھی نہیں دیا تھا کہ میں بہت گناہ گار ہوں اور تو بخشنے والا ہے۔

ان تجربہ کار لوگوں نے جملوں کی بے ربطی پر کارڈیوگرام کی مشین کی طرح غور سے دیکھا اور اس میں کسی کل کو بار بار ادھر ادھر ہلاڈلا کر دیکھنے لگے کہ یہ بے ربطی مشین کی خرابی کے سبب سے تو نہیں تو اس بار انھوں نے دل کی کیفیت کے زائچہ پر دیکھا تو لکھا تھا۔

مریم کا شوہر مجھ پر شک کرتا تھا۔

میرے بستر کے قریب بیوی کیوں رو رہی ہے۔

میری پوتی کے دل میں چھید ہے۔اس ننھی سی جان پر خدا کو رحم نہ آیا۔

میرا جوتا پھٹ چکا ہے۔

پوتی کے آپریشن کے لئے اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا۔

اس دن اس کا شوہر میرے پیچھے چاقو لئے گھوم رہا تھا۔جوانی کے معرکے۔کہاں گئے وہ دن۔

میں نے اپنی بیوی کی زبان پر انگارہ رکھ دیا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بولی۔

مجھے بچا لو۔مجھے بچا لو۔

میں نہیں مروں گا۔مجھے بچا لو۔

ابھی تو صرف ۶۰ برس ہی تو گزرے ہیں۔ممون خاں ۷۰ سال کے ہیں اور زندہ ہیں۔لکڑیاں چیرتے ہیں۔کریمن کی کمر دہری ہو چکی ہے مگر سوئی میں دھاگہ ڈالتی ہے۔کہتی ہے ایڈورڈ صاحب بہادر کو اپنی آنکھوں سے اس نے دیکھا تھا— مجھے بچا لو— میرا درد — یہ درد یہ درد یہ سانسیں، یہ ہاتھ پیر میں تھرتھری، یہ شل ہوتے ہوئے پاؤں۔بستر جیسے کمرے میں تیر رہا ہے۔کیا موت اسی طرح آتی ہے۔کیا سب یونہی مرتے ہیں یہ چھاتی میں دھونکنی سی کیا چل رہی ہے، یہ زبان اتنی موٹی سی اتنی بے ذائقہ سی اتنی بھاری سی اور یہ جبڑے اتنے بوجھل سے کیوں ہو رہے ہیں اور یہ گلے میں گلے کی دیوار میں سوئیاں سی کیوں چبھ رہی ہیں اور یہ آنکھوں کے ڈھیلوں میں اندر بہت اندر چڑیاں جیسے چونچیں مار رہی ہیں اور باہر بارش ہو رہی ہے کہ کانوں کے پردوں پر ٹپ ٹپ کر کے کچھ مستقل بجے جا رہا ہے۔نتھنوں میں اور ہونٹوں پر جیسے لو کی گرمی کا احساس کیوں ہے پیر کے دونوں انگوٹھوں کو کوئی موڑ رہا ہے پسلیوں میں درد اور سینے کی بائیں طرف جیسے اندر کسی نے جلتا ہوا توا سا رکھ دیا ہے — موت کو جھیلنا بڑا مشکل ہے، یہ وہ گھڑی ہوتی ہے جب کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا، یہ اذیت دھیرے دھیرے بڑھتی جائے گی۔پھر کیا ہوگا —؟ اس تکلیف کی کیفیت کیا ہوگی، کوئی نہیں بتا سکا ہے اسے۔سب اسے جھیل کر چلے جاتے ہیں۔مجھے بھی اس کے لیے تیار رہنا چاہئے۔وہ کیفیت اب بہت قریب ہے۔

تب ان تجربہ کار لوگوں نے بالآخر یہ طے کیا کہ مریض کو مارفیا دے دینا چاہئے — اور انھوں نے مریض کو مارفیا دے دیا — پھر ان تجربہ کار لوگوں کو پتہ نہ چل سکا کہ آگے کیا ہوا۔مریض کے دل کی دھڑکنوں کو عارضی سکون دے کر وہ سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے —

مارفیا زدہ مریض۔پرسکون ہو گیا۔بعد میں ان لوگوں نے جیسا جیسا تجویز کیا وہ ہوتا رہا۔اور دن گزرتے رہے— صبح مریض کی بیوی وارڈ کے باہر نماز ادا کر کے مریض کے لئے دودھ کا پیالہ

لے کر آتی۔مریض باتیں کرتا۔دن چڑھتے موسمی کا رس پیتا۔دوپہر کو اس کی بہو اس کے لئے تازہ تازہ کھانا لے کر آتی۔شام کو اس کے پوتے اور پوتی اجلے اجلے کپڑے پہن کر پھولوں کا گلدستہ لے کر آتے اور مریض ان کے گالوں کو چوم کر ان سے ہنستا کھیلتا۔رات میں اس کی بوڑھی بیوی اس کے سرہانے بیٹھ کر تسبیح پڑھتی اور وہ اسلامی فتوحات کے معرکے کتابوں میں سے پڑھ کر اپنی بیوی کو سناتا اور دین و ایمان کی اچھی اچھی باتوں کو پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کے سبب آنسو آجایا کرتے۔وہ تھوڑی دیر رک کر پھر کتاب سنانا شروع کرتا۔رات وہ اپنی پسندیدہ کروٹ کے بل لیٹ کر تھوڑی دیر جمائیاں لیتا اور پھر ٹرنکولائزر کے دھیمے دھیمے سرور میں آرام سے سو جاتا۔

اب وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا شیو بناتا۔آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہو کر وہ چپل پہنتا اور چہل قدمی کرتا ہوا وارڈ سے باہر آتا اور کچھ دیر باہر کی چہل پہل کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا اور اس بوڑھے فقیر کو اپنے ہاتھ سے پیسے دینا نہ بھولتا جو روزانہ اس کی جان و مال کو دعا دیا کرتا تھا۔

پہلے ہر سویرے اسے کارڈیوگرام کی مشین کے سامنے پیش ہونا پڑتا اور اب اسے پندرہویں دن آنا ہوتا۔اسپتال آنے سے ایک دن پہلے وہ کسی طرح سے اپنے کو بازار کے اس موڑ سے دور رکھتا جہاں ایک نامی ٹھیلے والا مٹر کی ٹکیاں بڑی سی کڑھائی میں سینکا کرتا اور انھیں دونے میں رکھ کر ان پر چٹکی سے نمک مرچ اور مسالے ڈال کر اور ان پر میٹھی چٹنی اور دہی کی تہہ لگا کر لوگوں کو کھلایا کرتا اور لوگ مزے لے کر کھایا کرتے۔

ایک دن وہ اپنے پوتوں کو ساتھ لے کر سنیما دیکھنے گیا— ایک دن اس نے اپنے چھوٹے لڑکے کے نئے مکان میں بجلی کا میٹر لگوانے کے لئے تین میل پیدل چل کر بجلی گھر میں درخواست لگائی۔ایک دن وہ اپنی بہو کی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر ایک ہومیوپیتھ کو دکھا کر لایا۔اور کئی دن اس نے لگاتار چاٹ والے کے ٹھیلے کے کنارے کھڑے ہو کر چوری چھپے چاٹ اڑائی۔وہ اپنی جیب میں ہمیشہ اپنی پاکٹ منی ضرور رکھتا۔بھنے ہوئے چنے وہ ضرور کھاتا، تربوز کی پھانکیں وہ ضرور خریدتا اور جلدی جلدی ایک کنارے کھڑے ہو کر کھا لیتا۔گنے کا رس نکلوا کر پیتا، ابلے ہوئے سنگھاڑوں کی سوندھی سوندھی گودیاں لے کر جیب میں بھر لیتا اور راستہ چلتے انھیں کھاتا جاتا۔

اس نے اپنے لئے نیا سوٹ سلوایا۔

بڑے لڑکے نے اسے فارن سے پیسے بھیجے تھے اس سے اس نے اپنے لئے ایک شاندار پمپ شو خریدا تھا۔اس نے اپنی آنکھیں پھر سے ٹسٹ کروائی تھیں اور نیا نمبر ملنے پر ایک خاصا بھاری بھرکم فریم بھی خریدا تھا جو اس کے چہرے پر علٰحدہ سے ایک وجود کا احساس دلاتا تھا—

اس بار جب اسے کارڈیوگرام کے لئے تیار کیا گیا تو اس کے دل کی کیفیت کے زائچہ کا کاغذ جن آڑی ترچھی اور اونچی نیچی لکیروں کو ساتھ لے کر باہر نکل رہا تھا ان کو ان تجربہ کار لوگوں نے جب پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

میرا چھوٹا لڑکا گھر میں دیر سے آتا ہے۔ اس کی بیوی سیدھی سادی ہے کچھ بولتی نہیں میں حرامزادے کو کئی بار سمجھا چکا ہوں۔ مگر نہیں مانتا اب اگر دیر سے آیا تو سور کے بچے کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گا ——— اپنے کو سمجھتا کیا ہے ——— دو ہاتھ میں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔

ان ہاتھوں نے لاکھوں کمائے آج بھی یہ ہاتھ کسی کے دست نگر نہیں رہیں گے دوسرے صاحبزادے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے روپیہ بھیج کر خرید لیں گے۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں ایسے ہی دنوں کے لئے میں نے اپنا فنڈ الگ سنبھال کر رکھا تھا۔ دو آٹو رکشہ خرید کر کرائے پر چلواؤں گا۔ ایک مکان بیچ کر کپڑے کا کاروبار کروں گا۔ پڑے پڑے زنگ لگ رہا ہے۔ امجد کئی بار کلکتہ بلا چکا ہے لکھتا ہے جو عیش یہاں ہے وہ تم نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ کچھ روز کے لئے میری مہمانی قبول کر لو پھر سے جوان ہو جاؤ گے۔ سالے وہی دن اور وہی رات۔ ہرگز یہ مکان میں کسی کو نہیں دوں گا ——— ضرور بیچ دوں گا اسے۔ بڑی بہو دکھاوے کی باتیں کرتی ہے۔ اس نے لڑکے کو قبضے میں کر رکھا ہے۔ سمجھتی ہے کہ گھر کی سب سے بڑی وہی ہے۔ سب کے دماغ ٹھیک کر دوں گا میں ——— کپڑے کی دوکان، بہت منافع ہے۔ پھر ہم دونوں بڑھیا بڈھے ہوائی جہاز سے حج کو جائیں گے اور وہاں سے واپسی پر یوروپ کا دورہ کریں گے کتنی خوبصورت دنیا ہے یہ کتنا کچھ دیکھنے کو پڑا ہے، کتنا کچھ کرنے کو ہے ابھی تو/ابھی/ابھی/ابھی

تجربہ کار لوگ جلدی سے کارڈیوگرام پر جھک گئے۔

ابھی تو/ابھی/ابھی/ابھی/

وہ سب باہر نکلی ہوئی آنکھوں سے مبہوت ہو کر زائچہ کو دیکھ رہے تھے۔ بے بس ہو کر دیکھ رہے تھے

ابھی تو/ابھی ——— ابھی ابھی ——— ابھی ——— اب

اور پھر زائچہ گونگا ہو چکا تھا ——— کاغذ سے سارے اتار چڑھاؤ ختم ہو چکے تھے وہاں سیدھی سی ایک بیسکا بے جان لکیر کے علاوہ کچھ نہ تھی جس کے کوئی معنی نہ تھے کوئی مطلب نہ تھے۔ اور سب کچھ ابھی ابھی ہوا تھا ——— □

صدیقہ بیگم سیوہاروی

بنتِ حوّا

میں حوّا ہوں ——— حوّا کی بیٹی ہوں ——— لیکن میں تمہاری بہن بھی ہوں۔ اور تمہاری ماں بھی ہوں ———"

میں چونک پڑی ——— یہ کون ہے ——— کوئی دیوانی لڑکی ہے جو ایسی بے سر پیر کی باتیں کر رہی ہے لیکن مجھے یہ آواز اور یہ صورت کچھ جانی پہچانی سی لگی جیسے میں اسے صدیوں سے جانتی ہوں ——— جیسے ہر زمانے میں میں نے کچھ نہ کچھ وقت اس کے ساتھ گزارا ہے۔ کبھی تو میں اس کے ساتھ مدرسے میں پڑھتی تھی ہم دونوں ایک ساتھ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جب ہمارا جی چاہتا کہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر کنکر کھیلیں تو ہم بستہ ایک طرف ڈال کے کھیلنے بیٹھ جاتے۔ اور جب مدرسہ کا خیال آتا تو گھبرا کر چل پڑتے۔ دیر سے مدرسے پہنچنے پر مولوی صاحب ہمارے کان اینٹھتے۔ ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور ہم ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے۔ لیکن سزا برابر ملتی۔

اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ ہماری ملاقات سفر میں ہوتی تھی اس وقت ہم دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں اپنی ساس نندوں کے قصے سنا سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کر رہے تھے۔ پھر ایک اسٹیشن پر وہ اتر گئی۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا، وہ آگے آگے جا رہا تھا اور یہ غلاموں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی میری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا ——— اور پھر اس جنم میں ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔

اس کے بعد میری ایک بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس بار میں نے دیکھا کہ اس کے منہ میں کوئی دانت نہیں تھا۔ اس کے سر کے بال بھی سفید ہو گئے تھے، اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ گر دانت تو میرے منہ میں بھی نہیں تھے۔ بال تو میرے بھی سفید ہو گئے تھے۔ اور میرے چہرے پر ان گنت دنوں اور راتوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ ہمارے کندھے ماہ و سال کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔

اور ہم دونوں نے بیتے دنوں کی کہانیاں سنائیں۔

آج برسوں کے بعد ——— نہیں صدیوں کے بعد یہ لڑکی میرے پاس سوالیہ نشان بنی ہوئی کھڑی ہے

اور کہہ رہی ہے کہ "میں حوا ہوں ـــــ حوا کی بیٹی ہوں ـــــ لیکن میں تمہاری بہن بھی ہوں اور تمہاری ماں بھی ہوں ـــــ"

میں پوچھتی ہوں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی آدمی اتنے روپ بھرے۔ یہ لڑکی ضرور اداکار ہے۔ کسی تھیٹر میں کام کرتی ہے۔

"کیوں جی! کیا تم کسی تھیٹر میں کام کرتی ہو۔"

جی ہاں تھیٹر میں ـــــ تمہارے ساتھ ـــــ میں اور تم دونوں اداکار ہیں جیسا پارٹ ملتا ہے کرتے ہیں، کرنے پر مجبور ہیں ـــــ کیوں کہ ہم اسی کی روٹی کھاتے ہیں۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتی ہو کہ تم صرف ایک پارٹ ہی زندگی بھر کرتی رہتی ہو۔"

میں اس سوال سے گھبرا جاتی ہوں۔ جب کبھی کوئی جواب نہیں بن پڑتا میں اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتی ہوں اس وقت بھی یہی صورت ہے۔ اب میں اس لڑکی کو کیا جواب دوں ـــــ یہ خود تو اداکار ہے۔ مجھے بھی اداکار بنا رہی ہے۔ جب کہ مجھے اداکاری کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ میں کیا جانوں اداکاری کسے کہتے ہیں۔

دیکھو بی بی! تم سچ سچ بتاؤ کیا معاملہ ہے ـــــ تم مجھ سے پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو ـــــ جو بات کہنا ہے صاف صاف کیوں نہیں کہتی۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔

میں کیا کہنا چاہتی ہوں ـــــ تم ایسے کہہ رہی ہو، جیسے میں کوئی بھکارن ہوں اور تمہارے سامنے سوال کر رہی ہوں ـــــ اور ذرا سی دیر میں تم مجھے مالا مال کر کے رخصت کر دوگی ـــــ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ تم جانتی ہو ـــــ میں نے ایک سیدھے سادے گھر میں اپنے آپ کو جنم دیا تھا۔ میں اپنی ہی ماں اور اپنی ہی بیٹی ہوں۔"

"اب تو یہ عورت اور زیادہ مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا آگے بولو۔"

"جی میں حوا ہوں۔ جب پیدا ہوئی تو گھپ اندھیرے گھر میں چراغ جل اٹھے۔ مجھے بڑے اچھے اچھے نام دیئے گئے ـــــ پیار کی بھرمار کر دی گئی۔ ایسا لگا کہ دنیا کی رونق میرے ہی دم سے تھی۔ میں کبھی کھلونے کھیلتی اور کبھی خود کھلونا بن جاتی۔ مجھے یہ دنیا بڑی خوبصورت لگی ـــــ اور ایسا لگا کہ اگر میں نہ ہوتی تو یہ دنیا سونی سونی ہو جاتی۔ میرے طاقوں میں گڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں جو کہ خود ایک بڑی گڑیا تھی، چھوٹی چھوٹی گڑیوں سے کھیلتی تھی کبھی کبھی تو میں اپنی گڑیوں کا بیاہ رچاتی اور مجھے ایسا لگتا کہ میری گڑیا مجھے چھوڑ کر کہیں اور جا رہی ہے۔ میں سوچ سوچ کر روتی ـــــ لیکن یہ سب کھیل تھا ـــــ بڑا انوکھا کھیل ـــــ لیکن یہ سب سچ بھی تھا۔ اس میں حقیقت بھی تھی۔ اس راز کو میں نے اب جانا ہے۔ میں اپنے گھر کے کونے کونے سے آشنا تھی اپنے آس پاس کی فضا سے مانوس تھی۔ اور اسی آشنا گھر اور اسی مانوس فضا کو ایک دن میں نے آخری سلام کیا ـــــ میں نے اپنے طاقوں کی گڑیوں کو چھوڑا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے

آنگن میں چڑیوں کا غول کا غول آ کر بیٹھا، ابھی ابھی چہچہا رہا تھا کہ کسی نے پھر سے اڑا دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے ایک دن ہماری اچھی بھلی گائے کو کسی نے کھولا اور دوسرے کو دے دیا۔ سب دیکھتے رہ گئے ـــــ مجھے یاد ہے اس بھولی بھالی گائے نے کتنی حسرت سے ہم سب کی طرف دیکھا ـــــ بار بار دیکھا اور ہم سب دیکھتے رہ گئے۔ جس نے روپیہ دیئے تھے وہ اسے اپنے کھونٹے پر باندھنے کے لئے لے جا رہا تھا۔ اس میں شکایت کی کیا بات ہے ـــــ یہ ایک بڑی سچائی ہے ـــــ چڑیاں پھر سے اڑ گئیں ـــــ یہ بھی سچ ہے کہ گائے کو گھر کے آنگن سے کوئی کھول کر لے گیا ـــــ یہ بھی سچ ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے لوگ دیکھنے آئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہماری گائے کو دیکھنے آتے۔ بڑے غور سے دیکھتے ـــــ اپنی نظروں سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے اور میرے سارے بدن میں جھرجھری سی آ جاتی ہے ـــــ ہائے اللہ میں کیا کروں ـــــ یہ زمین کیوں نہیں پھٹتی کہ میں اس میں سما جاؤں ـــــ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے پیچھے کوئی سودا ہو رہا ہے۔ میرا ہی سودا۔ لیکن جب گائے کا سودا ہوا تھا تو میرے باپ کو روپے ملے تھے۔ چند روز کے لئے میرے گھر میں خوشحالی آئی تھی۔ میرا باپ مقروض تھا اس نے گائے بیچ کر قرض ادا کر دیا۔ میں سوچتی کاش میں لڑکی ہونے کے بجائے ایک گائے ہوتی۔ جس سے میرے ماں باپ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ـــــ لیکن میں گائے کی طرح ہونے کے باوجود گائے سے بھی زیادہ حقیر تھی ـــــ

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ان روز روز کے آنے والوں میں سے کسی کو میرے اوپر یا میرے ماں باپ پر رحم آ گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی گائے کو میرے آنگن کے کھونٹے سے لئے جا رہا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت جب میری گائے چلی گئی تھی تو اس کے بدلے خریدار نے میرے باپ کو اس کی قیمت دی تھی۔ میرے گھر میں چند روز کی خوشحالی آ گئی تھی۔ مہاجن کا قرض ادا ہو گیا تھا۔ لیکن یہاں تو کچھ اور معاملہ تھا۔ میرے باپ نے اس بار جو گائے دوسرے کو دی تھی۔ اس کے ساتھ روپیہ پیسہ بھی دیا ـــــ پہلا خریدار گائے کو لے کر خوش خوش گیا تھا۔ لیکن دوسرا خریدار منہ بناتا ہوا گیا۔ ہر طرف جشن منایا گیا ـــــ دعوتیں ہو رہی تھیں، باجے بج رہے تھے لیکن ایک حوا اپنی بیٹی کے لئے دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ کبھی لگتا کوئی پالکی جا رہی ہے اور کبھی محسوس ہوتا کوئی جنازہ اٹھ رہا ہے۔ ہر ایک کہہ رہا تھا کہ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ یہی نہیں جو کوئی مجھے دیکھنے آتا وہ میری قیمت عجیب طرح سے بتاتا۔ یہ بتاؤ کیا دیا ہے۔ میں بڑے ساز و سامان سے لدی ہوئی آئی تھی۔ بڑے زرق برق کپڑے پہنے تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ میرے نئے گھر والے چند روز تو مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگے رہے۔ اس کے بعد جب ان کو فرصت ملی تب مجھے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے زندہ ضرور تھی لیکن زندگی نہیں گزار رہی تھی۔ میں پریوں کی طرح فضا میں اڑ رہی تھی ـــــ زندگی تو اب گزار رہی ہے۔ جانور کو جب قربانی کے لئے لاتے ہیں تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے، بچہ بچہ اس کی خدمت کرتا ہے۔ اسے کھلاتے پلاتے ہیں اور بالآخر اس کو اپنے انجام پر پہنچنا پڑتا ہے

نئی فضا اور نئی دنیا مجھے راس نہ آئی۔ میں روتی رہی، لوگ ہنستے رہے اور پھر ایک روز انھوں نے اس گائے کو کھونٹے سے باندھا اور اس پر تیل چھڑکا اور آگ لگا دی ——— میں تو پہلے ہی جل رہی تھی لیکن اس بار جل کر راکھ ہو گئی۔

میں تم سے پوچھتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا، کیا انسان ایسا ہی کرتے ہیں، کیا دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ تم افسانے لکھتی ہو ——— کیا تمھارے پاس اس کا کوئی جواب ہے ——— تم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ عورت بھی تو ہو۔ کیا تم بھی یہی جواب دو گی کہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور جو عمل ہوتا آیا ہے اس پر حیرت کیوں ہو۔

"میں نے کبھی پھٹی آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ تم جل کر راکھ ہو گئی ——— پھر اب یہاں کیسے آئی"

میں نے تم سے کہا نہیں کہ میں حوا کی بیٹی ہوں۔ میری ماں مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی اور مرد کے جسم کی ایک پسلی کام آ گئی۔ کیوں کہ وہ تنہا تھا وہ سہارے کی تلاش میں تھا۔ میں عورت نہیں پیاسی بھی ہوں۔ وہ میرے بغیر کہاں چل سکتا تھا۔ اسے پھر میری ضرورت ہوئی۔ میں پھر پیدا ہوئی۔ کبھی میرے جسم کو کاڑا گیا ——— کبھی بے عزت کیا گیا ——— کیوں کہ لذت کی قیمت عزت بھی ہوتی ہے۔ میرا جسم بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ اس سے لذت حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن جس طرح چچوڑی ہوئی ہڈی کو لوگ پھینک دیتے ہیں، مجھے بھی پھینکا گیا ——— مجھے بھی ذلیل کیا گیا، رسوا کیا گیا لیکن بے حیا تھی ——— اس زندگی کے لئے دوبارہ جی اٹھی۔ میں نے بھگوان سے دعا کی تھی کہ مجھے اگلے جنم میں کبھی پھر وہی شوہر ملے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب قدرت کے قانون ہیں۔ ایسے ہی قانون جیسے برسات میں بارش تو ہوتی ہی ہے لیکن کبھی کبھی طوفان بھی آتا ہے اور اپنے لپیٹ میں ہر چیز کو لے لیتا ہے۔ اور انسان اس کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ کھڑی فصل برباد ہو جاتی ہے۔ میں مرتی رہی جیتی رہی ——— اور ہر بار شاید مجھے وہی مرد ملتا رہا کیوں کہ یہی دعائیں قبول ہوتی رہیں۔

ایک بار میں نے اپنی کوکھ سے مرد کو جنم دیا۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ تم پوچھو گی کہ یہ اطمینان تم کو لڑکی کو جنم دے کر کیوں نہیں ہوا۔ یہ بڑی معمولی سی بات ہے لڑکی کو جنم دے کر میں کیوں اپنے عذاب کے سلسلے کو جاری رکھوں۔ دنیا میں مظلوموں کی کون سی کمی ہے جو میں ایک مظلوم کا اور اضافہ کروں ——— ہاں تو میں نے ایک مرد کو جنم دیا اور اپنا سر فخر سے اونچا کیا۔ یہ بچہ بڑا ہوتا رہا۔ میں اپنا خون پلا پلا کر اسے پالتی رہی، مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ میرا ہی جسم ہے اور سچی بات بھی یہ ہے کہ وہ تھا بھی میرے ہی جسم کا حصہ جس طرح ہماری غذا ہمارے سارے جسم کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس غذا سے ہمارے جسم کا ایک ایک انگ فیض یاب ہوتا ہے۔ اسی طرح جو غذا میں کھاتی تھی اس سے وہ بھی طاقت حاصل کرتا تھا۔ میری صحت اس کی صحت تھی۔ میں نے اپنا خون اس کے بدن میں انڈیل دیا۔ اس کے جسم کو توانائی دی۔ اس کے بازوؤں میں طاقت آئی اور میں اس کو بڑھتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی۔

وہ لڑکپن کی سرحدوں سے گذر کر جوانی کی حدوں میں داخل ہوا۔ اس سے مجھے ایسا لگا کہ پیڑ کی ایک شاخ نے کٹ کر پاس کی زمین میں جڑ پکڑ لی ہے اور اب وہ اپنی غذا خود حاصل کر رہا ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کرتی جڑوں میں پانی دیتی، جب تیز دھوپ ہوتی تو اس پر آنچل ڈال دیتی۔ جب وہ لہلہاتا تو میں خوش ہوتی، اس کی نئی پتیاں میرے جسم کو توانائی عطا کرتیں۔

لیکن ایک روز اس پودے نے مجھ سے کہا "اے بوڑھے کھوسٹ پیڑ تو کس خیال میں ہے۔ تیرا زمانہ پورا ہو گیا اب کوئی آدمی کلہاڑی لے کر آئے گا اور تجھے کاٹ ڈالے گا اور تو ایندھن کی شکل میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔ تو کیوں میرے راستے میں کھڑا ہے۔"

میں نے کہا "بیٹے! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں تیری ماں ہوں۔ میں نے تجھے پیدا کیا ہے، تجھے پالا ہے اور جوان کیا ہے۔ تیری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے، میں تیری ماں ہوں۔

یہ سن کر وہ اور بپھر گیا ———

تم نے ایسا کون سا کام کیا جو دوسری عورت نہیں کرتی ——— تم نے مجھے پیدا کیا ——— ہر عورت بچہ پیدا کرتی ہے ——— تم نے مجھے دودھ پلایا، پالا پوسا ——— ہر عورت اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اسے پالتی پوستی ہے ——— کوئی نئی بات ہو تو بتاؤ ———"

واقعی میں نے کوئی نئی بات نہیں کی ——— حوا کی بیٹی آج تک یہی کرتی آئی ہے، اس کے ساتھ آج تک یہی ہوتا آیا ہے۔ پھر میں نے اپنے بیٹے کے لئے کیا نئی بات کی۔

مجھے تنہائی کا احساس ہوا۔ یہ تنہائی میری زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ میں جب گڑیاں کھیلتی تھی تب بھی تنہا تھی ——— جب میں ایک کھونٹے سے دوسرے کھونٹے سے باندھی گئی اور نئے گھر میں آئی ——— باجے گاجے کے ساتھ آئی تب بھی تنہا تھی۔ جب ایک مرد نے مجھے کسی ایسے قصور پر جلایا جو میرا اپنا نہ تھا، تو بھی تنہا تھی۔ کوئی میری مدد کو نہیں آیا۔ اور جب میں نے اپنے پیٹ سے کسی کو جنم دیا ——— میں روئی، چیخی چلائی ——— تو بھی میں تنہا تھی۔ میں نے اکیلے ہی جان پر کھیل کر ہر دکھ درد کو سہا ہے۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں۔ کسے اپنی مدد کو پکاروں ——— میں نے ہمت کر کے کہا "لیکن مجھے تیرے اوپر حق ہے۔ کیوں کہ تو میرا بیٹا ہے ——— میں نے اسی دن کے لئے تجھے پالا تھا کہ جب میں بے سہارا ہوں گی تو، تو مجھے سہارا دے گا۔"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو ——— کسی پرانے زمانے کی باتیں ——— یہ زمانہ ایٹم کا زمانہ ہے۔ مصنوعی سیارے کا زمانہ ہے۔ ٹیلی ویژن کا زمانہ ہے۔ انسان اب پہلا جیسا نہیں رہا۔ آج ہر نوجوان آزاد ہے۔ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے بناتا ہے اور اس میں وہ کسی کا دخل برداشت نہیں کر سکتا ——— تم نے اپنا زمانہ گزار دیا۔ اب مجھے

اپنی نئی زندگی گزارنے دو ـــــ میری اپنی مرضی ہے۔"

میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ مجھے اپنے بیٹے کے یہ جملے سن کر ہنسی آئی۔ ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ یہی ہوتا آیا ہے یعنی جو پہلے ہوا وہی اب بھی ہوگا۔ تم نے مجھے دودھ پلایا، پالا پوسا۔ ہر عورت اپنے بچے کو دودھ پلاتی اور اسے پالتی پوستی ہے۔ کوئی نئی بات ہو تو بتاؤ۔

ہاں نئی بات یہی ہے کہ یہ ایٹم کا زمانہ ہے مصنوعی سیاروں کا زمانہ ہے ـــــ کیا اس زمانے میں انسانی رشتے اسی طرح ٹوٹتے ہیں۔ کیا اس زمانے میں کسی کو کسی سے محبت نہیں ہوتی ـــــ کیا اس زمانے میں بھی لڑکی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ وہ کھونٹے سے باندھی جائے چڑیوں کی طرح سے گھر کے آنگن میں چہچہائے ـــــ پھر اسے کوئی دوسرا اس کھونٹے سے کھول کر لے جائے ـــــ پھر چڑیوں کو اڑا دیا جائے ـــــ مجھے محل دو محلے نہیں چاہئے ـــــ مجھے صرف دو گز زمین کی ضرورت ہے۔ کیا یہ ایٹم کا زمانہ ـــــ یہ مصنوعی چاند کا زمانہ ـــــ اگر مجھے کوئی اور حق نہیں دے سکتا تو کیا یہ مجھے دو گز زمین بھی نہیں دے گا؟ ـــــ کیا یہ مجھے بار بار پیدا ہونے کے عذاب سے نہیں نکالے گا؟

یہ سوال میں تم سے پوچھتی ہوں، اس لئے کہ تم عورت بھی ہو اور [illegible] فنکار بھی ـــــ کبھی تم کو وقت ملے تو اس عورت کی کہانی لکھنا جو میری کہانی بھی ہے اور تمہاری بھی۔

میں حوا ہوں اور حوا کی بیٹی بھی ـــــ میں تمہاری بہن بھی ہوں اور تمہاری ماں بھی اور اسی ایٹم کے زمانے میں سانس لے رہی ہوں۔ اس مصنوعی سیاروں کے زمانے میں جب کہ دنیا بدل گئی ہے اور بہت کچھ بدلنے کو ہے ـــــ میں بھی اسی عورت کی کہانی لکھنا چاہتی ہوں نئی کہانی ـــــ جو اس عورت سے مختلف ہو لیکن ابھی تو یہ عورت وہی ہے ـــــ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ـــــ وہی حوا اور حوا کی بیٹی بہن بھی اور ماں بھی ـــــ اور جو بار بار پیدا ہوتی ہے اور جس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو ہوتا آیا ہے۔ ☐

رشید امجد

۱۸۵-اے، نانک پورہ
راولپنڈی، پاکستان

اندھیرے کی بغل سے

بڑی غیر متوقع اور عجیب رات تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات لگا کر حملہ کیا ہے۔ اور آناً فاناً سارے شہر کو اندھیرے کی بغل میں لپیٹ لیا ہے۔

آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں نے شب خون مارا تھا۔

بادلوں کے آگے آگے دوڑتے ستارے جان بچانے کی کوشش میں دور گہرائیوں میں ڈوب ڈوب گئے تھے۔

بڑی سڑک پر دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔

قطروں کے گرنے، شٹر کیش کے کھنچنے کی اِکا دکا آوازوں کے درمیان، ہوا کی سرسراہٹ کا مسلسل احساس اور ایک عجیب بے یقینی کی کیفیت میں ذرا تیز تیز چلتا وہ۔

تعاقب کرتی آہٹ کا ایک ہی ردم،

دو شخص اسی کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے،

ہوا میں کوڑوں کی سرسراہٹ، بوند بوند گرتی بے یقینی،

اس کے قدموں میں تیزی آجاتی ہے،

تعاقب کرتی آہٹ کا ردم وہی،

وہ دونوں اس کی رفتار کا برابر ساتھ دے رہے ہیں۔

"تعاقب" خوف پہلوؤں سے بل کھاتا نکل جاتا ہے۔

وہ تیز ہو جاتا ہے اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے۔

وہ بھی تیز ہو جاتے ہیں۔

سامنے چوک ـــــ سمت کا انتخاب۔

پیدل کراسنگ کی بتی سرخ ہے لیکن وہ ٹریفک کی پرواہ کئے بغیر دوڑ پڑتا ہے اور گاڑیوں سے بچتا

بچاتا، ہانپتا کانپتا دوسری طرف نکل جاتا ہے۔

پیچھے آتے وہ دونوں سڑک کے درمیان پہنچ چکے ہیں۔

"تو تعاقب ـــــ" وہ دوڑ پڑتا ہے ـــــ دوڑتا رہتا ہے،

دوکانیں کب کی بند ہو چکی ہیں، لوگ گھروں کو جا چکے ہیں اور وہ اس تنہا اکیلی سڑک پر ہانپتی ہوا کے ساتھ قدم قدم چل رہا ہے۔

"وہ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟"

"کیوں؟"

فضا میں شعلہ لپکتا ہے۔ ہوا بجلی کے تاروں کو جھولے کی رسی کی طرح گھما رہی ہے۔

تار تار سے ٹکراتی ہے تو شعلہ لپکتا ہے اور پھر گھور اندھیرا ـــــ

اگر تار ٹوٹ کر مجھ پر آ گریں ـــــ؟

وہ جست لگا کر سڑک کے بیچوں بیچ آ جاتا ہے۔

یہ انتہائی غیر متوقع اور تاریک رات تھی،

یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے نے روشنی کی ایک ایک کرن کو چن چن کر نگل لیا ہے۔

وہ سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا ہے۔

اڑتی مٹی سے آنکھوں کو بچاتے، اسے خیال آتا ہے اگر اچانک کوئی تیز رفتار گاڑی آ جائے تو ـــــ

تو ـــــ

وہ سمٹ کے دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر آ جاتا ہے۔

ہوا تیز ہاتھوں سے سائن بورڈوں کو ڈھول کی طرح بجا رہی ہے۔

اس کے سر پر سائن بورڈوں کی قطار ہے۔

ہوا پھنکارتی ہے، خوف کا کتا اس کے گرد چکر لگاتا، بھوں بھوں کر رہا ہے۔

اگر کوئی سائن بورڈ مجھ پر آن گرے تو ـــــ

تو ـــــ

وہ اچھل کر پھر سڑک کے بیچوں بیچ آ جاتا ہے۔

یہ بڑی ڈراؤنی سرد رات تھی،

کھمبوں پر لگے ہوئے بلب تھک کر پیلے پڑ گئے تھے اور ٹمٹماتے ہوئے آخری ہچکیاں لے رہے تھے

وہ رک جاتا ہے۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے اور سڑک پر تقریباً اوندھا ہو کر سگریٹ سلگانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ہوا ہاتھوں میں تیر کمان لیے نشانے لگا رہی ہے۔

وہ سڑک کے درمیان بیٹھ جاتا ہے اور گھٹنوں میں سر دے کر ماچس جلاتا ہے۔ دفعتاً اسے خیال آتا ہے اگر ایسے میں کوئی گاڑی اس کے اوپر سے گزر گئی تو ـــــ

تو ـــــ

وہ اتنی تیزی سے اچھلتا ہے کہ سگریٹ منہ سے نکل کر دور جا گرتی ہے۔

یہ رات ٹوٹ ٹوٹ کر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی،

گمراہ گاڑھا اندھیرا تارکول کی طرح چیزوں کے منہ پر بہہ رہا تھا،

ایک طرف کی فٹ پاتھ پر بجلی کی تاریں اور تیز طوفانی ہوا،

دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر سائن بورڈ اور ہانپتی کانپتی پاگل ہوا،

سڑک کے بیچوں بیچ شاں شاں کرتی تیز گاڑیاں

"گھر ـــــ"

کہیں دور تاریکی میں ڈوبا ہوا گھر عکس کی طرح ہلتا جھلملاتا ہے،

تیز ہوا، ڈراؤنی شکلیں بناتے بادل

نہ ختم ہونے والی ہیبت ناک رات اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے،

چیزیں ـــــ اندھیرا

آواز ـــــ اندھیرا

پہچان ـــــ اندھیرا

رنگ ـــــ اندھیرا

وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا کبھی مڑ کر دیکھتا ہے کہ کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا۔ کبھی ایک طرف کی فٹ پاتھ پر نظر ڈالتا ہے جس کے اوپر بجلی کی تاریں ہوا کے زور سے پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ ان کے ٹکرانے سے بجلی کا شعلہ لمحہ بھر کے لئے اندھیرے میں چمکتا ہے۔ پھر تیز رو گاڑی اور موت کی سیٹی کا مسلسل شور، دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر بڑے بڑے سائن بورڈ ہل ہل کر اپنی اپنی بندشوں میں ڈھیلے ہو کر جھول رہے ہیں۔

سر پر گھرے گھنے امڈتے بادل اور دل ہلانے والی گڑگڑاہٹ،

سڑک کے بیچوں بیچ تیز گاڑیوں کے نیچے آ کر کچلے جانے کا خوف،

آگے گھور اندھیرا جس میں ڈوبے ہوئے گھر کا تصور —— ایک خواب —— محض ایک خواب،

اس خواب کے پیچھے قدم قدم چلتا وہ کبھی رک جاتا ہے، چل پڑتا ہے۔ پھر رک جاتا ہے آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھتا ہے، پھر چل پڑتا ہے۔ بادل پورا زور لگا کر چیختے ہیں اور بارش کا ایک بھرپور تھپیڑا اس کے منہ پر آ کر لگتا ہے۔ کھمبے کے اوپر زوردار دھماکا ہوتا ہے، شعلہ چمکتا ہے تو سڑک دور دور تک روشن ہو جاتی ہے، لیکن دوسرے لمحے جگنو کی طرح اندھیرے میں بجھ جاتی ہے۔ ایک سائن بورڈ چرچراتا ہے اور دھماکے سے نیچے آ گرتا ہے۔

وہ کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی درمیان میں ہونے کی کوشش میں سر سے پاؤں تک بھیگ جاتا ہے۔

عمریں بیت جاتی ہیں ——

برف سرا اور بوٹ کھمبوں کے ساتھ گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے لگ رہا ہے جیسے ٹھنڈک اس کے بدن پر ننگی ننگی انگلیاں پھیر رہی ہے۔

دروازہ کھلتا ہے اور اس کی بیوی لپک کر کہتی ہے —— "شکر ہے آپ ——"

پھر فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے —— "کون ہیں آپ؟"

"میں —— میں" وہ ہکلا کر رہ جاتا ہے۔

اندر سے اس کی بیٹی کی آواز آتی ہے —— "امی کون ہے؟"

"پتہ نہیں کون ہے؟" اس کی بیوی خوف زدہ سی آواز میں کہتی ہے۔

اور جلدی سے دروازہ بند کر لیتی ہے،

یہ بڑی غیر متوقع اور عجیب رات ہے،

یوں لگتا ہے جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات لگا کر حملہ کیا ہے اور آناً فاناً سارے شہر کو اندھیرے کی بکل میں لپیٹ لیا ہے، ▯

مرزا حامد بیگ

راولپنڈی، پاکستان

دِل کے موسم

اس بدکار کے داہنے گال پر تل ہے، اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ہیں اور بول ترشے ہوئے نگینے، جب بات کرتی ہے تو یاقوتی ہونٹوں کے نگینے اپنا رنگ بدلتے ہیں۔

اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے، گاؤ تکیے دھرے ہیں۔

وہ اوپر والے ماڑے میں رہتی ہے جہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اوپر جاتا ہوا، بل کھاتا چوبی زینہ بہت سنبھل کر قدم رکھنے پر بھی انگڑائیاں توڑتا ہے۔

نچلی منزل میں وہ رہتا ہے، جس نے یاقوتی ہونٹ نہیں دیکھے، اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ نگینے کس طرح رنگ بدلتے ہیں۔ بس سنا ہے کہ اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ہیں اور بول ترشے ہوئے نگینے، اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے اور گاؤ تکیے دھرے ہیں۔

پہلے پہل، جب وہ یہاں نیا نیا آیا تھا، اس شام اوپر کے ماڑے سے پھوٹتا ہوا نقرئی قہقہہ ہر طرف بڑھتے سرمئی اندھیرے کے پھیلاؤ میں جوار بھاٹا بن گیا تھا اور وہ لہروں کی مار پر اکیلا تھا۔ اٹھتی گرتی مترنم لہروں کے جھکورے اسے برآمدے میں لئے لئے پھرے۔ اوپر کے ماڑے میں ہونٹوں کے نگینے رنگ بدل رہے تھے اور وہ نڈھال برآمدے کی ریلنگ پر جھکتا چلا گیا تھا۔

اسی شام اس نے تیز دھوپ اور بارشوں سے سیاہ، چوبی زینے کی چرچراہٹ پہلی بار سنی تھی جوار بھاٹا ٹھہر گیا تھا اور کوئی بہت آہستہ، سنبھل کر قدم رکھتا اوپر سے اتر رہا تھا۔ نیچے آتی اکھڑی ہوئی سانسیں بل کھاتے ہوئے زینے میں چکر کھاتی، لڑکھڑاتی اندھیرے میں اندھیرا ہو گئیں۔

مہیب ٹھاٹھیں مارتی تاریکی رات بھر پرسکون رہی اور اس نے وہیں ریلنگ پر جھکے جھکے صبح کر دی۔

پھر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنے چاہنے والوں میں گھرتا چلا گیا۔

مدتیں گذر گئیں، وہ اس حجرے میں گوشہ نشیں، کمرے میں بچھی ہوئی صف پر اپنے

صادق العقیدت مریدوں کو حالات جذب میں استغفار کی دھیمی اور تیز صداؤں کے بہاؤ میں ڈوبتے ابھرتے دیکھتا رہا ہے۔

وہ اولین شام کے اندھیرے کا مترنم پھیلاؤ توبہ استغفار کے شور میں کہیں کھو گیا ہے۔

اس نے ہمیشہ اپنے مریدوں کے روبرو اس بدکار کے ذکر اذکار سے اجتناب برتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی حوالے سے یاقوتی ہونٹوں اور رنگ بدلتے ہوئے نگینوں کا ذکر چھڑ ہی جاتا ہے۔ صادق العقیدت مرید نہیں جانتے کہ استغفار کی دھیمی التجائیں کیسے آن کی آن میں تیز ندی کا روپ دھارتی ہیں اور ندی کی اٹھتی گرتی لہروں میں ان کا ہادی، مرشد بہتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے، اور اوپر کے ملبے سے بہت سنبھلے ہوئے قدم ڈگمگا کر چکر کھاتے ہوئے سرمئی اندھیرے کو سا جاڑ دیتے ہیں۔ چوبی زینے کی چرچراہٹ رات بھر کی ٹھاٹھیں مارتی پیاسی ہوتی ہوئی تاریکی میں کھو کر پرسکون ہو جاتی ہے۔

زمانے بیت گئے۔

اوپر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور اس نے دیکھا نہیں بس سنا ہے کہ اس کے داہنے گال پر تل ہے اور اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ......

وہ جانتا ہے کہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے بھاؤ بتاتے ہوئے وہ اکثر اس پر چوٹیں کرتی، پھبتیاں کستی ہے۔ اس نے بھی اسے کبھی اچھے حوالوں سے یاد نہیں کیا، لیکن وہ اولین شام کے اندھیرے کا پھیلاؤ اب ایک مشکل بنتا جا رہا ہے۔

کہتے ہیں برے دنوں میں یاقوت مصیبت اپنے سر لیتا ہے۔

جوار بھاٹا تھم نہیں چکتا، اندر کی ہر شے تہہ و بالا ہو گئی ہے۔

گذشتہ کئی روز سے سب کا ہادی، مرشد خاموش ہے، مریدوں کو حجرے تک آنے کی اجازت نہیں۔

وہ برآمدے کی ریلنگ پر جھکے جھکے صبح کرتا ہے اور اسی صورت میں شام۔ سرمئی اندھیرا، خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے، پھیلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔

باہر زینہ بھی خاموش ہے۔ بہت دنوں سے اوپر بھی کوئی نہیں گیا۔

آج شام سمیت تمام شامیں گونگی ہیں، اور وہ ریلنگ پر ترازو، دونوں جانب جھول گیا ہے۔

صدیاں گذر گئیں۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی آج پہلی بار اپنی بالکنی تک آئی ہے۔

نیچے یکایک جانے کہاں سے اتنی خلقت امڈ پڑی ہے۔ تیز سیٹیوں کے شور میں سب گرتے پڑتے

اوپر ہی کھنچے چلے آتے ہیں۔ اتنے چہروں میں دمکتے صادق العقیدت مریدوں کے چہرے، ریلنگ پر ترازو مرشد کی آنکھوں میں دھندلا جاتے ہیں۔ چوبی زینہ بوجھ سے کوکڑاتا ہے۔

مرشد برامدے کی ریلنگ سے گھسٹتا، اندر حجرے سے اوپر جاتی ہوئی، ان سیڑھیوں تک آتا ہے، جن کے دروازوں میں قفل ڈال دیا گیا تھا۔

باہر سیٹیوں اور تالیوں کا شور بھری ہوئی تاریکی کے مستقل ریلے میں جو بل کھاتے چوبی زینے سے ہوتے ہوئے بند دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔

یکایک شام کے سرمئی اندھیرے کے پھیلاؤ میں، یاقوتی ہونٹوں کے بول، ترشے ہوئے نگینے اپنا رنگ بدلنے لگتے ہیں۔

سب شانت، ہر طرف سکوت چھا جاتا ہے۔

وہ بالکنی سے جھک کر کھانستی ہوئی بہت ٹھہر ٹھہر کر ہمیشہ کے لئے دھندہ چھوڑ دینے کا اعلان کرتی ہے۔ اب ہر طرف سے احتجاج کرنے والے امڈ رہے ہیں۔

کہتے ہیں برے دنوں میں یاقوت......

مرشد —— سرمئی اندھیرے کی اٹھتی گرتی، مترنم لہروں پر تنکا تھا جو بہتا ہوا کانپتے ہاتھوں سے اوپر جاتی تاریک سیڑھیوں کا دروازہ کھولتا ہے۔

پہلی سیڑھی پر قدم دھرتا ہے۔

باہر کا شور مدھم پڑتا جا رہا ہے، اور چوبی زینے کی ٹوٹتی انگڑائیاں۔

دوسری سیڑھی کے بعد تیسری۔

کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ لڑکھڑاتے قدم۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر کی جانب رواں ہے۔ سیڑھیوں کی تاریک سنسناہٹ میں کوئی بہت آہستگی سے سنبھل کر قدم رکھتا اس کے قریب سے ہو کر، نیچے حجرے کی جانب نکل جاتا ہے۔

یہ اپنی دھن میں اوپر پہنچتا ہے۔

اوپر پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ بے سجائے دو خالی کمرے ہیں۔ ایک میں چاندنی بچھی ہے۔ گاؤ تکیے دھرے ہیں۔ ایک طرف کپڑے سے ڈھکے ہوئے ہارمونیم، طبلہ اور چمڑے میں منڈھے ہوئے گھنگھروؤں کی ایک جوڑی ہے۔ بالکنی میں رنگین چلمن، اندھی ہوا، کے ساتھ جھول رہی ہے اور نیچے سیٹیاں، شور، اس سے صادق العقیدت مرید —— ☐

کنور سین
۴۳۔ ای، ویسٹ پٹیل نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

بھومکا

کتاب ملاوی کے نام!

میرے فن کی تختی پر ابھرتی عبارت کو پڑھتے ہوئے ملاوی کے ہونٹوں پر جمی خاموشی پگھلنے لگی:

پھر وہی بات۔ آج پھر تم...

ملاوی بولتی ہے تو اندر باہر سن ہو جاتا ہے۔ اوپر نیچے ویرانی پھیل جاتی ہے۔ آس پاس ندامت سے بھر جاتا ہے۔ سب کچھ چھوٹا پڑنے لگتا ہے۔ سمندر اور لہر، آبادی اور شہر —— ناؤ، مانجھی ساحل —— کسی میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔

اس بار بھی ملاوی کے چہرے پر پھیلا مہین جال جاگ اٹھا:

ابتدا کئے بغیر اختتام تک پہنچنے کا دعوےٰ کرنے کی مورکھتا کب تک کرتے رہوگے۔ جو ہے ہی نہیں اسے میرے نام کرنے میں کیا تک؟ میں کتنی بار بتاؤں کہ جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے سے مختلف نہیں ہے۔ جو ہونے والا ہے اس میں مجھے وشواس نہیں۔ تم ہو کہ شروع کئے بغیر کتاب کے مکمل ہو جانے کے وہم کا شکار ہو جاتے ہو۔ تم ہی بتاؤ —— راستے اور منزل میں بھید ہے یا نہیں؟ لیکن تم...!

مجھے اپنی طرف خالی نظروں سے دیکھتے پاکر ملاوی جھلّا اٹھی:

کورے کاغذ اور خالی دامن سے زیادہ بھیانک چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔ میں جانتی ہوں تم نہیں جانتے —— سفر راستے طے کرنے کو نہیں کہتے —— میں کیا کروں کہ تم کہانی اور بھومکا کے فرق سے واقف نہیں ہو۔ اسی لئے...

سسی فس کا شراپ بھی شدید ہے۔ میں ہر بار اس کے بارے میں بتاتی ہوں۔ وہی جو پہاڑ کے دامن میں بڑی چٹان کو ڈھلان پر اوپر کو دھکیلتا ہے کہ اسے چوٹی پر پہنچا دے لیکن چوٹی سے ذرا ادھر پہنچتے ہی چٹان اس کے بس سے باہر ہو کر نیچے کو لڑھک جاتی ہے۔ پھر وہی قصہ —— دامن میں بڑی چٹان اور سسی فس کا اپنی ہر دائی جیت پر ایمان!

ملاوی ماضی کے کھنڈر سے لوٹ آئی:

شاید پرانی بات پر تمھیں وشواس نہیں آتا... میں جانتی ہوں تمھیں نئی دیو مالا چاہیے۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ بات نہیں بدلتی۔ تم آج بھی سکھ بھوگ سکتے ہو نہ سوگ منا سکتے ہو۔ ورنہ ستیہ دھام کا مکھیا مُکتی کام میرے من کے پردے پر کیوں آتا۔

گانو میں موت ہو جاتی۔ مرنے والے کے سگے سمبندھی رونے پیٹنے لگتے۔ سبھی اداس من کے ساتھ ارتھی کے ساتھ چلتے۔ مکتی کام کی الگ بات۔ وہ ہنستا، کھڑتال بجاتا، ناچتا گاتا ارتھی کے آگے آگے چلتا۔ انوکھے سُر میں ایک ہی رٹ لگاتا:

قبریں ہمارا انتظار کرتی ہیں
جیسے مائیں بیٹوں کا
بیٹے کو ماں کی گود میں لیٹنے کا کیا غم
کیسا رونا دھونا!
کیسا ماتم!

مکتی کام کے جوان بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا۔ لوگ لاش کو شمشان میں لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ مکتی پاؤں میں گھنگھرو باندھنے لگا۔

سب کو وشواس تھا مکتی کام موت اور زندگی سے بے نیاز ہو گیا۔ سب نے دیکھا...!

ملاوی رکی اور میری بدحواس آنکھوں میں جھانکنے لگی:

ضروری نہیں میں تمھیں بتاؤں مکتی کام کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ جو پردے پر ہو رہا ہے وہ پردے کے پیچھے ہونے والے سے الگ ہے۔

ملاوی چیخ اٹھی:

گھنگھرو کا کام بجنا ہے۔ پھر وہ خاموش کیوں ہو جاتا ہے۔ لوگ سسی فس کے بارے میں کچھ بھی کہیں میں نہیں مانتی۔ انتہا اور اختتام کو دیکھ سکنا اور ان کی جستجو میں مارے مارے پھرنا ڈرامے کا ڈراپ سین! لیکن ڈرامہ شروع تو ہو! آگے کا سوچ کر پیچھے لوٹ آنا!

ملاوی نے آہ بھری:

مہابھارت کا یدھ سماپت ہو چکا تھا۔ پانڈو جیت کا ماتم منا رہے تھے۔ کوروؤں کی لاشیں یدھ کے میدان میں بکھری پڑی تھیں۔ مہارانی گاندھاری کے ایک سو ایک بیٹوں کی لاشیں۔ ماں کا

کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ ایک ایک لاش کو دیکھتی سینے سے لگاتی ہوئی ولاپ کر رہی تھی۔ کرشن کو اپنی تباہی کے لئے ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی۔ اسے بددعا دیتی ہوئی اپنے بیٹوں کو پکار رہی تھی۔

دن ڈھل گیا۔ رات کی نحوست یُدھ کے میدان پر چھانے لگی۔ منظر سیاہ پڑنے لگا۔ سب کچھ ہولناک نظر آنے لگا۔ دور تک بچھی لاشوں کے درمیان بیٹھی گاندھاری نے رونا پیٹنا، سسکنا سبکنا بند نہ کیا۔

رات گہری ہوئی تو کرشن کو گاندھاری کا خیال آیا — بےچاری ماتا کی ماری صبح سے بیٹوں کی موت کا ماتم کر رہی ہے۔ نہ بھوک کا خیال نہ پیاس کی فکر۔ اسی طرح ہلکان ہوتی رہی تو.....

کرشن بھوجن لے کر یدھ کے میدان میں پہنچے۔ تھالی گاندھاری کے آگے رکھ کر بولے:

سنسار کا کوئی دکھ بھوک کو بھلانے میں مدد نہیں کرتا۔

کرشن کی بات سن کر گاندھاری تڑپ اٹھی:

او پاپی! تو پرش ہے۔ استری کی ذات کو نہیں جانتا۔ ماں کی کوکھ کے دکھ کو نہیں پہچانتا۔ تجھے کیا معلوم ماتا کس انتہا کو چھو سکتی ہے۔

گاندھاری نے بھوجن سے بھری تھالی پرے ہٹا دی۔ وہ پھر ولاپ کرنے لگی۔

کرشن مسکرائے۔ اپنے اڈے کو لوٹ آئے:

منیشہ نہیں جانتا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

رات آدھی سے زیادہ گذرتے ہی گاندھاری تھکاوٹ کا احساس کرنے لگی۔ دھیرے دھیرے غم کی آنچ ماند پڑنے لگی اور پیٹ کی آگ سلگنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بیٹوں کو بھول کر بھوک کی پکار سننے لگی۔ اسے بجھانے کی چنتا کرنے لگی۔ کرشن جا چکے تھے۔

بدحواس گاندھاری نے آس پاس نظر دوڑائی۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ذرا فاصلے پر انار کا پیڑ کھڑا تھا۔ شاخوں سے لٹکتے پکے ہوئے سرخ انار گاندھاری کو بلا رہے تھے۔ مہارانی اٹھی۔ پیڑ کی طرف بڑھی۔ اسے یقین تھا انار اس کی پہنچ میں ہیں۔

لیکن انار کے پیڑ کے نیچے پہنچتے ہی گاندھاری نے دیکھا پھل اس کی پہنچ سے ہاتھ بھر اونچے لٹک رہے ہیں۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ دوسرے ہی پل وہ لپکی۔ پاس پڑی ایک بیٹے کی لاش گھسیٹ لائی۔ لاش کو پیڑ کے نیچے رکھ کر اس پر کھڑی ہو گئی۔

گاندھاری کی حیرانی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ پھل اب بھی اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ وہ لاش سے اتری۔ دوسرے بیٹے کا مرا ہوا شریر گھسیٹ لائی۔ اسے پہلے بیٹے کی لاش پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھل اب بھی اس

کی پہنچ سے باہر تھا۔

بھوک سے پاگل گاندھاری نے لاشوں کا مینار کھڑا کر دیا — اپنے بیٹوں کی لاشوں کا مینار!

ملاوی سسکنے لگی:

سمجھوتے اور جیت میں بڑا فرق ہے۔ میرے بچے۔ تم اسے سمجھے بغیر ہی کتاب لکھنے...

پلیگ کا زور تھا اور موت کا ناچ۔ تمہارے پچھلے جنم کی بات ہے۔

میں نے ماتا، موت اور بھوک پر اس طرح کبھی دھیان نہ دیا تھا۔

گاؤں کے ہر گھر میں لاش پڑی تھی۔ مرنے والے زیادہ تھے انھیں ٹھکانے لگانے والے کم۔ کوئی کسی کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔

میرے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ گھر میں ہم دونوں کے سوائے تیسری جان نہ تھی۔ تمھارا باپ تمھارے پیدا ہونے کے بعد جلدی مر گیا۔ میں تمھیں گھر سے باہر نہ جانے دیتی۔ چوہوں کو گھر میں نہ آنے دیتی۔ لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔

ملاوی اور بھی زور سے سسکنے لگی۔

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ لوگ گھر میں پڑے مردے کے پاس بیٹھ کر کھانا شروع کر دیتے۔ کئی ایک دن اپنے ساتھ شمشان میں لے جاتے۔

مجھے معلوم نہ تھا — شریر کے قرض اور من کے فرض کے بیچ کی کھائی اتنی گہری ہوتی ہے۔

ملاوی نے میلے آنچل سے آنسو پونچھے:

ایک صبح تم مجھ سے پہلے جاگ پڑے۔ تم نے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ دہلیز پر مرا پڑا چوہا اٹھا لیا اور مجھے آواز دی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ تمہارے ہاتھ میں چوہا دیکھ کر میری روح سن ہو گئی۔ میں نے ماتھا پیٹ لیا۔

شام ہوتے ہوتے تمہاری بغل میں گلٹی نکل آئی۔ تم بخار سے تپنے لگے۔ پتہ نہیں کیا کچھ بولنے لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے سارا تماشہ گھوم گیا۔ میں کانپ اٹھی۔ دوسرے پل میں نے فیصلہ کر لیا۔

ملاوی کی آواز لرز اٹھی:

گاؤں میں لکڑی ختم ہو چلی تھی۔ جس شام تمہاری موت ہوئی گاؤں میں بچے کھچے چند لوگوں کے

پاس کھانا بنانے کے لئے بھی ایندھن نہ تھا۔ بہت سارے مردے کتوں اور گدھوں کی خوراک بننے کو باہر کھیتوں میں پھینک دیئے گئے تھے۔

میں نے گھر کے کواڑ الگ کر کے آنگن میں تمھاری چتا تیار کی۔ جب چتا دہک چکی تو میں چونکی۔ میرا پیٹ آنچ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے پیٹ کو بہت دبایا لیکن اس کا دوزخ برابر دھڑکتا گیا۔ میرا فیصلہ!

شرمسار نگاہوں سے میں نے چتا کے گرد کھڑے لوگوں کو دیکھا:
تم سامان لے آؤ، کھانا بنانے کا سامان لے آؤ۔
علاوہ سب کچھ بھون کر [illegible] میری آنکھوں میں اتر گئی
لوگوں کے آنے سے پہلے میں چتا پر ہانڈی چڑھا چکی تھی ☐

FORM IV (See Rule 8)

1 Place of publication — ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
2 Periodicity of its publication — دو ماہی
3 Printer's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
4 Publisher's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
5 Editor's Name — اطہر پرویز
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
6 Names and address of individuals who own the newspapers and partners or shareholders holding more than one percent of the total capital
اسد یار خاں (مالک)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

I, ASAD YAR KHAN, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Dated 1-3-81

Signature of Publisher
Asad Yar Khan

شعبۂ اردو، گورنمنٹ ویمنس کالج
گردنی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۲

شمیم صادقہ

طرحِ دیگر

ذہانت اس طوفانی ندی کی طرح ہے جس کا بہاؤ، اگر راستہ نہ ملے تو بندھ توڑ دیتا ہے ــــ میں بھی ذہین تھا، بے حد ذہین! یہ بات بچپن سے ہی میرے شعور میں منجمد تھی ــــ حالات اور افراد کا دائرہ ہی کچھ ایسا تھا۔ بچپن میں جب میری مکتب کرائی گئی اور مولوی صاحب مجھے پڑھانے لگے، انھوں نے اکثر ابا سے کہا تھا ــــ

"آپ کا بیٹا ــــ ماشاءاللہ، بہت ذہین ہے" ــــ

پتہ نہیں یہ لفظ ذہین کیا بلا ہے ــــ میں ابا کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ــــ تعبیر ان کے الفاظ میں نہ تھی ــــ اور مخصوص مسکراہٹ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی تابانی ان دنوں میرے لئے دھندلی کتاب کے حروف جیسی تھی ــــ پھر بھی مجھے محسوس ہوتا جیسے یہ لفظ 'ذہین'، جو کچھ بھی ہے، بہت قیمتی ہے، انوکھا ہے، قابلِ قدر ہے، شیشے کی طرح سنبھال کے رکھنے جیسا ہی کچھ ہے۔ اسی لئے میں اور زیادہ انہماک کے ساتھ جیم کے دائرے کی مشق کرنے لگا ــــ

میں مدرسے میں داخل کیا گیا ــــ وہاں بھی یہ لفظ مجھ سے منسلک کر دیا گیا ــــ دو سال بعد ہی، اسی لفظ ہی کی بدولت میرا داخلہ ہائی اسکول میں ہو گیا ــــ اور یہیں سے میری شخصیت کے سلف کنٹراڈکشن (SELF CONTRADICTION) کا آغاز شروع ہوا تھا۔ کیوں کہ ہائی اسکول میں پڑھائی کم اور پڑھائی کا رعب زیادہ تھا۔ سینیر لڑکوں کو خواہ مخواہ سزائیں دی جائیں ــــ اور کریدنے والوں کو پہلے ہی سوال پہ اس طرح ڈسکریج کیا جاتا کہ آئندہ کلاس میں کھڑے ہو کر ریڈنگ لگاتے ہوئے خواہ کتنے ہی سوال ذہن میں آئیں وہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکیں اور ماسٹر جی کا اونگھتا ہوا ذہن ڈسٹرب نہ ہو میرے ساتھ بھی یہی ہوا کرتا، پھر بھی، آہستہ آہستہ میں جان گیا تھا کہ میری ذہانت کا رعب یہاں بھی قدم جما چکا ہے ــــ کیوں کہ اب میرا شعور بالیدہ ہو رہا تھا۔ بڑھتا ہوا شعور اردگرد کی مناسب فضا سے اپنا سپورٹ چاہتا ہے۔ مگر یہاں ایسا نہ تھا، بلکہ ایک اور بات کیکڑے کی طرح میرے اندر

پنچے گاڑنے لگی کہ میرے پاس چند لڑکوں کی طرح چمچاتے ہوئے جوتے نہیں ہیں ـــ میں صرف سمبار کے دن دھوبی کے یہاں سے دھل کر آنے والے آئرن شدہ کپڑے پہن سکتا ہوں کیونکہ دھوبی اتوار کے اتوار ہی آتا ہے ـــ اگر کسی دن نہ آئے تو مجھے اس کے گھر جانا پڑتا ہے ـــ کیونکہ سمبار کے دن پی۔ ٹی ہوتی ہے ـــ اور کرخت کپڑوں کی وجہ سے پی۔ ٹی ٹیچر فرما سر لائن سے باہر کر دیں گے اور امیر لڑکوں کی وہ مخصوص جماعت مجھے تیز کرنے کے لئے بے ساختہ ہنسنے لگے گی۔ پھر بھی میں کچھ نہیں کر سکتا ـــ یہ آئرن تو ایک دن میں ختم ہو جاتا ہے ـــ لیکن مجھے انھیں کپڑوں کو ہفتہ بھر گھسیٹنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ میرے پاس صرف دو جوڑے ہیں، وہ بھی سوتی ـــ میں آئرن نہیں کر سکتا کیوں کہ نہ تو گھر میں آئرن ہے اور نہ ماں پیسے دیں گی۔ ان لڑکوں کے قہقہوں سے لگتا ہے جیسے انھیں میری مجبوریوں کا اندازہ ہے ـــ اور مجھے ان سے بے پناہ نفرت ہے ـــ وہی نفرت جو احساس کمتری کا ردعمل ہوتی ہے۔ یہ لوگ صرف پاس ہوتے ہیں، پھر بھی اتنے ٹھسے اور رعب میں رہتے ہیں۔ جیسے ساری جماعت ان کے باٹا کے ناٹی شو کے نیچے ہو ـــ سبھی ان سے ڈرتے تھے۔ یہ اپنے احسانوں کی خیرات سے سبھوں کو قبضے میں رکھتے تھے ـــ کسی کو پینسل دے دی۔ کسی کو ربر اسکیل۔ کسی کو پریکٹیکل باکس تو کسی کو ٹفن کے وقت اپنی آئس کریم اور چاٹ میں شریک کر لیا ـــ

میرا ہوم ورک اور کلاس ورک یکساں شاندار ہوتا لیکن اس کی اہمیت صرف اس وقت تھی جب کاپیاں جمع ہوتیں اور ٹیچر ساری کلاس کے سامنے مجھے کہتے ـــ

"ول سمیع ـــ دیکھو نالائقو! ـــ سوال یوں کیا جاتا ہے ـــ" بیشتر لڑکے ورک نہ کرنے کی وجہ سے کھڑے رہا کرتے اور یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہتے جیسے نااہلی بھی ایک اجتماعی اہلیت کا ثبوت ہو۔

میں بالکل اکیلا تھا۔

غریب اور ذہین!!۔

تنہا اور اداس!!!۔

اور یہ تنہائی مجھے بہت بڑی سزا محسوس ہوتی ـــ اداسی کا اندھیرا تل تل بڑھتا جاتا ـــ اور اکثر مجھے خواہش ہوتی، میں بھی ایک عام طالب علم ہوتا ـــ ہجوم میں گم ہو کر رہنے والا ـــ میری اپنی کوئی شناخت نہ ہوتی ـــ مگر میں اکیلا نہ ہوتا ـــ بلکہ سب میں مل کر ملے لمحے کی

خوشی سے سرشار ہوتا ـــ دوسروں کے ساتھ مل قہقہے لگاتا ـــ اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں کو آپس میں بانٹ کر ایک بڑے کل کا جزو بن جاتا ـــ اکثر میری خواہش ہوتی، ٹفن میں، یا ایک گھنٹی کے ختم ہونے کے بعد دوسری گھنٹی کے آغاز کے گیپ میں کسی کے بنچ پر جا کر ان کی باتوں میں شریک ہو جاؤں ـــ دو ایک بار گیا بھی ـــ لیکن وہ سب اپنے آپ میں اتنے مگن ہوتے کہ کوئی میری نوٹس نہ لیتا ـــ بلکہ اکثر مجھے چڑا کے کہتے ـــ

"ہاں بھئی مسٹر پڑھاکو ـــ کیا اپنا سین چاہیے" ـــ کبھی ٹفن میں ان کے نزدیک جاتا تو سب کے سب ہنس پڑتے۔ "ٹفن نہیں لائے ہیں آپ ـــ ہاں بھئی پڑھنے کی وجہ سے یاد نہیں رہا ـــ آیئے ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے۔ کلاس کی عزت جو ہوئے" ـــ

میں روہانسا ہو کر بھاگ جاتا ـــ

کبھی میرے پہنچتے ہی وہ سب کے سب یوں چپ ہو جاتے جیسے کوئی خاص بات ہو رہی ہو ـــ اور مخل ہوا ہوں ـــ میں یوں بھی کم گو تھا ـــ خود سے گفتگو کا کوئی سلسلہ شروع کرنا چاہتا، مگر مجھے الفاظ نہیں مل پاتے اور نہ کوئی موضوع سمجھ میں آتا ـــ اگر ہمت کر کے پوچھ بیٹھتا۔

"شاہد ـــ کیا باتیں ہو رہی ہیں بھئی" ـــ

تو شاہد طنز سے کہتا ـــ

"مسٹر بک ورم ـــ تمہارے چہرے پہ تو صرف پڑھائی لکھی ہے ـــ تم سے کیا باتیں کی جائیں" ـــ

وہ فخریہ اپنے دوستوں کی طرف دیکھتا اور اس کے اس ریمارک پہ سب کے سب مسکرانے لگتے۔

میں اپنی سرمت شدہ چپل ـــ بغیر کریز کے کپڑے اور سرسوں کے تیل میں بھیگے ہوئے بالوں کو محسوس کر کے خود بخود پیچھے ہٹ جاتا ـــ

یہ لوگ اپنی دوستی ـــ اپنی گروپ بندی میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں ـــ میں ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے درمیان کوئی خلا نہیں، جہاں میں فٹ ہو سکوں ـــ

آہستہ آہستہ، ڈر کر، تھک کر اور ہار کر میں کتابوں کی طرف سمٹتا گیا ـــ سمٹتا گیا ـــ صبح پڑھائی ـــ اسکول میں پڑھائی ـــ شام کو گھر کا سودا سلف لانا ـــ لالٹین صاف کرنا ـــ بستر کرنا ـــ اور پھر مغرب کے بعد روٹی سبزی کھا کر رات گئے تک پڑھتے رہنا۔ چند سال کیسے بیت

گئے۔ مجھے احساس بھی نہ ہو سکا۔ اسکول کی تعلیم کا یہ دور جو بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ انوکھا اور خواب آفریں ہوتا ہے، مجھ سے چھنتے گئے۔ میں نے یہ عرصہ، معیاد قیدی کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر کاٹا ـــــ میرا وہاں کوئی دوست نہ تھا۔ باتیں سبھی کرتے، مگر یوں جیسے کسی دشمن سے سرِراہ ملاقات ہو گئی ہو ـــــ اگر میں ناغہ کرتا تو دوسرے دن کوئی بے تابی سے یہ نہ پوچھتا ـــــ

"بتاؤ۔ کل کیوں نہیں آئے ـــــ میں دن بھر بور ہوتا رہا" ـــــ بلکہ میں خود ہی کسی کو وجہ بتانے لگتا۔ اور میری بات سنی ان سنی کر کے وہ کہہ دیتا ـــــ

"اوہ! ـــــ کل تم نہیں آئے تھے کیا؟" ـــــ

اور میں خود کو اور بھی چھوٹا محسوس کرنے لگتا ـــــ وقت تو بہتا دریا ہے ـــــ میں میٹرک میں آیا ـــــ ٹسٹ ہوا اور سنٹ اپ بھی ہو گیا ـــــ مگر ان دنوں کی یادیں اب بھی میرے اندر محفوظ ہیں ـــــ کہ میں سنٹ اپ ہو کر کتنا خوش تھا ـــــ کیوں کہ اس گھٹن آمیز ماحول سے مجھے نجات مل گئی تھی ـــــ میں نے پوری لگن کے ساتھ خود کو کتابوں میں ڈبو دیا ـــــ کتابوں کی دنیا مجھے بہت عزیز تھی ـــــ بڑے بڑے علما کی کتابیں ـــــ اونچے آدرش کی باتیں ـــــ زندگی اور موت کے فلسفے ـــــ عروج اور زوال کی اصلیتیں ـــــ حق اور ناحق کی جنگیں ـــــ کتابوں میں کتنی گہرائی، کتنی وسعت تھی ـــــ اب میرے ذہن کی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی۔ میں چیزوں کو فیکٹرز کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا، سمجھ سکتا تھا، پہچان سکتا تھا ـــــ اسی لئے اب میں محسوس کرنے لگا، میرے یہ ساتھی جو اسمگل شدہ کپڑوں اور اپنے گھر کی بدیسی چیزوں کی اتنی تعریف کرتے ہیں ـــــ اپنا کلچر کھو کر، پرجس ماحول میں رہنے کا فخر محسوس کرتے ہیں وہ دراصل ذہانت اور دریافت کی گہرائی سے کتنی دور ہیں ان کی زندگیاں کتنی کھوکھلی ہیں اور اس کھوکھلے پن پہ انھیں کتنا غرور ہے ـــــ سلی پیپل (SILLY PEOPLE) آہستہ آہستہ مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ـــــ لیکن نہ ابھی خوف پوری طرح ختم ہوا تھا۔ نہ ہمدردی اور سلف کا چہرہ کھل کر سامنے آیا تھا ـــــ اسی لئے ذہنی آئینے کا مادی سطح پر سامنا کرنے کی ہمت ابھی مجھ میں نہ تھی۔ اسی لئے ایڈمٹ کارڈ لینے کے دن جب میں ایک بار پھر ان کے درمیان گھر گیا تو مجھے پھر اپنے نظریات کھوکھلے محسوس ہونے لگے۔ اور لگا جیسے میں جن باتوں کو زندگی کا حصول سمجھتا تھا وہ سب کی سب آؤٹ ڈیٹیڈ چیزیں ہیں ـــــ لکھنے والوں نے دراصل اپنی محرومیوں کو پرانے لفظوں میں لپیٹ ڈالا ہے۔ نقاب کے لئے ـــــ ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا جیسے ان لوگوں کے سامنے میرا قد چھوٹا ہے۔ میں بونا جیسا ہوں ـــــ اور جب کوئی خود کو ڈوارف (DWARF)

سمجھنے لگتا ہے تو جمناسٹک آرٹ کی کشش بہت بڑھ جاتی ہے ـــــ میرے اندر بھی کچھ ایسی ہی رسہ کشی تھی ـــــ

اس کے بعد کے چند سال بڑی تیز روی کے تھے۔ میٹرک کی شاندار کامیابی کے بعد میں نے انٹر سائنس میں داخلہ لیا ـــــ اور یوں تندہی کے ساتھ پڑھنے لگا جیسے کوئی فائیو ہنڈرڈ میٹرس ریس کے آخری حصے میں دوڑتا ہے۔

اب زندگی کے اصلی چہرے کے خدوخال مجھے نظر آنے لگے۔ زندگی کا کلوز اپ، بڑا کریہہ تھا ـــــ زندگی حقیقی معنوں میں کیا ہوتی ہے اور کیا پیش کی جاتی ہے ـــــ اور کیا نظر آتی ہے ـــــ لائف فار شو اینڈ شو فار لائف ـــــ

بہتر اور تیز اسٹوڈنٹ بھی اتنا متاثر نہیں کر سکتے جتنا کہ وہ جو کند ذہن ہونے کے باوجود اسمارٹ ہوں۔ فٹ فاٹ میں ہوں۔ اور امریکن طرز کی انگریزی بول سکتے ہوں۔ کانونٹ پروڈکٹ کا میکس یہاں بھی تھا ـــــ

دیکھتے دیکھتے میں نے میڈیکل میں داخلہ لے لیا۔ کیوں کہ ان دنوں ایڈمیشن ٹسٹ، پیروی کا اتنا زور نہیں تھا۔ صرف رزرٹ اور نمبر پر ہی داخلہ ہوتا تھا ـــــ اور میری یونیورسٹی میں سکنڈ پوزیشن تھی ـــــ پتہ نہیں کیوں گلیمر اور شور سے خوف زدہ ہونے کے باوجود میں نے کانٹوں سے اٹے ہوئے اس راستے کا انتخاب کیا تھا ـــــ دراصل میرے اندر کہیں مردِ آہن سو رہا تھا۔ اور میں نے حالات کا ایک آہنی وار کر کے اسے جگانے کا ارادہ کر لیا تھا حالانکہ میں جانتا تھا۔ ایم بی بی ایس اور پھر ایم۔ ایس کر لینا اتنا مشکل نہیں تھا، جتنا کہ خود کو معاشرے میں بہ حیثیت اچھے ڈاکٹر کے انٹروڈیوز کرنا مشکل تھا ـــــ پھر بھی میں چونکہ بہت ذہین تھا، اس لئے بے حد ضدی بھی تھا ـــــ اور جب ضد تھی تو قوت احتجاج بھی ـــــ اور کچھ بھی کر گذرنے کا جذبہ بھی تھا اور رسک لینے والا کردار بھی موجود تھا ـــــ مجھے گوتم کے 'مدھیم مارگ'، سے نفرت تھی ـــــ میں احتیاط کو بزدلی اور بزدلی کو کردار کی نفی سمجھتا تھا۔

فرسٹ ایر اور سکنڈ ایر میں صرف کتابوں کی دقت تھی ـــــ اس کے لئے میں نے میٹرک کے سنٹ اپ لڑکوں کے کئی ٹیوشن طے کر لئے تھے ـــــ سرِ شام سے سات بجے تک انھیں کوچ کرتا ـــــ اور جب ان سے فراغت ہوتی تو لائبریری چلا جاتا ـــــ کچھ کتابیں خریدیں ـــــ اور یوں میں نے زندگی کے ایک اور چیلنج کو قبول کر لیا ـــــ دن مہینہ اور برس بیتتے رہے ـــــ ان دنوں وقت

کی پرواز شاہینی تھی ——— اور میں خود کو فضا کی بلندیوں میں محسوس کیا کرتا ——— پھر مجھے ماڈلس خریدنے کی ضرورت ہوئی کیوں کہ ماڈلس کے بغیر میں صحیح اور اچھی تیاری نہیں کر سکتا تھا ——— اور ماڈلس کی قیمت بہت زیادہ تھی!

وہ عجیب سا دور تھا۔ ڈاکٹر، نچلے مڈل کلاس کے لئے بہت بڑا اتھرل تھا ——— گریٹسٹ اچیومنٹ ان لائف (GREATEST ACHIEVEMENT IN LIFE) اور اس طوفانی دور میں میرے ابا نے مجھے ایک قیمتی چیک کی طرح کیش کرا لیا ——— وہ ان کے ایک واقف کار کی لڑکی تھی جس سے انھوں نے میری شادی کر دی ——— اور شادی کے اخراجات کے نام پر کئی ہزار روپئے لئے ——— جن سے میں ماڈلس، کتابیں اوزار اور دیگر ضروری چیزیں خرید سکتا تھا ——— میری شادی ایک عام شادی تھی ——— اور میری بیوی ایک عام بیوی ——— میرا مقصد کسی بھی طرح ایک کامیاب ڈاکٹر بننا تھا ——— اس کے علاوہ نہ میری توجہ کا کوئی مرکز تھا ——— اور نہ ذہن کا کوئی زاویۂ فکر ——— بیوی بس بیوی تھی ——— اور ویسے بھی، عورتوں کو میں شئے سمجھنے والوں میں تھا ——— نرم و نازک احساسات کا پودا کھلے بغیر ہی مرجھا گیا کیوں کہ میں جس سینیر ڈاکٹر کی یونٹ میں تھا، اس کے رویے نے اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا ——— یہ شئے، قابل احترام ہو ہی نہیں سکتی ——— حضرت آدم کو جنت سے نکلوانے والی یہ مخلوق بڑی ہی شاطر اور سفاک ہوتی ہے ——— ان کے پاس زہر کی اتنی قسمیں ہوتی ہیں کہ بڑے سے بڑے مفکر، عالم، اور خود کو سرحد ادراک پہ سمجھنے والا بھی بے موت مرجاتا ہے۔ میں ہر دن دیکھا کرتا، ڈاکٹر لڑکیوں پہ خصوصی توجہ دیتا، خواہ وہ وارڈ ڈیوٹی ہوتی یا جنرل لیکچر ——— وہ لڑکوں کو قطعی نظر انداز کر کے صرف لڑکیوں سے ہی مخاطب ہوتا، انھیں ہی سیکھنے کا موقع دیتا اور یہ لڑکیاں، کبھی بے باک کبھی شرمیلی، کبھی کرسٹن کیلر جیسی اور کبھی مونالیزائی مسکراہٹ سے ڈاکٹر کے شعور کو، سلف کو، احساس ذمہ داری کو مفلوج کر دیا کرتیں ——— خصوصاً ولایجٹ پر تو وہ شدت سے مہربان تھا ——— بے حد عام سی ذہانت اور بے حد منفرد چہرے والی یہ لڑکی کہیں میرے خوابوں کو روند نہ ڈالے، میں اس لئے بہت خوفزدہ تھا ——— کیوں کہ مجھے یہاں کی ہسٹری معلوم تھی ——— یہاں کس مول کیا بکتا ہے اور کیا خریدا جاتا ہے، یہ صرف لیجنڈ نہیں تھا ——— اور پھر سائنس نے بتا دیا تھا، جو کچھ ایر (۱۶۰) میں ہوتا ہے، وہ کسی نہ کسی سطح پہ سچ بھی ہوتا ہے ———

میں نے تندہی محنت اور جانفشانی کی انتہا کر دی ——— آخر کار میدان کارزار کے اس ڈرامے کا خاتمہ ہوا ——— مجھے فرسٹ پوزیشن مل گئی ——— میں نے حکومت کو درخواست دی اور مجھے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کے لئے لندن بھیج دیا گیا ———

میرے ابا مجھے ہارٹ اسپشلسٹ دیکھنا چاہتے تھے وہ دراصل ماضی کی اقدار کے نمائندہ تھے ——— ان کے نزدیک کسی شخص کا یکبارگی دل کے دورے سے مرجانا بہت بڑی ٹریجیڈی تھی ——— لیکن میں نے حال کی، اور آج کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا ——— میں جانتا تھا، موت خواہ حادثے سے ہو، اتفاق سے، یا قلب کی حرکت رک جانے سے، وہ برین ہیمرج یا بلڈ کینسر اتنا بڑا المیہ نہیں، جتنا کہ وجود کے اندر کسی بھیانک مرض کو ڈھونا ہے، سیریس نس جانتے ہوئے بھی زندگی کے ساتھ نباہنا ہے ——— اور ہر دن کے روٹین ورک میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اندر سے سہمے رہنا ہے ——— آج کی زندگی کی چمک دمک، ہوٹلنگ، اور فری مکسنگ صرف بیماری دیتی ہے یہ مجھے پتہ تھا ——— اور جب ان بیماریوں کی تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے تو یہ لوگ ایمرجنسی وارڈ میں ایڈمٹ ہوتے ہیں ——— اور آپریشن کرانے کے لئے دوا سے لے کر دعا تک کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنی عمر بھر کی کمائی گنوا دیتے ہیں ——— میں نے محسوس کیا تھا، گھٹے ہوئے متوسط طبقہ کے لئے آپریشن بہت بڑا اتھرل ہے۔ یہ طبقہ، تنہائی کا شاکی، اور خود غرضی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ لوگ جان کے یا انجانے میں صرف دغا جانتے ہیں۔ دیتے رہتے ہیں ——— انھیں سمجھنے والا کوئی نہیں، اور چیٹ کرنے والی ساری دنیا ہوتی ہے۔ آفیسر اور ماتحت، بچے، پڑوسی، رشتہ دار احباب سبھی چیٹ کرتے ہیں ——— اسی لئے جسے زندگی بھر، عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں اور دشمنوں نے کوئی اہمیت نہ دی تھی، وہ بھی آپریشن ٹیبل پہ ڈاکٹر کی قینچی کے نیچے بہت اہم بن جاتے ہیں ——— اور یہ اہمیت انھیں اتنی عزیز ہوتی ہے کہ اس کے لئے وہ بخوشی آمادہ ہو جاتے ہیں ——— دور وحشت کا انسان، مہذب لباس میں آج بھی تھا ——— اقتدار کے اس روپ بہروپ کو میں نے ہر شکل میں پہچانا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ کہ پیٹ کی بیماریاں دن بدن کامن ہوتی جا رہی ہیں ——— اس لئے میں لندن سے ایک ماہر سرجن بن کر واپس آیا ——— مجھے جنرل ہاسپٹل میں ملازمت تو مل گئی لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ پرائیویٹ پریکٹس!

شہر میں بڑے بڑے ماہر سرجن موجود تھے ——— جنھوں نے اپنی اپنی کلینک کھول رکھی تھی ——— اور جہاں ہسپتال سے زیادہ بھیڑ ہوتی تھی ——— ایسے بازار میں اپنے لئے جگہ بنانا مجھے ایک مرتبہ پھر اتنا ہی کٹھن محسوس ہوا جتنا کہ اسکول کے دنوں میں اپنے ایگزسٹنس (EXISTENCE) پر یقین کرنا! ——— میں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی ——— میں جانتا تھا یہ کلرکزم کا زمانہ تھا ——— اور اسٹیبلشمنٹ (ESTABLISHMENT) کا سارا اختیار نچلے لوگوں کو حاصل تھا ——— میں نے کمپاؤنڈروں، کلرکوں حتیٰ کہ سوئیپرز سے اصلیت کا سراغ لیا ——— دوا کی دوکانوں سے پتہ کیا، پیتھولوجسٹ

جتنے تھے ان سے کانسلٹ کیا ——— ایجنٹ مقرر کئے، جنھیں دلال بھی کہا جاسکتا ہے۔ عجیب سی بات تھی، نئے دور نے گھٹیا حرکتوں کے بے نئے نئے کلچرڈ لیبل بنائے تھے حالانکہ ایسی ایجنسی بھی دلالی سے کم نہ تھی ——— یہ لوگ گھاٹ سے اور جنکشن سے مریضوں کو مناسب کمیشن پر لایا کرتے ——— ادھر ادھر اپنی سرکل میں میرا اشتہار کرتے ——— اور یوں آہستہ آہستہ میری پریکٹس چل پڑی ——— میں اپنی راہ کشادہ کرنے میں بے دریغ پیسے خرچ کرنے لگا ——— اور یوں تین چار سال کی مزید جدوجہد کے بعد میں ایک مشہور و معروف اور مقبول سرجن بن گیا ——— میری ایک شان دار کلینک تھی ——— اور میں اس قدر مصروف تھا کہ بیوی اور بچوں سے باتوں کی بھی مجھے فرصت نہ تھی ——— لیکن میں اس کے لئے پریشان بھی نہ تھا کیوں کہ ان معصوم اور سچی باتوں کی جب پہلے ہی ضرورت نہ تھی تو آج کیا اہمیت

اب میری سمجھ میں آجانے والی زبان صرف ایک تھی ——— "دولت ——— روپیہ" ———

میرے بچے بھی کانونٹ میں پڑھتے تھے۔ اسمگل شدہ قیمتی کپڑے پہنتے ——— اور کانونٹ کامپلکس کی وجہ سے مخصوص امریکن طرز کی انگلش بولتے تھے ——— ان کے پاس کتاب اور کاپی کے علاوہ وہ طرح طرح کے کپڑوں اور فیشن کی اشیاء کی بھی بھرمار تھی ——— ساتھ ہی انھیں وہ سب کچھ میسر ہو جاتا جن کی وہ تمنا کرتے ——— شروع میں بیوی نے اکثر چاہا کہ بچوں کی زندگی کی راہ عام سیدھی اور ریسمی ہو، مگر میں نے تیز لہجے، تلخ آواز، اور ٹھوس دلیل کے ساتھ اسے یوں چپ کر دیا کہ اسے بھی اپنی راست روی پہ خام خیالی کا یقین ہو گیا ——— اور ہمیشہ کے لئے قوت احتجاج کھو دی ———

کیوں کہ میں سمجھتا تھا، بیک ٹو سمپلی سٹی، دراصل محرومی کا دوسرا نام ہے ——— میں نے اپنے بچوں کے لئے کئی مہنگے ٹیوٹر رکھے تھے ——— اور پھر کلاس ریپوٹیشن بھی برا نہ تھا ———

اکثر رات گئے، کلینک سے واپسی کے بعد میں ایک بار بچوں کے بیڈ روم میں ضرور جاتا۔ پتہ نہیں کیوں، لامحالہ ہی میرے قدم اٹھ جاتے ——— اور فوم کے بستر پہ الگ الگ سوئے سوئے بچوں کو دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا احساس کا CONTRADICTION ۔ انھیں گرم کمرے کے گرم اور آرام دہ بستر میں پا کر جہاں مجھے طمانیت کا احساس ہوتا، وہیں اپنے بچپن کا منظر ذہن پہ ابھر آتا ———

"امی کا منہ میری طرف ——— نہیں میری طرف" ———

امی کے ساتھ سونے کے لئے بڑے ہونے کے بعد بھی پیٹ درد کا بہانہ۔

"رونی میاں! ——— آج ہم بیمار ہیں۔ آج ہم امی کے ساتھ سوئیں گے۔" ماں کے سوتی بغیر غلاف

کے میل خوردہ لحاف کی گرمی شاید ان بچوں سے چھن گئی ہے ——— شاید یہ سنوری ہوئی کیاری کے خودرو پودے ہیں ——— جن پہ کسی مالی نے کبھی کوئی توجہ نہیں دی ہے ———

کیا اس طرح یہ زندگی کو جھیل سکیں گے؟ ———

لیکن کچھ تو تکان ہوتی ——— اور کچھ مسلسل متوازی راستوں پر دوڑنے والے ذہن کا بوجھل پن کہ میں بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتا صبح سے پھر وہی معمول ——— وہی زندگی اور وہی سب کچھ! ———

سال میں چار مرتبہ مجھے بچوں کے چہروں کو غور سے دیکھنے کا موقع ملتا ——— جب وہ اپنا کواٹرلی پروگریس کارڈ لے کر دستخط کے لئے میرے پاس آتے ———

ڈولی ——— نکی ——— بنٹی ——— ٹیٹو

میرے بچوں کے ناموں سے لڑکی لڑکے تخصیص مشکل تھی۔ لباس سے بھی ——— اور انداز سے بھی ——— یہ کمنڈ ویلوز کا المیہ تھا ——— بغیر سمجھے کسی شے کو قبول کر لینا اور اہمیت جانے بغیر کچھ بھی لوز کر دینا ——— اسی ٹریجیڈی کا براہ راست سامنا کرنے سے بچنے کے لئے میں انھیں "مائی ہارٹ" کہا کرتا تھا ——— ان کے پروگریس کارڈ میں میرے رزلٹ جیسی چونکا دینے والی بات نہ تھی ——— اگر کسی سبجکٹ میں نمبر اچھا تھا تو کسی میں ریڈ مارک بھی ———

دستخط کرتے ہوئے اکثر مجھے اپنا پاگل پن خشک ہوتا ہوا محسوس ہوتا ——— 'کیا میرے بچے بھی میری طرح ذہین نہیں ہو سکتے تھے؟' ———

میری بے توجہی نے انھیں صحیح گروتھ سے دور رکھا ———

مگر جب ہی میرا ذہن مجھے سنبھال لیتا ———

'مجھے ذہانت سے فرسٹریشن حاصل ہوا ——— ان کی زندگی میں کوئی فرسٹریشن نہیں۔ اس لئے ذہانت نہ ہونے کا دکھ کیوں؟' ———

لیکن یہ جواز اکثر بڑا سطحی لگتا ——— کیوں کہ بچپن کی پڑھی ہوئی کتابیں پتھروں کی طرح ایک ایک کر کے میرے ذہن پہ گرنے لگتیں۔ شاید کہیں کچھ غلط تھا ——— کوئی بھرم ——— کوئی ایلوژن ——— خود فریبی کا کچا راستہ ———

پتہ نہیں کیوں اندر ——— بہت اندر سے غیر مطمئن تھا میں ——— جیسے کوئی حق تلفی ——— کوئی احساسِ جرم، انجان جذبے کی طرح میرے اندر موجود ہو ——— اور میں جلدی سے دستخط کرکے، بچے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے، بے حد رسمی انداز سے کہتا ———

"ڈو مور بیٹر ـــــ نکسٹ ٹائم" ـــــ

اور وہ کبھی نارمل سی ایک مسکراہٹ بکھیر کے چل دیتے ـــــ میں شاید کچھ کرنا چاہتا تھا ـــــ بہت کچھ ـــــ مگر کیسے؟ ـــــ زندگی دن بدن اتنی فاسٹ ہوتی جا رہی تھی کہ نیک و بد کا فرق سمجھنے کی مہلت کبھی نہ ملتی ـــــ میرا سارا وجود ایک مشین میں تبدیل ہو چکا تھا ـــــ میری ہر حرکت ایک خودکار پرزے کی طرح میرے لئے غیر اختیاری ہو گئی تھی ـــــ

میں اوٹ ڈور ڈیوٹی میں ہوتا۔ وہاں جس مریض کی مالی حالت اچھی نظر نہیں آتی اس کی عام بیماری کو بھی اس قدر کامپلیکیٹڈ بنا کر بتاتا کہ اس کا وجود کانپ اٹھتا پھر اسے اپنے کلینک کا کارڈ تھما کر شام کو آنے کے لئے کہہ دیتا ـــــ اور جب ایسا کوئی بھی مریض مجھ تک پہنچتا تو میں اس کی بیماری اور جنرل ہاسپٹل کی بے رحمی کا ذکر یوں کرتا کہ وہ جائے پناہ سمجھ کر میرے یہاں ایڈمٹ ہو جاتا ـــــ اور میں آپریشن کر کے ہزاروں کے بل پے کروا لیتا ـــــ میرے چاق و چوبند دلال ہر وقت چوگوشیا ٹوپی پہنے رہتے ـــــ ہر ماہ میرے ان گنت اکاؤنٹس میں ایک طرف سے ہندسے کا اضافہ ہوتا رہتا دوسری طرف میری زندگی کا معیار لفٹ کی تیزی کے ساتھ، بلغیر زینہ بہ زینہ چلے ہوئے اوپر اٹھتا گیا ـــــ اوپر ـــــ اور اوپر ـــــ

مگر یکبارگی، زوال کا آغاز، میرے اندر ہی ہونے لگا جیسے وہ نادیدہ پودا، جو میرے اندر پل رہا تھا، اپنی شناخت کے لئے میرے جسم کا حصار توڑ کر باہر آنے کے لئے بے کل ہو۔ میں اندر اندر گھبرایا ہوا رہنے لگا ـــــ خوفزدہ اور بے سہارا ـــــ میرے بالوں کی سیاہی، سفیدی میں بدلنے لگی ـــــ اور بچوں کے کالے کالے بالوں کے گرد سفیدی پناہ ڈھونڈنے لگی ـــــ اور اب میری نظریں، غیر ارادی طور پر ہی، بچوں کے گرد منڈلایا کرتیں ـــــ

لیکن بچے کیا تھے؟ ـــــ میرے بچے! ـــــ

نئے دور کے ان اجنبی چیزوں میں میری پہچان کہیں نہ تھی! ـــــ

میں نے خود کو گم کر دیا تھا ـــــ

میری بیٹی ڈولی ـــــ ایم۔اے، کی طالبہ، باب ہیر والی ایک ماڈرن لڑکی تھی ـــــ جو کلاس کے لئے تیار ہونے سے پہلے شیمپو کرتی ـــــ بیوٹی پارلے جا کر ہر ہفتے فیشئیل کرواتی ـــــ اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گھنٹوں لپ اسٹک اٹھا اٹھا کر اپنی منی کے ساتھ میچ کرنے میں مصروف رہا کرتی ـــــ منی اور میکسی پہننے والی یہ لڑکی، میری کون تھی؟ ـــــ

ایک دن میں نے اسے بلا کر کہا ـــــ

"ڈولی ـــــ علم حاصل کرنا ایک تپسیا ہے ـــــ تم نے اسے شو بزنس بنا دیا ہے ـــــ

ہاؤ ڈل یو گٹ اپنی تھنگ دس وے؟" اس لپی پتی ماڈل گرل نے میری طرف حیرت سے دیکھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں ـــــ یا میں نے کسی ایسی زبان میں باتیں کی ہوں، جو وہ جانتی ہی نہ ہو ـــــ پھر اس نے اپنی کلائی پہ بندھی ہوئی بڑی سی مردانہ گھڑی دیکھ کر کہا ـــــ

"ڈیڈ ـــــ ڈونٹ بی سلی ـــــ میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ـــــ آپ کو پتہ نہیں ـــــ میرا ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کس منٹلیٹی کا ہے ـــــ ڈل اور بھونڈی لڑکیوں کو اس نے آج تک فرسٹ کلاس نہیں دی ـــــ اور وہ پرس کاندھے سے لگا کر چل دی ـــــ اس کی پینسل ہیل کی کھٹ کھٹ، میرے ذہن میں، ہتھوڑے کے ضرب کی طرح بجتی رہی ـــــ میں پھٹی پھٹی نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ـــــ

جب ہی فون رنگ کرنے لگا ـــــ

"ہیلو ـــــ یس ـــــ کیا؟ ـــــ مالدار کلائنٹ ہے ـــــ اپنڈی سائٹس ـــــ اسے پیٹ کا کینسر بتا کر پانی چڑھانا شروع کر دو ـــــ جسٹ کمنگ!" ـــــ

اور میں ڈولی کو بھول کر حال کی بھٹی میں کود پڑا ـــــ

وہ ہوٹل اسی راستے میں تھا ـــــ اپنی طالب علمی کے دور میں میری اس کی طرف نظریں اٹھانے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ یہ بڑی سی شاندار عمارت ـ مجھے دوسری دنیا کی چیز لگتی ـــــ اور اب مجھے اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ میں ادھر کا رخ کرتا ـــــ نہ حاصل کر پاتا، تمنا کی تخم کاری کرتا ہے، اور حصول کا یقین اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ شاید یہی بات تھی ـــــ لیکن آج شاید میں بہت تھک گیا تھا اس لئے کلینک سے واپسی کے درمیان میں نے وہیں پارک کیا ـــــ اور کولڈ ڈرنکس کارنر کی طرف چل دیا ـــــ ہاں میں شراب نہیں پیتا تھا ـــــ میرا خیال تھا، شراب وہ پیتے ہیں، جن کا ماضی کسی نہ کسی طرح ذلیل اور قابل فراموش ہوتا ہے اور جو ماڈرن اور اسمارٹ بننا چاہتے ہیں ـــــ

بنے ہوئے اسمارٹ میں اور اسمارٹ ہونے میں جو فرق تھا۔ وہ ابھی باقی تھا ـــــ اور ماضی کی تابانی، اقدار کی حفاظت شاید کہیں موجود تھی ـــــ اس لئے میں نے کبھی شراب کے لئے سوچا تک نہیں ـــــ

دور سے باہری کاونٹر صاف نظر آ رہا تھا ـــــ جہاں ایک شخص سوٹ کیس لئے غالباً اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا تھا ـــــ میری طرف اس کی پشت تھی ـــــ مگر پیچھے سے ہی، اس کا اسمارٹ

فیگر، خوبصورت سے بڑھے ہوئے بال اور سائیڈ پوز کی دلکشی بڑی اچھی لگ رہی تھی ــــــ لڑکی بھی بڑی اچھی تھی ــــ کاؤنٹر بین نے مجھے متوجہ دیکھ کر مکاری کے ساتھ کہا ــــــ

"کسی بڑے ڈاکٹر کا بیٹا ہے صاحب ــــــ سوٹ کیس میں صرف کتابیں ہیں ــــــ روم لینے کا صرف یہی بہانہ رہ گیا ہے ان لوگوں کے پاس مالک سب جانتا ہے مگر بزنس کاہے کو خراب کرے گا"۔

میری جھکی ہوئی گردن اور بھی جھک گئی جب پاس سے گذرتے ہوئے اس نے "ہیلو ڈیڈ!" ــــــ کہا اور کاؤنٹر بین نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھ کر "سوری سر" کہا تھا ــــــ میں نے کوک کی کھلی بوتل چھوڑ دی ــــ پیسے رکھے اور لوٹ آیا ــــــ

مجھے ہاسپٹل بھی جانا تھا ــــــ مگر میرے اعصاب جیسے بہت تھک گئے تھے ــــــ میرا جی چاہا، گھر جا کر، اپنے اسی پرانے بستر کو کہیں سے ڈھونڈ لاؤں ــــــ مارکین کا ڈوریا والا، دو کلو روئی کا تپلا توشک ــــــ پتلی سی سفید کنارے، والی سبز چادر ــــــ تکیہ پہ خریدا ہوا سستا غلاف ــــــ وہی پرانی میلی خوردہ چوکی ــــ جس پر لیٹ کر مجھے گہری نیند آیا کرتی تھی ــــــ آج میرے تھکے ہوئے، شکست خوردہ ذہن کو پناہ گاہ کی ضرورت تھی ــــــ اس لئے میں ہاسپٹل جانے کے بدلے گھر آ گیا ــــــ میرے کار کی مخصوص ہارن سن کر دربان گیٹ کھول کر ایک طرف مہذب اور اٹینٹیو (ATTENTIVE) انداز سے کھڑا تھا ــــــ

مگر آج مجھے لگا جیسے میں غلطی سے کسی اجنبی کے گھر آ گیا ہوں ــــــ

کیا یہ میرا گھر ہے ــــــ

کیا اسے گھر کہتے ہیں ــــــ

باہر سے ہی اسٹیریو کی آوازیں آ رہی ہیں ــــــ

بنٹی اور بٹلو ــــــ بنٹی کے ہاتھوں میں سگریٹ ہے۔ اور بٹلو رقص کر رہا ہے ــــــ اس کے ساتھ ایک ہم عمر لڑکی ہے ــــ کئی لڑکے ہیں ــــ قہقہے کا ننگا پن ہے ــــ جملے کی عریانیت ہے۔

میں اندر گیا ــــــ وہاں سب کچھ ویسے ہی ہے جیسے گھر نہ ہو ایک بہت بڑی فیکٹری ہو ــــ جس کے ہر حصے میں الگ الگ ورکر اپنے اپنے کام کر رہے ہوں ــــــ ایک دوسرے سے لاتعلق اور ٹوٹے ہوئے ــــــ یکائی کے تصور کے ریزے بکھرے تھے ــــــ میں بہت بے کل تھا ــــــ میں نے بیوی کو بلوایا ــــ وہ شاید کسی تقریب کے لئے تیار ہو رہی تھی ــــــ گھبرائی ہوئی آئی اور بولی ــــــ

"آپ ــــ آج ہاسپٹل نہیں گئے ــــــ کیا بات ہے ــــ کچھ چاہئے" ــــــ

"بیٹھو!" ــــــ میرے لہجے میں برسوں پرانی شکست تھی۔

"تم نے کبھی بچوں پہ توجہ دی ــــــ یہ لوگ کس راستے پہ چل نکلے ہیں ــــــ تم ماں ہو ــــــ اور، ــــــ

اس نے گھبرا کے میری طرف دیکھا اور جلدی سے بولی ــــــ

"لگتا ہے آج آپ بہت تھک گئے ہیں ــــ اچھا کیا جو کلینک سے گھر چلے آئے ــــــ تھوڑا آرام کر لیجئے پھر فنکشن میں بھی تو جانا ہے ــــــ مجھے بھی دیر ہو گئی ــــــ ان لوگوں نے پہلے سے بلایا تھا ــــــ اتنی انٹی میسی ہونے کے باوجود مہمان کی طرح جانا اچھا نہیں لگتا" اور میں اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی اجنبی عورت ہو ــــ اور خاموشی سے بستر پہ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مطمئن ہو کر چلی گئی ــــــ آج مجھے اتنی گھبراہٹ اور ایسی بے چینی تھی جیسے میری کوئی بہت ہی عزیز، بڑی ہی قیمتی شے کھو گئی ہو ــــــ اتھاہ دولت۔ شاندار کوٹھی۔ عزت۔ نام۔ شہرت سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شاید میرے پاس کچھ نہ تھا ــــ میں شاید بہت ہی قیمتی شے ہار چکا ہوں ــــــ

لیٹے لیٹے میں نے بہت سوفوکیشن، بڑی بے چینی محسوس کی۔ برآمدے میں ٹہلنے لگا ــــــ

میرے ذہن نے دوست کی طرح مجھے کہا ــــــ

"کلب چلے چلو ــــ طبیعت بہل جائے گی" ــــــ

پھر دوسرا مشورہ ــــــ

"مسز بھارگوا ــــ آج خالی ہوں گی ــــ وہیں چلتے ہیں" ــــــ

"آج کئی ایک کلچرل پروگریس بھی ہیں" ــــــ

لیکن میں نے ذہن کے تمام مشوروں کو پرے ڈھکیل دیا ــــ جیسے کوئی دشمن مجھ پہ حملہ کرنے کو ہو ــــ یوں ہی کروٹیں بدلتے بدلتے ساری دوپہر بیت گئی ــــــ اسٹیریو کی آواز بند تھی ــــ اب گھر میں غالباً مکمل سناٹا تھا ــــــ دھوپ بھی ڈھل چکی تھی ــــــ میں کمرے سے باہر آیا ــــــ اور غیر ارادی طور پر بچوں کے کمرے کی طرف چل پڑا ــــــ اندر شور اور ہنگامے کی جگہ سنجیدگی چھائی تھی ــــــ شاید سب بچے اکٹھے تھے۔ اور سب کے سب چپ ــــ مجھے حیرت ہوئی ــــــ اور اپنی پچیس سالہ تجارتی زندگی میں میں نے پہلی بار بچوں کی باتیں چھپ کر سننے کی ضرورت محسوس کی ــــــ

"ڈولی ــــــ ڈونٹ وری ــــــ ڈیڈ کے پاس ایسی ڈھیروں دوائیں ہیں ــــ کمپاؤنڈر سے ہلپ مل جائے گی!" ــــــ

آف کورس ــــ میں نے اپنی گرل فرینڈ کی کئی بار مدد کی ہے ــــ

مجھ سے اور وہاں رکا نہیں گیا ــــ جیسے اندر کہیں زلزلہ آگیا تھا ــــ ان بچوں کی آوازوں نے مجھے فراز سے نشیب کی طرح یوں ڈھکیل دیا کہ میں ماضی میں گر پڑا ــــ گھر کا مذہبی ماحول ــــ ابا کی آدرش وادی باتیں ــــ سماج کا احاطہ ــــ زندگی کی زنجیریں ــــ وہاں شاید کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا ــــ پھر میں کسی شراب کی تلاش میں اتنی دور نکل آیا کہ واپسی کی ہر راہ میری ہی لاش سے ہو کر جاتی تھی۔ یہ بچے، میرے ہی جسم کے حصے ہیں! ــــ ان کی تباہی کا ذمہ دار میں خود ہوں!

میں کل سے ہی ہر شام بچوں کے ساتھ گذاروں گا ــــ انھیں دھیرے دھیرے بتاؤں گا ــــ ہمارے دھرم اور ایمان کی ذمہ داری کیا ہے ــــ سچ اور جھوٹ کا فرق ــــ سکھ اور نجات کے راستے ــــ سچی اور پر سکون زندگی کے عزائم ــــ مجھے شاید واپس لوٹنا پڑے گا کہ میں اجنبی راستے پر نکل آیا ہوں ــــ

مگر راہیں محدود ہو چکی تھیں ــــ یہ دوسری نسل کا المیہ تھا۔ دوسری نسل کو بہرحال اس عذاب سے گذرنا ہی ہے تاکہ آنے والی نسل اپنے بے ننگ و نام راستے پر فخر محسوس کر سکے ــــ اس لئے کہ فون کی گھنٹی پھر بج رہی تھی ــــ

اور میں نے یکبارگی ماضی کو مسمار کر کے، نئی طرح کا فیصلہ کر لیا ــــ کیوں کہ میرے ہاتھ فون کی طرف بڑھ چکے تھے ــــ قسطوں پہ مرنے والا ایک انسان آج واقعی مرگیا، طرح دیگر خراج دینا ہی پڑتا ہے!!! ــــ

☐

انور خان

۴۸/۲۲، کنگھی والی چال
شیخ برہان قمر الدین اسٹریٹ
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

بلاوا

اس کی آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا چھا گیا جیسے سورج بدلیوں میں گھر گیا ہو۔ اس نے دیکھا وہ ایک بہت بڑے سوراخ کے دہانے پر کھڑا ہوا ہے اور تمام چیزیں اس سوراخ میں کھنچتی چلی جا رہی ہیں۔ ہرے بھرے درخت فضا میں اڑتے پرندے، مکانات، بجلی کے قمقمے، موٹریں، گاڑیاں، ڈاک کا ڈبہ، خوش پوش راہ گیر، سڑک پر کھیلتے بچے، سبک اندام حسینائیں، بازار، رکشائیں سب ہی اپنی ملی جلی آوازوں سمیت جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سوراخ سے مسلسل ایک ڈراؤنی سی کھوں کھوں کی آواز آرہی تھی اور وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا۔ اس کا دل بڑے زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیا۔ اور دیر تک دبائے رکھا یہاں تک کہ اس کے سامنے پھیلا اندھیرا دھیرے دھیرے چھٹا اور ایک بار پھر تپتی دھوپ اسے اپنے سر پر محسوس ہوئی۔ وہ سوراخ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ اسے بے حد نقاہت محسوس ہوئی۔ اور بھوک۔ اس کے پیٹ میں جیسے خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ برسوں کے مریض کی طرح آہستہ آہستہ چلتا وہ نکڑ کے ایک ڈھابے نما ہوٹل تک پہنچا اور لکڑی کی بنچ پر خود کو گرا دیا۔ اس نے ٹیبل والے کو آملیٹ اور ڈبل روٹی کا آرڈر دیا اس کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اگر ٹیبل والا فوراً ہی آرڈر کی تعمیل نہ کرتا تو شاید وہ سو ہی گیا ہوتا۔ مگر آملیٹ اور ڈبل روٹی سامنے دیکھ کر اس نے خود کو سنبھالا اور چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر حلق سے اتارنے لگا۔ پہلے چند لقمے وہ بڑی مشکل سے لے سکا۔ مگر دو چار لقمے پیٹ میں گئے تو کچھ جان میں جان آئی۔ آملیٹ ختم کر کے اس نے چائے منگوائی۔ چائے کا گرم گرم سیاہ جوشاندہ حلق سے اترا تو اس کی طبیعت کسی قدر بحال ہوئی۔ وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہا پھر زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ جان کر وہ اٹھا۔ نزدیک ہی ایک میونسپل پارک نظر آرہا تھا۔ پیسے ادا کر کے وہ اس طرف بڑھ گیا۔

پارک تقریباً خالی تھا۔ ایک جگہ سایہ دیکھ کر وہ لیٹ گیا اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تب اچانک اس کا ذہن اپنے کالج کے نوجوان لیکچرر کی طرف منتقل ہوا جو برسوں قبل کہا کرتا تھا کہ کائنات ایک بہت بڑے سوراخ میں داخل ہو رہی ہے اور عنقریب ہم سب اس میں کھو جائیں گے۔ اس وقت اس کی بات اسے بہت عجیب لگی

تھی۔ لوگ اسے سنکی سمجھتے تھے اور اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ حالانکہ وہ بہت ہی ذہین آدمی تھا اور اس کا تعلیمی ریکارڈ غیر معمولی طور پر شاندار تھا۔

'کیا کوئی شخص اس سے باہر بھی آسکتا ہے؟' ایک لڑکی نے کھڑے ہو کر اس سے سوال کیا تھا۔

'مجھے نہیں معلوم' لیکچرار نے جواب دیا تھا۔ 'میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک بہت بڑا سوراخ ہمیں نگلنے کا منتظر ہے۔ ہم ہر لحظہ اس کی طرف کھنچتے جا رہے ہیں۔ اندر مجھے صرف اندھیرا نظر آتا ہے۔ اس کے اندر کیا ہے مجھے نہیں معلوم۔ اس سوراخ سے گذر کر ہم کہاں پہنچتے ہیں اور آیا اس سوراخ سے ہم کبھی نکل بھی سکیں گے یا نہیں مجھے نہیں معلوم۔ لیکن ہر شخص اس میں اترتا جا رہا ہے چاہے اسے پتہ ہو یا نہ ہو۔"

"یہ سوراخ ہر کسی کو نظر کیوں نہیں آتا؟" اس لڑکی نے پوچھا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید وہ اپنی دنیاوی دلچسپیوں اور کاموں میں اس قدر الجھے رہتے ہیں کہ انھیں اس کی خبر ہی نہیں ہوتی"

"آپ اور کیا محسوس کرتے ہیں؟" کسی اور نے سوال کیا تھا۔

"بس یہی کہ مجھے اس سوراخ میں اترنا ہے۔ اور ہر شے اب میرے لئے بے معنی ہو چکی ہے۔ جب تک میں اس سے نہ گذروں مجھے نامکملیت کا احساس ستاتا رہے گا۔"

چند مہینوں بعد وہ لیکچرر گم سم ہو گیا تھا۔ شاید وہ واقعی اس میں اتر چکا تھا۔ وہ گھنٹوں خاموش، گم سم اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا رہتا۔ پڑھانا اس نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی اس حالت پر سب ہی کو افسوس ہوا تھا اس لئے اور بھی کہ اس نے کالج ہی کی ایک خوبصورت خوش مزاج لیکچرار سے شادی کی تھی۔ کئی طالب علم اور لیکچرار اس کے گھر گئے اور گفتگو کی کوشش کی مگر وہ ان کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا جیسے وہ نہ تو انھیں پہچانتا نہ ان کی گفتگو سمجھتا ہو۔

اور اب برسوں بعد جب وہ ان باتوں کو بالکل فراموش کر چکا تھا، مطمئن اور کامیاب گھریلو زندگی گذار رہا تھا اور روز بروز ترقی کی نئی منزلوں پر گامزن تھا اچانک وہ خود اس حادثے سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا کیا وہ سچ ہے یا محض ایک بھیانک خواب۔ لیکن اس کے لئے تو وہ ایک آنکھوں دیکھا واقعہ تھا۔ وہ اسے خواب کیسے مان لیتا؟ وہ بھیانک، ڈراؤنی آواز اب بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔

دو چڑیاں اچانک پھدکتی ہوئی اس کے قریب آئیں اور اڑ کر قریب کے ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھیں۔ بچوں کا ایک غول شور مچاتا ہوا باغ میں داخل ہوا اور باغ کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ گھاس پر چلتی چیونٹیوں کی قطار کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا کہ اس تجربے سے وہ دوچار کیوں ہوا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ان گنت

لوگوں کی طرح وہ بھی اس سے بے خبر گذر جاتا شاید مشیت کچھ اور ہی تھی لیکن مشیت کیا ہوتی ہے؟ اس پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ایک دن وہ خود اس سے دوچار ہوگا۔ شاید یہ لیکچرار بتا سکے؟ شاید اب وہ اس تجربے سے گذر چکا ہو۔ باہر آچکا ہو۔ ممکن ہے وہ اس کی مدد کر سکے۔

اب وہ خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ نقاہت کا احساس بھی زائل ہو چکا تھا۔ وہ اٹھا کپڑے جھاڑے اور بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

جب وہ لیکچرار کے مکان پر پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ گھر پر سوائے اس کی بیوی کے اور کوئی نہ تھا جو اب بھی شاید اسی لگن سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ ہاں ایک بوڑھی خادمہ آنگن میں آلو چھیلے بیٹھی تھی۔

لیکچرار کی بیوی نے اسے پہچان لیا کیوں کہ وہ اسے پڑھا چکی تھی۔

'کیسے آنا ہوا؟' اس نے پوچھا 'اتنے عرصے بعد'

'بس یونہی آپ لوگوں سے ملنے' اس نے مختصر جواب دیا۔

'ان کی طبیعت کیسی ہے ابھی؟' اس نے بستر پر لیٹے لیکچرار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'ویسی ہی' اس نے جواب دیا۔ 'کوئی فرق نہیں، تم بیٹھو میں چائے بناتی ہوں۔'

وہ کرسی کھینچ کر لیکچرار کے پاس جا بیٹھا۔ لیکچرار نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں جیسے وہ اس کے وجود سے بھی بے خبر ہو۔

"ہلو" ــــ اس نے کہا۔

لیکن وہ بدستور خلا میں گھورتا رہا۔

'سر ــــ' اس نے زور سے کہا 'میں نے بھی اسے دیکھا ہے'

لیکچرار نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ شاید اس نے اسے نہیں پہچانا یا اس کی بات نہیں سمجھی۔

وہ اپنا منہ لیکچرار کے قریب لے گیا اور کافی بلند آواز میں چیخا۔

میں نے دیکھا ہے، اپنی آنکھوں سے" اس نے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ 'آپ نے سچ کہا تھا'

لیکچرار اسے ویسی ہی خالی نگاہوں سے تکتا رہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔ لیکن شاید اس کی بات لیکچرر کی بیوی نے سن لی تھی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔

کیا کہا تم نے؟

"ہاں مادام" میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟' اس نے آہستہ سے کہا۔

'نہیں نہیں تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو' اس کی آواز بھرا گئی' تم اس میں مت پڑو —— ہرگز بھی نہیں ابھی تمھارے سامنے عمر پڑی ہے'

سورج کی الوداعی کرنیں اب درختوں کی شاخوں پر تھیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ کچھ لمحے خاموش باہر تکتا رہا جیسے سوچ رہا ہو۔ پھر اسی کھوئے انداز میں بولا۔

'مجھے افسوس ہے مادام' اب میں واپس نہیں جا سکتا۔ مجھے اس سے گذرنا ہی ہوگا۔ میں اس لئے آیا تھا کہ پوچھوں کہ مشیت کیا ہوتی ہے۔ لیکن ابھی جو باتیں آپ نے مجھ سے کہیں اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں اس کا جواب آیا ہے کہ مجھے جانا ہی ہے۔ یہ اب میرا مقدر ہے۔ شاید یہ ہمیشہ سے میرا مقدر تھا۔ خوشی سے یا ناخوشی سے لیکن اب میں واپس نہیں ہو سکتا' مجھے اس میں اترنا ہی ہوگا!

درختوں کی پھنگیوں سے الوداعی کرنیں بھی رخصت ہو چکی تھیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ کے علاوہ فضا میں جھینگروں کی چکی مکی بھی شامل ہوگئی تھی۔ لیکچرار کی بیوی مجھے پتھریلی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکچرار کی نگاہوں میں شاید ہلکی سی چمک ابھری —— یا یہ میرا واہمہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور چائے کا انتظار کرنے لگا۔ ☐

وضاحتی کتابیات

مرتبہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر مظفر حنفی

ڈاکٹر سلیم اختر
لاہور، پاکستان

ایک اور بستی کی کہانی

بستی ایک پر فضا مقام پر آباد تھی، بلند پہاڑ، شفاف پانی، گنگناتے چشمے، گیت گاتے آبشار، نظر کی حد تک زمردیں میدان،

یہ صاف ستھری بستی نیک پاک لوگوں سے آباد تھی، نہ کمزور کو طاقت ور کا ڈر تھا نہ غریب کو فاقوں کا، مرد رزق حلال پر قانع تھے دن بھر محنت کرتے اور رات کو عبادت، اس لئے مرد ہمیشہ نظریں نیچی رکھتے عورتیں باحیا اور عفت مآب۔ تھیں عشق میں ثابت قدمی تھی تو حسن میں وفا، سب بزرگوں کا احترام کرتے اور بچوں سے پیار، واعظ میں خست قلب نہ تھی، اساتذہ میں علم کی لگن تھی تو طلبہ میں علم کی پیاس، کشادہ پیشانیوں، روشن آنکھوں اور پر مسکراہٹ ہونٹوں والی اس بستی کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ ہوا دامن جھٹک کر ادھر سے گذرتی وہاں سے نکلتی تو نیک نیتوں کی خوشبو سے لدی ہوتی!

بستی پر پیار حکمراں تھا، وہ زندگی سے پیار کرتے زندگی بخش چیزوں سے پیار کرتے، زندگی آموز باتوں سے پیار کرتے اور سب سے بڑھ کر حسن سے پیار کرتے اس لئے وہاں پھول کو شاخ سے ٹوٹ کر خوشبو کی قیمت ادا نہ کرنی پڑتی نہ ہر تتلی کو رنگ کے جرم میں سزائے موت ملتی، نہ کبھی اس بستی کے کسی پنچھی نے پنجرہ میں برہا کا گیت گایا اور نہ ہی گھر میں کسی سیاہ چشم حسینہ نے —— وہاں چاندنی زیادہ نرم تھی، رنگ زیادہ اجلے تھے، دن زیادہ چمکیلے تھے اور دھوپ زیادہ روشن!

بستی والے مرحومین کو بہت عقیدت اور محبت سے یاد کرتے تھے۔ دن کو قبرستان پر گلستان کا گماں ہوتا تو شب کو چراغاں، قبروں کے سرہانے ٹمٹماتے رہتے دیکھ کر محسوس ہوتا گویا قبرستان نے ستاروں کا آنچل لے لیا ہو۔ وہاں خوشبوئیں جلائی جاتیں تو خوشبو کے بل کھاتے دھوئیں کے ساتھ محبت سے یاد کرنے والوں کی دعائیں بھی سوئے فلک رواں ہوتیں!

مطمئن ضمیر بستی والے رات کو سوتے تو شیریں خواب دیکھتے!

—— اور پھر ایک دن!

قبرستان کی جانب سے ایک بزرگ صورت مرد یوں دہشت زدہ بھاگا گویا اس نے کبھی بھوت کو ننگا دیکھ لیا ہو، چوراہے پر پہنچ کر رکا تو اس کے گرد جب ہجوم ہو گیا۔ اس نے بمشکل بے ترتیب سانسوں کا مرتب کیا اور رکا پتی آواز میں رک رک کر جو بات بتائی وہ ناقابلِ فہم تھی اور اس لئے ناقابلِ یقین بھی!

یہ قیامت کی نشانی تھی مگر ایسی نشانی کہ بذاتِ خود قیامت، کل جس خوبرو نوجوان کو آنسوؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ سپردِ خاک کیا تھا اس کی قبر منہ پھاڑے ان کے غم کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس کا کفن غائب تھا اور یوں محسوس ہوتا گویا نعش نے اپنی برہنگی سے شرما کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لی ہوں۔

یہ حادثہ ایسا تھا جس کا ثانی بستی کے سب سے معمر فرد کو بھی یاد نہ تھا۔ مردہ کی بے حرمتی ؟ یہ بدترین تصورات سے بھی بدتر بات تھی۔ یہ نوجوان نیک اطوار تھا اس لئے اس کی نعش کی بے حرمتی باعث عبرت بھی نہ تھی تاہم بستی کے نیک بندوں نے اسے اپنے لئے باعث عبرت ہی جانا، کردہ گناہوں کی معافی مانگی اور ناکردہ گناہوں سے بھی استغفار کیا مگر نہیں! یہ از غیب سامان عبرت نہ تھا۔ کسی پیشہ ور کفن چور کے کاروبار کا آغاز تھا بستی والوں نے اپنی روایت کے برعکس قبرستان میں چوکیدار مقرر کئے مگر کفن چور تھا کہ چھلاوہ، رات کے پچھلے پہر جب نیند کے بوجھ سے پپوٹے خود بخود بند ہو جاتے اور جب کھلتے تو کفن چور ہاتھ کی صفائی دکھا گیا ہوتا۔

چندے یہی صورت حال رہی تو بستی والوں نے تنگ آ کر قبر کے سرہانے فالتو کفن رکھنا شروع کر دیا تاکہ وہ آئے مردے سے خراج وصول کرے اور چلتا بنے مگر بات نہ بن سکی، کفن چور کو کفن سے دلچسپی نہ تھی کیوں کہ اس نے قبر کے سرہانے رکھے کفن کو کبھی نہ چھیڑا اسے تو قبر کھود کر لاش پر سے کفن اتارنے میں مزا ملتا تھا۔ بستی والے عجیب طبیعت رکھتے تھے نہ کفن چور کو روک سکتے تھے اور نہ ہی موت کو ـــــ تو کیا کریں ؟ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو شاکر ہو کر بیٹھ رہے، قبرستان سے چوکیدار ہٹائے مردوں پر ماتم کرنا بند کر دیا۔ اب وہ قبر کو زیادہ پختہ بھی نہ بناتے تاکہ کفن چور کا نام میں خلل نہ پڑے تاکہ جلد از جلد فارغ ہو کر رخصت ہو۔ اگلے دن وہ قبرستان جاتے سرہانے رکھے کفن میں نعش لپیٹتے اسے دفن کرتے اور پھر دل کھول کر اپنے اور اس کے مقدر پر بین کرتے ـــــ

چندے یہی عالم لیل و نہار رہے رات کو کفن چور آتا۔ اطمینان سے اپنا کام کر جاتا اور پھر رات کو لواحقین آتے اور بے اطمینانی سے اپنا کام کرتے، جس کے نتیجے میں موت محض موت نہ رہی بلکہ کچھ اور ہی بن گئی اب مردے کو نہلانا دھلانا کفنانا سب بے معنی لگتا، موت پر ماتم میں تسکین نہ رہی تھی یہ معلوم نہ تھا رونا مرنے پر ہو یا کفن چور کے ہاتھوں نعش کی بے حرمتی پر!

اور پھر اچانک یہ سلسلہ جس طرح پر اسرار طریقہ پر شروع ہوا تھا اسی طرح اس نے پر اسرار طریقہ پر نئی کروٹ لی جو مقابلہ میں اتنی خوفناک تھی کہ لوگوں کو کفن چور فرشتہ معلوم ہونے لگا کہ صرف کفن چراتا تھا اس نے

آج تک نعش کی بے حرمتی نہ کی تھی۔

جب دوشیزہ کے لواحقین اگلی صبح قبرستان پہنچے تو سرہانے دھرا کفن بھی غائب پایا لیکن یہ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی یہ ناقابلِ فہم بات تھی کہ بستی کے مردنے تو کبھی زندہ عورت کی بے حرمتی نہ کی تھی چہ جائیکہ لاش کی بے حرمتی! یہ قابلِ یقین تھا۔ غالباً قیامت بیت چکی تھی اور اب وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں دوزخ کے اس گوشے میں تھے جہاں آگ کے علاوہ بھی آلاتِ عقوبت تھے، اس معصوم صورت اور خاموش طبع لڑکی نے کسی کا کچھ نہ بگاڑا تھا پھر یہ بے حرمتی ؟ مرنے کے بعد وہ اس پامالی کی مستحق تو نہ تھی!

اس انداز کی یہ پہلی مثال تھی مگر آخری نہیں ـــــ عورتوں کی لاشیں آلودہ کی جاتیں جب کہ مردوں کی پشت میں ڈنڈا گاڑ دیا جاتا، حتٰی کہ فرشتہ صورت بچے بھی نہ بخشے جاتے اور نہ ہی احترام میں بزرگوں کو چھوڑ دیا جاتا۔

پسماندگان ساری ساری رات قبرستان میں جاگ کر گذارتے مگر نہ معلوم کیسے رات کے کسی پہر جیسے آنکھ پر افسوں ہو جاتا، صبح جب آنکھ کھلتی تو بے گور و کفن نعش کو آنکھ بھر کے دیکھنے کی ہمت نہ پاتے چنانچہ جیسے تیسے اسے دوبارہ مٹی میں دباتے اور بوجھل قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ واپس آ جاتے۔

تنگ آ کر انھوں نے وہاں سے نکل بھاگنے کا بھی سوچا بلکہ کچھ تو چلے بھی گئے مگر باپ دادا کی ہڈیاں چھوڑ کر جانا بھی تو آسان نہ تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کی اس بے حرمتی کے علاوہ زندوں کے معمولات میں کچھ فرق نہ آنے پایا تھا انھیں یوں محسوس ہوتا کہ گذشتہ قوموں کی مانند انھیں بھی نافرمانیوں کی بنا پر مبتلائے عذاب کیا گیا ہے۔ اگرچہ صبر و شکر کے علاوہ چارہ نہ تھا لیکن کبھی کبھی سوچتے کیا یہ عذاب گناہوں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں ؟

ادھر موت کی بے حرمتی نے زندگی سے مزا بھی چھین لیا ـــــ یہ ایک اور طرح کا عذاب تھا! لیکن انسانی فطرت کے بموجب آہستہ آہستہ وہ اس نئے عذاب کے بھی عادی ہوتے گئے جس کے نتیجہ میں موت کے برحق ہونے کی مانند انھوں نے نعش کی بے حرمتی کو بھی اٹل تسلیم کر لیا چنانچہ اب وہ قبر کھود کر اس کے سرہانے بلا کفن نعش لٹا دیتے اگلی صبح کفن لے کر جاتے آنکھیں چراتے اور نعش کو کم سے کم دیکھتے ہوئے اسے کفن میں لپیٹ لپاٹ قبر میں ڈالنے کی کوشش کرتے۔ بے حرمتی کے بعد مردہ کی بخشش کے لئے دعا مانگنے کو بھی جی نہیں چاہتا بس وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے۔

چندے یہی لیل و نہار رہے تو انھیں یوں محسوس ہونے لگا گویا یہ سب کچھ ہمیشہ اسی طرح ہوتا آیا ہے بڑے بوڑھے جب یہ بتاتے کہ کبھی یہ سب نہ تھا اور قبر کے سرہانے جلتے دیئے سے تیل کی بوند تک بھی کم نہ ہوتی تھی تو ـــــ نوجوانوں کو یقین نہ آتا گویا کسی اور زمانے یا اور بستی کی کہانی سنائی جا رہی ہو بلکہ بعض اوقات تو خود

سنانے والے کو بھی اپنی یادداشت پر یقین نہ آتا اور یوں محسوس ہوتا گویا کسی اور بستی کی کہانی سنا رہا ہو۔

اب تک جو کچھ ہوا وہ رات کی سیاہی میں ہوتا تھا مگر دن محفوظ اور امن وسکون کے تھے وہ جو کوئی بھی بلا تھی اسے صرف نعشوں سے دلچسپی تھی اس نے زندوں کو کبھی کبھی نہ چھیڑا تھا اور پھر ایک دن ——— ہاں ہاں چمکیلی دھوپ میں وحشت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ فضا کے دو غیر مرئی ہاتھوں نے بڑھ کر ایک بزرگ کو دبوچ لیا ——— وہ ایک بے ضرر بوڑھا تھا، دن بھر گھر کی دہلیز پر بیٹھا خوبصورت ماضی کی کہانیاں سناتا یا پھر پوتے سے کھیلتا رہتا سبھی اس کی عزت کرتے اور وہ سب سے شفقت کا سلوک کرتا۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق خوشگوار دھوپ میں بیٹھا تھا کہ اچانک جیسے کسی نے اسے اچک لیا کسی کو کچھ نظر نہ آرہا تھا بس اسے کشاں کشاں کھینچا جا رہا تھا اور وہ بوری طرح سے چیختا چلاتا جا رہا تھا یہ عجیب دہشت ناک منظر تھا کوئی نادیدہ قوت اسے گھسیٹے لئے جا رہی تھی اس کی چیخوں سے سننے والوں کے دل دہلے جاتے تھے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے سانسیں رک رہی تھیں مگر وہ کچھ کر نہ سکتے تھے جیسے پتھر کے بن گئے تھے اور وہ ان سب کے سامنے چیختا فضا میں تحلیل ہو گیا۔

اس رات کوئی بھی نہ سو سکا!

صبح ہر شخص کے سر پر اس کا اثاثہ تھا اور سب کا رخ بستی سے باہر جانے والے راستہ کی جانب تھا اب بستی میں رہنا ناممکن تھا کہ عافیت فرار میں تھی وہ سب سر جھکائے بوجھل قدموں سے یوں چلے جا رہے تھے جیسے میت کندھے پر رکھی ہو۔ بستی کی حد پر پہنچ کر انھوں نے پیچھے پلٹ کر اپنے گھروں کو دیکھا جن کی چمنیوں سے اب کبھی دھواں نہ اٹھے گا۔ مگر بستی کی حد سے باہر نکلنے لگے تو غیر مرئی ہاتھوں نے انھیں پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا انھوں نے بہت زور لگایا مگر وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے خوف نے زبانیں جکڑ لیں۔ دہشت نے قدم تھام لئے مساموں نے ٹھنڈا پسینہ نکالنا شروع کر دیا۔ آنکھوں کی پھیلتی پتلیاں نظر نہ آنے والے ہاتھوں کو دیکھنا چاہتی تھیں مگر دیکھنے کی تاب بھی نہ تھی۔ وہ تھک ہار کر واپس مڑتے ہیں!

ہوا کے جھکڑ چمنیوں سے دھواں اچھال رہے تھے۔ تب تیز ہوا سے گھروں کے کھلتے بند ہوتے دروازے ان کا یوں استقبال کرتے ہیں کہ گھر کے کسی دروازے نے کبھی اپنے مکیں کا یوں استقبال نہ کیا ہوگا۔ ☐

آمنہ ابوالحسن
۳۷۔ پٹودی ہاؤس، نئی دہلی ۲

پہچان

بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا۔ سلگتا دہکتا ہوا منظر لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ ابل رہا تھا اور چیخ و پکار اس کے کان چھیدے ڈال رہی تھی۔ اس منظر اور آہ و بکا کو خود سے دور کرنے وہ کسی ایسے مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں سکوت کے سوا کچھ نہ ہو لہذا جب تک قدموں نے ساتھ دیا وہ نہیں رکا مگر آخر کار گرا اور بے سدھ ہو گیا۔

مہربان زمین نے اپنی آغوش پھیلا دی۔

تازہ ہوا نے شفقت سے اسے تھپکا اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ جب جاگا تو اندھیرے کی چادر خوب تنی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر اتھاہ سناٹے کے سوا نہ کوئی آواز تھی نہ متنفس ——— جلتی ہوئی آنکھیں اور بس اپنا مجروح احساس ———

کتنی خوفناک آگ تھی جو لذیذ غذا کی طرح آدمیوں اور چیزوں کو بھون بھون کر نگل رہی تھی۔ بھر بھر بالٹیاں پانی کی انڈیلی جا رہی تھیں مگر شعلوں کی زبانیں جانے کون ساز ہر چاٹ چاٹ کر ماند ہونے مرنے کی بجائے بڑھتی لپکتی ہر شے کو ختم کئے دے رہی تھیں۔ وہ تو بچ گیا شاید کچھ اور لوگ بھی بچ گئے ہوں مگر بے حساب خاک ہو گئے۔ جب تک ہمت سلامت رہی وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل مل کر زندگیوں کو بچاتا رہا مگر جب آگ بجھانے والا عملہ آگیا تو نیم جان نڈھال ناتواں سا قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا اور اب جانے کہاں پہنچا ہوا تھا ——— ارد گرد کو پہچاننے کی نہ ہمت تھی نہ سکت بس ایک ہی منظر تھا جو نظر کے آگے جم سا گیا تھا۔ ہٹ نہیں رہا تھا اور نالہ و شیون کی آوازیں جو آسمان تک رسائی پانے کو بے قرار تھیں۔ اس نے آنکھیں اور سختی سے بند کر لیں۔ جانے کب تک یونہی پڑا رہتا کہ بھیڑوں کے ممیانے کی آواز نے سکوت کو توڑا اور کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔ آنکھوں کی جھری سے ایک انسان کو دیکھ کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سیاہی مائل رنگت کا ایک تندرست نوجوان تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا وجود کو سمیٹ کر سنبھال کر بمشکل وہ بولا ———

"بہت بھوک لگی ہے کچھ کھلاؤ ———"

چرواہا چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر مخصوص انداز میں سیٹی بجائی ——— یہ سیٹی

دور دور تک گھوم کر جوں ہی ختم ہوئی کہیں دور پرے سے ایک اور ایسی ہی سیٹی ابھری اور اردگرد کا طواف کرتی ٹیلے سے ٹکرا کر لوٹ گئی۔ وہ اپنی جگہ پڑا احمقوں کی طرح پلکیں جھپکاتا رہا۔ چرواہا ٹیلے سے اتر کر پھر اس کے پاس آگیا کچھ ہی دیر بعد ایک نقطہ چھوٹے سے بڑا ہوتا ہوتا بالکل ان کے آگے آکر مجسم ہوگیا ——— عین روشنی میں شام کی شبیہہ اس کے سامنے ٹھہری ہوئی تھی۔ سانولی سانولی گمبھیر جیسے کسی نے دارفتگی اور ٹھہراؤ کو خوب گوندھ کر ایک شکل دے دی ہو۔ سادہ لوحی جس سے یوں ظاہر ہو رہی تھی جیسے پکے ہوئے پھل سے ٹپکتا رس ———

وہ بھونچکا سا اسے تکتا رہ گیا۔

چرواہے نے اپنے لب و لہجے میں آنے والی سے کہا۔

"دوڑ کر دودھ لے آؤ۔ یہ اٹھ کر چلنے کے قابل نہیں ———"

یہ سن کر لڑکی جس طرح آئی تھی اسی طرح لوٹ گئی اور جلد ہی کانسی کا ایک لوٹا لے کر پلٹی جو دودھ سے لبالب لبریز تھا ——— اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لوٹا لیا اور بے دریغ ہونٹوں سے لگا لیا۔ جب تک پورا دودھ اس کے پیٹ میں نہیں پہنچ گیا وہ لوٹے کے کنارے سے اپنے ہونٹ چپکائے رہا پھر جب آخری بوند بھی ختم ہوگئی تو لوٹا نیچے دھر کر ایک طویل سانس لی اور اپنی بھوک اور ندیدے پن پر خود ہی شرمندہ ہوگیا تب قریبی پتھر پہ ٹکے ہوئے چرواہے نے پوچھا۔

"کیا تم زخمی ہو ——— ؟ بیمار ——— ؟ یا کوئی تمھاری گھات میں ہے ——— ؟" اور یہ پوچھتے ہوئے نیزے پر اس کی گرفت غیر ارادی طور پر مضبوط ہوگئی۔

"نہیں ———" وہ آہستہ سے بولا ——— "پہلے یہ بتاؤ میں کہاں ہوں ——— ؟"

"تم بستی سے دور ترائی میں ہو ——— اس قابل نہیں کہ لوٹ سکو۔ ابھی آرام کرو جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ تب چلے جانا ———"

وہ پھر لڑکی سے مخاطب ہوا ———

"میں ریوڑ کو لے کر آگے جا رہا ہوں تم اسے ساتھ لے جاؤ ———"

تعمیل حکم میں لڑکی نے زبان کی بجائے آنکھوں سے کہا۔ آؤ میرے ساتھ اور وہ ہر ہر طرح کی خود اختیاری بھول کر آہستہ آہستہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دیر چل کر وہ ایک جھونپڑی کے آگے رکے۔ لڑکی نے اس کے لئے چٹائی لا کر بچھا دی اور خود پرے بیٹھ کر ادھوری والی چٹائی بننے لگی۔

پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کا سراپا جتنا نازک اور لچکیلا ہے اس کے ہاتھ پاؤں اتنے ہی بھدے ——— چٹائی پر ٹک کر وہ چند لمحے اس غیر موزونیت کے بارے میں سوچا کیا پھر بے اختیار ایک سوال اس

کی زبان سے ادا ہوگیا ———

"وہ کون ہے جس نے تمہیں یہاں بھیجا ——— ؟"

"میرا بھائی ———"

"اور تمھارا اماں باپ ——— ؟"

"بستی میں سامان بیچنے گئے ہوئے ہیں ——— میری بنی ہوئی چٹائیاں اور بھیڑوں کے دودھ سے بنا ہوا مکھن اور پنیر ———"

"مگر کیا یہ عجیب اور بے تکا نہیں لگتا کہ اکیلی لڑکی کے ساتھ ایک اجنبی کو بھیج دیا جائے ——— ؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا ——— ہم مہمانوں کی عزت کرتے ہیں اور اپنی حفاظت کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ جب ہمیں درندوں سے محفوظ رہنا آتا ہے تو انسان پھر آخر انسان ہے ———"

اس جواب کی خود اعتمادی نے اسے لاجواب کر دیا ——— انتہائی تھکن میں پیٹ بھرنے کے احساس نے اس پر سرشاری طاری کر دی۔ وہ چٹائی پر لڑھکا اور اطمینان کی اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں کبھی کبھی خوابوں کی بھی مجال نہیں ہوتی کہ اپنا رنگ جما ئیں ———

دن ڈھلا ——— شام آنے لگی ——— شام کے ساتھ بھیڑیں اپنے ٹھکانے کو واپس پلٹیں ——— چرواہے نے انھیں باڑے میں دھکیل کر جب کانٹے دار دروازہ بند کیا تب بہن سے پوچھا ———

"کیا یہ سارا دن سوتا رہا ——— ؟"

بہن مسکرائی ——— "جس رفتار سے اس نے دودھ پیا اس کا تقاضہ یہی ہے کہ دودھ ضرور نشہ بن جائے ———"

تبھی چرواہے کے ماں باپ بھی لوٹے۔ چرواہے نے مختصراً اجنبی کی بابت انھیں بتایا۔ اگرچہ کہ بڈھا بڈھی نے تہذیب و تمدن کو نہیں دیکھا تھا مگر اچھے برے کی پرکھ رکھتے تھے۔

جب چرواہے نے اجنبی کو جگا کر اپنے ماں باپ سے ملایا تو دونوں نے نہایت مسرت سے اس کا سواگت کیا اور اپنے ساتھ بٹھا کر پیاز پنیر اور روٹی کھلا دی پھر تھکا ہوا چرواہا اور اس کا باپ فوراً چٹائی پر پسر گئے۔ ماں لڑکی کے ساتھ جھونپڑی میں چلی گئی ———

وہ اپنی چٹائی پر بیٹھا بڑی بے دردی سے آنکھیں مل مل کے سوچنے لگا ——— کہیں یہ سب خواب تو نہیں ——— خوف سے نجات کا ایک سہانا پس منظر ——— ؟ ؟

دن غائب تھا اور اندھیرا سارے میں اتر آیا تھا ——— اس کا دل شدت سے دھڑکا ——— کہیں اب

اندھیرا ہی تو اس کا مقدر نہیں ــــ؟ مگر تاروں سے چھنتی ہلکی ہلکی جگ مگ میں سویا ہوا چرواہا مضبوط سہارے کی طرح علانیہ نظر آ رہا تھا ــــ اس نے خود کو یقین دلایا یہ کوئی پس منظر نہیں حقیقت ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ دنیا بڑی عجیب جگہ جس کے کچھ حصوں میں اس وقت رونقیں اپنے عروج پر ہوں گی مگر اس حصۂ زمین پر کیسی گہری اٹوٹ خاموشی ــــ؟ دم بہ دم گاڑھی ہوتی ہوئی تاریکی ــــ اور آگ تاریکی ہی میں تو پھڑکی تھی ــــ

تاریکی نے پھر اس کے احساس میں پنجے گاڑ دیئے ــــ تاریکی اس دشمن کی طرح لگی جو مسلسل اس کا تعاقب کئے جا رہا ہو ــــ

بے اختیار اس کا جی چاہا کوئی اتنی زور سے ہنسے کہ اجالا اس ہنسی سے فوارے کی طرح ابل کر تاریکی کو بھید دے اور اس کے زخمی وجود سے رس رس کر لہو زمین میں ملے تو پھولوں کی طرح اگے اور پھر تمام پھول مل کر ایک قالب میں ڈھل جائیں اور یہ قالب اس کی محرومیوں ــــ مایوسیوں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر کے اسے زندگی کا ایک نیا ذائقہ نئی لذت دے ــــ نیا طور ــــ نئی جہت ــــ

گھسی پٹی فارمولا زندگی نے اسے کتنا اکتا دیا ہے۔ صبح سے شام تک ایک جیسا کام کرو۔ شام پڑے نڈھال ہو کر پیٹ کا دوزخ بھرو اور پھر وقت کو آنو آنو خرچ کرو ــــ اب تو وہ مقام بھی نہ رہا جہاں رات گذار کر وہ خود کو تشفی دے سکتا تھا کہ اس کا بھی ایک ٹھکانہ ہے......

اسی درد میں گھلتے گھلتے اس کے پپوٹے پھر جھک گئے اور اس وقت کھلے جب کوئی چیز اچانک اس کے چہرے پر کلبلائی۔ گھبرا کر ہاتھ کے غیر ارادی جھٹکے سے اس نے کلبلاتی ہوئی چیز کو پرے اچھال دیا پھر اپنے خوف پر خود نادم ہو گیا۔ سوکھی گھاس کے چند تنکے جو پیڑ پر بیٹھی چڑیا کی چونچ سے چھوٹ کر اس پر آ پڑے تھے بازو پڑے تھے۔ غیر شعوری طور پر ہاتھ بڑھا کر اس نے تنکے سمیٹے اور انھیں ہتھیلی پر پھیلا لئے ــــ

تو کیا گھونسلے بنانے کا موسم آ گیا ــــ؟

اس نے سر اٹھا کر پیڑ کو بغور دیکھا جہاں بے فکر پرندے آزادی کے نغمے الاپ رہے تھے۔ دستوں کی طرح اڑ رہے تھے۔ خوب چہچہا کر وہ اپنے پنکھ پھڑپھڑاتے اور دور دور تک اڑتے چلے جاتے ــــ فضا میں تیراکی کا یہ مظاہرہ اسے اچھا لگا ــــ جب گھر بن جائیں گے تو یہ پرندے انڈے دیں گے اور پھر اونچی پروازوں میں ہمہ تن منہمک ہو جائیں گے ــــ

اس خیال نے اس میں یکلخت پھرتی بھر دی ــــ لپک کر وہ اٹھا اور نرم نرم صبح کو اپنے پورے وجود میں میٹھے گھونٹ کی طرح بھر کر یکلخت مسکرایا ــــ

بڈھا بڈھی چرواہا سب اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو چکے تھے۔ لڑکی بھی دھوپ کے زعفرانی آبشار تلے

سونے کی طرح لو دیتی اپنی مصروفیت میں مگن تھی۔ چپکے سے قریب پہنچ کر وہ بولا ــــ

"تم ہر وقت کام ہی کیوں کرتی رہتی ہو ــــ؟"

"مجھے بیکاری پسند نہیں ــــ"

"تم نے کبھی پرندوں کو دیکھا ہے ــــ؟"

"نہیں ــــ"

"کیوں ــــ؟"

"انھیں دیکھنے سے کیا ملے گا ــــ"

"اچھا اگر تمھیں بہت سا پیسہ مل جائے تو ــــ تو کیا کرو گی ــــ؟"

لحظہ بھر کو ہاتھ روک کر لڑکی نے اسے دیکھا ــــ

"کیا تمھارے پاس بہت پیسہ ہے ــــ؟"

اس سوال نے اسے سٹپٹا دیا۔ وہ کیا جواب دے ــــ

کہہ دے ہاں یا نہیں ــــ؟ اور تذبذب کو اس کے چہرے پر دیکھ کر لڑکی زیر لب مسکرائی ــــ

"ہمیں پیسہ نہیں چاہیے ــــ ہم محنت کرتے ــــ پیٹ بھر کھاتے ــــ بے فکری سے سوتے ہیں ــــ ہاں کبھی کبھی فضائی طوفان ضرور ہمیں پریشان پراگندہ کر دیتے ہیں ورنہ زندگی آرام سے کٹتی ہے۔ چلو اب دانت صاف کرو اور ناشتہ کر لو ــــ بھائی تمھاری راہ دیکھ رہا ہوگا ــــ"

وہ وہاں سے ہٹ کر مٹکے تک پہنچا اور پانی لے کر دانت صاف کرنے لگا ــــ جب اس نے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارے تو ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ مٹکے کا سارا پانی لڑکی پر انڈیل کر دیکھے اپنے دل آویز پیچ و خم کے ساتھ وہ کیسی لگتی ہے مگر اگلے ہی لمحے سارے جنگل نے اس کے اندر گونج کر کہا ــــ خبردار ــــ یہ یہاں کی ریت نہیں ــــ یہاں کے باسی معصوم اور بے غرض ہوتے ہیں مگر عیاری کے لئے ان کے نیزے بہت نشانہ باز اور چاقو بہت دھار دار ــــ اور پھر کیا اعتماد کوئی چیز نہیں ــــ؟

بے حد ندامت سے اس نے منہ میں بھرا ہوا پانی اگل دیا اور بغیر کچھ کھائے ہی دوڑ پڑا ــــ لڑکی حیرانی سے دیکھتی رہ گئی مگر اس نے پلٹ کر ایک بار بھی پیچھے نہیں دیکھا ــــ سیدھا چرواہے کے پاس پہنچ کر بڑی متانت سے بولا ــــ

"میں جا رہا ہوں ــــ اللہ حافظ ــــ"

چرواہے نے ایک دم کمر میں اڑسا ہوا چاقو نکال کر کھولا ــــ

"تم بھاگ کیوں رہے ہو ــــ اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو ــــ ؟"

ایک لمحے کے لیے چاقو کی چمکتی دھار نے اس پر کپکپی طاری کر دی مگر اگلے ہی لمحے اس نے بے خوفی سے دھار کے آس پاس انگلی پھیر کر پوچھا ــــ

"کیا اسے روز سان پر چڑھاتے ہو ــــ ؟"

چرواہے نے اس کی صاف آواز سنی ــــ شفاف آنکھوں کو دیکھا ــــ بے خوفی محسوس کیا تو چاقو بند کر کے دوبارہ کمر میں کھونستے ہوئے مسکرایا ــــ

"ہاں ــــ ہم اپنے ہتھیاروں کو کند نہیں ہونے دیتے ــــ

یہی تو ہمارے محافظ ہیں ــــ نیزے اور چاقو ــــ

درندے ہوں کہ لٹیرے ــــ ان کے وار سے کوئی نہیں بچ سکتا ــــ

اچھا تم ایسا کرو کوئی سا جنگلی پھل توڑ لاؤ ــــ چھوٹے سے چھوٹا اور اسے جتنی تیزی سے اچھال سکتے ہو اچھالو اگر میرا نشانہ خطا کر جائے تو بے شک میرے ہتھیار کو مجھی پر آزما لینا ــــ"

"خوب" ــــ وہ مسکرایا۔ "مطلب یہ کہ بھاگتے ہوئے کو بھی گرا سکتے ہو ــــ ؟"

"ہاں ــــ"

"تبھی اتنے نڈر ہو تم لوگ ــــ"

"لیکن تم اس قدر جلد کیوں جا رہے ہو ــــ کچھ روز اور رہ لیتے ــــ"

نہیں اب مجھے جانا چاہیے ــــ اس نے سوچا۔ آگ کتنی بھی شدید سہی۔ آہ و بکا کتنی بھی المناک مگر جینے کی تمنا کیا ان سب سے زیادہ خطرناک نہیں ــــ ؟

تب اس نے اچھل کر ایک بے پرواہ تتلی پکڑی پھر اسے آزاد کرتے ہوئے بولا ــــ

"پھر کبھی ملاقات ہو نہ ہو تم بھلائے نہ جاؤ گے ــــ"

"تم بھی ــــ" چرواہے نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

"جاؤ آسمان تمہاری مدد کرے ــــ"

مگر اس نے سر اٹھا کر آسمان کو نہیں دیکھا بلکہ دنیا کے زخموں کو خود میں بسائے اجنبی انجان کھائی میں اتر گیا ــــ

زندگی کو از سر نو جینے کے لئے .... □

عبدالصمد

وراثت

اب کے جو رات آئی تو بہ انداز دگر آئی کہ اس نے میری ساری کہانیوں کو چرا لیا اور صبح کو میرے ہاتھوں میں بسورتے ہوئے صرف چند کاغذ کے سفید پرزے رہ گئے۔

میں صبح سے منہ چھپانے لگا کہ اب میرے پاس اس کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا اور میرے ہاتھوں میں جو سفید پرزے تھے ان میں چہرہ کبھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

صبح کو شاید میرے خالی پن کا احساس ہو گیا کہ اس نے میرے اندر جھانک کر مجھے مزید رسوا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سورج کی گود میں سمٹ سمٹا کر آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ پوری طرح سورج کی جال میں آ گیا اور سورج اسے بھگا کر دور کہیں سناٹے میں لے جا کر گم ہو گیا۔

مجھے احساس محرومی کاٹنے لگا تو میں نے اسے تھپکا، تھپک کر تسلی دی کہ میرا قصور کیا تھا، نہ تو رات مجھے مفلس بنا گئی اس لئے صبح مجھ سے دور ہو گئی کہ میرے پاس دھرا ہی کیا تھا ــــ

لیکن صبح تو پھر آئے گی ــــ

اس لئے میں نے سوچا کوئی بات نہیں اگر میں مفلس ہو گیا، کاغذ کے سفید پرزے تو میرے پاس ہیں اور پھر میں ہوں ــــ چنانچہ میں نے پھر کاغذ پر کہانیاں بننی شروع کر دیں۔

جب اتنی کہانیاں تیار ہو گئیں کہ میرے دل کو چھونے لگیں تب میں نے احتیاط کے طور پر تمام کہانیوں کو گھر کے کونے کونے میں پھیلا دیا کہ رات اگر پھر بدنیت بھی ہوئی تب بھی کچھ کہانیاں تو بچ جائیں گی جن کے سہارے صبح کا سامنا کیا جا سکے گا۔

لیکن صبح کو میرے دونوں ہاتھ پھر خالی تھے اور صبح اپنے اجلے پن کو سمیٹے، مجھ پر طنزیہ انداز میں مسکراتی ہوئی دور ہٹتی جا رہی تھی۔

میرے لئے لمحہ فکریہ تھا کہ سورج کی ایک پوری چال میں، میں دو بار مفلس ہوا تھا اور اگلی چال کے بارے میں دل خوش کن توقعات رکھنا عقل مندی کی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے

احتیاطی تدابیر سوچنی شروع کر دی لیکن کوئی تدبیر بھی ذہن و دل کے صحرا میں پھول نہ کھلا سکی۔ میں نے بیوی سے مشورہ کیا کہ بات جب ذات کی حدوں سے نکلنے لگتی تھی تب پھیل کر اسی کی ذات میں داخل ہوتی تھی اور پھر وہاں سے پھیلنے یا سمٹنے کا عمل شروع ہوتا تھا۔

بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رات کو تم پر نیند کا غلبہ بھی بہت گہرا ہوتا ہے۔"

یہ اس کی پرانی شکایت تھی۔ میں نے اسے دھیان دلایا کہ یہ وقت پرانی شکایتوں کا نہیں تدابیر سوچنے کا ہے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ سوچنے کا کام تو تم لوگوں کا ہے، ہم لوگ تو صرف کرنا جانتے ہیں ـــــ میں خوشی سے اچھل پڑا اور سوچ کی تمام بوجھل تہیں اپنے دماغ سے کھرچ ڈالیں کہ ایک واضح اور مضبوط سہرا میری بیوی کے ہاتھوں میں تھا۔

میری عادت ہے کہ زیادہ کرید میں نہیں پڑتا، چنانچہ سب باتیں بھلا کر میں صرف کہانیاں بننے میں مصروف ہو گیا کہ سفید کاغذ پر اب تک میری ملکیت برقرار تھی۔

جب شام کے حسن پر رات کی سیاہی منڈلانے لگی تب میں ہوشیار ہو گیا اور ان تمام کہانیوں کو سمیٹ کر اور چھپا کر بیوی کے پاس گیا کہ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، اسی کو کرنا تھا بیوی نے کہانیوں کی ایک پوٹلی بنائی، پوٹلی کو اپنے زیوروں کے صندوقچے میں بند کیا، اس پر دوہرا تار لگایا اور اطمینان کی نیند سو گئی، نیند تو مجھے بھی آگئی کیوں کہ میری یہ کمزوری ہمیشہ سے رہی ہے کہ میں کسی بھی واقعے کا گواہ نہیں ہوں۔ صبح کے چہرے پر اجنبیت کے میک اپ کو دیکھ کر میں پھر دہل گیا اور بیوی سے فوراً صندوقچہ کھولنے کو کہا ـــــ

وہی ہوا، جو اب تک ہوتا آیا تھا۔

بیوی کے تمام زیور جوں کا توں رکھے تھے اور سفید سادے کاغذ اس طرح اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہے تھے کہ ان میں چہرہ بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا ـــــ صبح پھر میری دسترس سے باہر جا رہی تھی، میرے کھو کھلے پن پر آنسو بہانے کو صرف میری بیوی رہ گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے لئے ہی آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، رونے سے کیا فائدہ، اب یا تو تقدیر کے سہارے۔ بیٹھ رہنا ہے یا پھر تدبیر کی مختلف نہریں کھودنی ہیں ـــــ

بیوی کو سب سے بڑا غم یہ تھا کہ اس کی سب سے محفوظ جگہ، غیر محفوظ ہو گئی تھی ـــــ اب

کوئی دن کو اس کا زیور بھی غائب ہو سکتا ہے، کپڑے پیسے بھی غائب ہو سکتے ہیں ـــــ کوئی دن کو....

میں نے اسے بتایا کہ اتنی معمولی چوریوں کے لئے اتنی منصوبہ بندی نہیں ہوتی ـــــ یہ تو ڈاکے ہیں دن دھاڑے ڈاکے ـــــ لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، مجھے اس بات کی خبر تھی کہ میری کہانیوں کے غائب ہونے سے وہ اسی حد تک مغموم ہوتی تھی جس حد تک اسے اس کا احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے شوہر کو محبوب تھیں اور شوہر کے غم میں برابر کا شریک ہونے کے لئے اس کا آنسو بہانا ضروری تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اگر اس کے زیور غائب ہو جاتے تو میرے پاس اسے دلاسا دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا ـــــ جو کچھ بھی میرے پاس تھا، اس پر نظر لگ چکی تھی اور مفلسی اور قلاشی کا احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا ـــــ

جب کافی دیر کے بعد میں نے اپنے بکھرے ہوئے احساسات کو جمع کر کے انھیں خود فریبی کا نہایت میٹھا رس پلایا تو اس بات سے طمانت محسوس ہوئی کہ ابھی میری انگلیاں اتنی مضبوط تھیں جن سے میں قلم پکڑ سکتا تھا، آنکھوں میں اتنی بصیرت تھی جن سے میں دیکھ سکتا تھا، بیدار شعور تھا جس سے کام لے سکتا تھا اور بازاروں میں کاغذات کی کمی نہیں تھی ـــــ

غم تھا تو صرف اس بات کا کہ جو کہانیاں، رات اپنی سیاہی میں چھپا لے گئی تھی، وہ کہانیاں اب میرے پاس نہیں تھیں، ان کا تانا بانا بکھر چکا تھا اور اب جو کچھ بھی امید تھی وہ مستقبل سے وابستہ تھی۔ مجھے مستقبل کے اس راز کی خبر تھی کہ اس کے دامن میں ان گنت کہانیاں چھپی ہوئی ہیں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ مستقبل ان کے سلسلے میں فراخ دل واقع نہیں ہوا تھا اس لئے میں نے اس سے پہلے ہی سمجھوتہ کر رکھا تھا۔

میں یہ سوچ سوچ کر لرز جاتا کہ اگر مستقبل نے میری طرف سے آنکھیں پھیر لیں تو ـــــ

اس لئے میں نے اپنی مفلسی اور قلاشی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ اب تک اس راز سے میں اور میری بیوی کے علاوہ رات اور سورج ہی باخبر تھے اور صبح تو دور ہی دور سے مسکراتی ہی رہتی تھی۔

اب کے میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی، رازداری کا خاص خیال رکھا، بیوی کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی، خود کلامی سے بھی محفوظ رہا کہ دیواروں کو بھی کان ہوتے ہیں اور اندر ہی اندر سارا پروگرام مرتب کر کے بس کہانیاں بننے میں مصروف رہا اور جب کہانیاں اتنی ہو گئیں کہ اس کے بعد میں اپنے پروگرام پر عمل کر سکتا تھا تو میں نے ان کہانیوں کو ـــــ گھر کی دیواروں میں چن دیا اور اس پوری کارروائی میں اتنی احتیاط برتی کہ شاید دیواروں کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی ہوگی کہ رازداری کے اس مرحلے میں وہ خود کس حد تک شریک ہیں۔

مجھے یقین تھا کہ اب کے میں نے اتنا منظم اور محتاط رویہ اختیار کیا ہے کہ رات کی سیاہی سر تک بھی رہ جائے گی تب بھی اسے کچھ سجھائی نہیں دینے والا ـــــ اس رات میں عرصہ کے بعد ایسی نیند سویا جس میں خواب ہی خواب تھے۔

لیکن صبح میں سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ سورج میری بے بسی اور مفلسی پر قہقہے لگا رہا تھا اور اس کی گود میں سمٹی سمٹائی صبح کے ہونٹوں پر ایسی طنز آمیز مسکراہٹ تھی جس سے کلیجے میں تیر لگنے لگتا ہے۔

احساس محرومی مجھے رہ رہ کے ڈنک مارنے لگا تو مجھے ایسا لگنے لگا جیسے اب میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میرے ترکش کے سارے تیر ضائع ہو چکے ہیں اور میں خالی ہو چکا ہوں ـــــ لیکن جب بارے دھند چھٹی اور ہوش و حواس اپنی اپنی جگہ پر واپس آئے، تو میں نے پھر دیکھا کہ قلم پکڑنے والی میری انگلیاں سلامت ہیں، دیکھنے والی آنکھیں موجود ہیں، بیدار ہونے والا شعور جاگ رہا ہے اور وہ بازار ابھی تک بند نہیں ہوئے جہاں کا غذات کی کمی نہیں تھی۔ ان سے میں نے جانا کہ میں زندہ ہوں اور زندہ رہ سکتا ہوں کہ اس کے باوجود کہ صبح میری دسترس سے باہر تھی، مجھے حسین دکھائی دے رہی تھی، اور باوجود اس کے کہ میں خود فریبی کے کرب سے اچھی طرح آشنا تھا، مجھے اس حسین صبح کا انتظار تھا جو رات کی سیاہی اور سورج کی تمازت میں پڑ کر اپنے حسن کو برباد کر رہی تھی۔ انھوں نے اسے خوشنما فریبوں میں مبتلا کیا تھا اور میرے اندر یہ خواہش شدت سے موجود تھی کہ اگر ایک بار وہ مجھے مل جائے تو میں اسے ساری باتیں سمجھاؤں اونچ نیچ اور اسے کسی طرح یہ باور کرانے کی کوشش کروں کہ ابھی میں اتنا قلاش نہیں ہوا ہوں جتنا اسے نظر آتا ہے ـــــ میں تو خود فریب اور دھوکہ کا شکار ہو رہا ہوں اور یہ کہ میں بے قصور ہوں، بے بس ہوں۔

لیکن وہ تو مجھے مفلس اور قلاش جان کر اس طرح بھاگتی تھی کہ اس وقت مجھے اسے پکارنے کی صلاحیت بھی نہیں رہ جاتی تھی اور چمکیلے سورج کی چرب زبانی اسے کچھ سوچنے کی مہلت نہیں دیتی تھی۔

مسلسل یقین اور بیدار شعور نے میرے اندر تدبیریں اختیار کرنے کی صلاحیت کو محفوظ ہی نہیں، زندہ رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے تخلیقی قوت بھی امنگ پاتی تھی جس کے تحت میں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس سے زیادہ محفوظ اور محتاط رویہ میرے نزدیک کوئی دوسرا نہیں تھا کہ اس میں، میں نے خود کو ماخوذ کر دیا تھا۔ اس سے قبل جو تدبیریں میں نے اختیار کی تھیں، وہ دور رہ کر کی تھیں اور اگرچہ میں نے ہی انھیں بھگتا تھا لیکن میں ان میں ماخوذ نہیں تھا۔ چنانچہ اب کے جو میں نے کہانیاں بنیں ان میں خود کو کردار بنا ڈالا ـــــ کہانیوں کے ہاتھ پاؤں میرے اپنے ہاتھ پاؤں تھے، آنکھیں ـــــ

میری آنکھیں ـــــ کان، ناک اور جسم کے دوسرے اعضا، میرے اعضا تھے اور ان میں جو شعور کار فرما تھا وہ میرا اپنا تھا جسے میں نے بقدر ظرف اپنی ذہانت کی آبیاری سے جلا دی تھی اور جسے بچا بچا کر اب تک محفوظ رکھتا آیا تھا۔

میں اس سے واقف تھا کہ میں نے ایک بڑا فیصلہ کیا تھا اور اس پر فوراً عمل پیرا بھی ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی اطلاع اپنے سوا کسی کو بھی نہیں دی تھی ـــــ بیوی کو بھی نہیں، کہ اس کی وابستگی میری اس ذات سے تھی جسے میں نے داؤ پر لگا ڈالا تھا اور میں اسے ایک اندوہ ناک صدمے سے دو چار کرنا نہیں چاہتا تھا ـــــ میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود کو بچانے کے لئے اپنی ذات کو داؤ پر لگا دوں، آخر میں کب تک خود کو مفلس اور قلاش رکھ سکتا تھا۔ میرے لئے ایک بڑا قطعی فیصلہ نہایت ضروری تھا، اس لئے میں تو اپنے قدم سے مطمئن تھا۔

دوسری صبح میرے ہاتھ پاؤں، اب میرے ہاتھ پاؤں نہیں رہے تھے، میرے سارے اعضا میرے لئے اجنبی بن چکے تھے اور میں بظاہر ایسا مفلس و قلاش بن چکا تھا جس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہ رہا تھا ـــــ کہانیوں پر قبل ہی گھن لگ چکا تھا اور اب تو میں خود بھی بچ نہیں رہا تھا ـــــ لیکن میرے اندر کوئی پہچان نہیں تھا کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ آخر ایک دن یہ ہونا ہی ہے ـــــ میرے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا اسی وقت تک میرے اپنے تھے جب تک کہ میرا ان پر اختیار تھا لیکن ان چیزوں کی مدد سے جو میں نے اپنے میں تیار کیا تھا، اس پر ابھی تک میرا مکمل اختیار باقی تھا اور وہ میرے اندر اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ بہت ممکن ہے ایک وقت ایسا آ جائے جب صبح کو یہ احساس ہو کہ میں اتنا مفلس نہیں ہوں اور میرے پاس ایک ایسی چیز ضرور ہے جس پر رات اور سورج کا کوئی بس نہیں چلتا تو وہ یقیناً کف ندامت ملتی ہوئی میرے پاس آئے گی ـــــ

میں محسوس کر رہا تھا کہ سودا برا نہیں رہا تھا۔

مجھے اپنی وراثت پر اعتماد تھا۔ □

احمد یوسف

مکالمہ

ضعیف العمر قصہ گو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ——

—— ہاں تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، وہ چشمہ ہنستا کھیلتا، خوشی کے شادیانے بجاتا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سبھی جنگل کے باسی اور اس کے کنارے بسی آبادی چشمے کا پانی پی کر تازہ دم ہو جایا کرتی، جہاں سے وہ چشمہ نکلا تھا، وہاں سے کچھ دور آگے جا کر نیچے کی سطح پر بہا کرتا۔

ایک دن کا واقعہ ہے ——

اس تمہید کے بعد جب قصہ گو نے یہ جملہ چھیڑا تو سننے والے اور ذرا سمٹ آئے کہ گویا اب دریا میدانوں میں اتر آیا ہے اور بات آگے بڑھے گی۔

—— تو یہ ہوا کہ اس دن اوپر کی جانب ایک شیر چشمے کا پانی پی رہا تھا۔ جب وہ جی بھر کر پانی پی چکا تو اس نے آس پاس کے ماحول اور دور دور تک پھیلی ہوئی فضا کو اپنی آنکھوں میں بسایا، اس درمیان اس نے کئی زاویئے اپنی گردن کے بدلے، کئی بار اپنی آنکھوں کو سمیٹا اور پھیلایا، اور تب ہی ایک منظر اس کی آنکھوں کو ایک نئی چمک دے گیا۔

جہاں وہ شیر کھڑا تھا اس سے کچھ ہی فاصلے پر نشیب کی طرف ایک میمنا چشمے کا پانی پی رہا تھا۔

چشمے کا حیات بخش پانی دور دور تک پھیلی ہوئی فرحت بخش فضا اور اس پر میمنے کی شکل میں ایک لذیذ نعمت ——

دوسری ہی ساعت شیر کے دل میں ایک خیال آیا وہ ماتحتوں سے بات چیت کے طور طریقوں سے بخوبی واقف تھا۔ جو فعل اس کے لئے صحیح ہو سکتا ہے وہ اس کے ماتحتوں کے لئے غلط ہو سکتا ہے۔ اور جو ان کے لئے صحیح ہو سکتا ہے وہ شیر کے لئے غلط ہو سکتا ہے۔ حکمرانی کے کچھ آداب تھے جو اس کے خون میں رچ بس گئے تھے۔

تب ہی شیر نے گرجتے ہوئے کہا ——

"ابے چھوکرے تیری یہ مجال کہ اس پانی کو گندہ کرے جسے میں پیتا ہوں۔ تو نے یہ نہیں دیکھا کہ تجھ سے کچھ ہی دور پر میں بھی اس چشمے کا پانی پی رہا تھا۔"

میمنا کانپ اٹھا، اور اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو یکجا کر کے کہا ——

حضرت سلامت! آپ اوپر ہوں اور میں نیچے ہوں۔ چشمے کا بہاؤ اوپر سے نیچے کی طرف ہے، ایسے میں بھلا میں آپ کا پانی کس طرح گندہ کر سکتا ہوں۔

سننے والوں میں سے کسی نے کہا —— 'شیر اور میمنے کی منطق کا فرق واضح ہے!'

اس پر قصہ گو نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں ان سے کہا کہ وہ قصے کے درمیان کسی قسم کی رائے زنی سے پرہیز کریں، ورنہ وہ قصہ بھول جائے گا ——

—— ہاں تو پھر شیر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، اس کا چہرہ کچھ اور بڑا ہو گیا اور اس کا قد کچھ اور کھنچ گیا۔

اور جب وہ دور سے دھاڑا تو ساری فضا تھرا اٹھی، لیکن دوسری ہی ساعت یہ محسوس ہوا کہ فضا نے اپنے دم سادھ لئے ہیں۔ یہی حال میمنے کا بھی تھا۔

شیر نے کہا —— ٹھہر تجھے تیری گستاخی کا مزہ چکھاتا ہوں۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھ سے اس جنگل کے پنچھی پکھیرو، چھوٹے بڑے جانور اور پیڑ پودے کس طرح بات کرتے ہیں ——

یہ کہہ کر شیر نے نشیب کا رخ کیا۔ میمنے کی اتنی ہمت کہاں کہ فرار کی سوچے، پہلے ہی شیر کی شان میں کافی گستاخی کر چکا تھا۔

میمنے کے جسم کا سارا خون اس کے دل میں کھنچ آیا تھا اور وہ بڑی ہی معصومیت اور مظلومیت سے شیر کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن تم نے وہ کہاوت سنی ہو گی کہ گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کرے تو پھر کھائے کیا

چنانچہ شیر نے میمنے کی تکا بوٹی کر کے اسے برابر کر دیا۔

سننے والوں کی صف سے ایک نوجوان کھڑا ہوا اور اس نے کھنکھارتے ہوئے کہا ——

"محترم بزرگ! یہ قصہ اس مقام پر ختم نہیں ہوتا اس سے آگے بھی جاتا ہے"

قصہ گو جھنجھلا اٹھا —— 'دیکھتے ہو یہی اس کا انجام ہے'۔

تب حاضرین کے بے حد اصرار پر نوجوان نے اس کے آگے کا قصہ بیان کیا۔

شیر مینے کو ٹھکانے لگا کر اپنی جگہ واپس آیا تو اس نے چشمے پر منہ صاف کیا اور خوب سیر ہو کر پانی پیا۔

اور جب یہ سب کر چکا تو اپنی عادت کے مطابق اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور نشیب کی طرف نظر دوڑائی۔

نشیب کی جانب پھر وہی مینا اسی جگہ کھڑا پانی پی رہا تھا۔
شیر غصے سے بے اختیار ہو کر گرجا۔
تو پھر آگیا چشمے کا پانی گندہ کرنے —— تیری یہ ہمت۔
مینے نے وہی جواب دیا جو اس سے پہلے دے چکا تھا۔
"جہاں پناہ! پانی بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے۔ ڈھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا ——"

چنانچہ اس بار بھی شیر اسی انداز سے نشیب پر آیا اور اس نے مینے کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی۔
تیسری بار بھی یہی ہوا ——
چوتھی بار بھی یہی ہوا ——
تب بار بار کے اس عمل سے فضا نے اس پورے مکالمے کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔
اور جب وہ مینا سامنے آتا تو فضا خود بول اٹھتی ——
"گستاخ چھوکرے! تیری یہ مجال کہ میرے پینے کے پانی کو گندہ کرے"
پھر وہی فضا مینے کا بھی جواب دیتی ——
"جہاں پناہ! پانی بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے، ڈھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا۔"
اس مکالمے کے بعد شیر اپنے مخصوص انداز سے نشیب کی جانب آتا اور مینے کو چیر پھاڑ کر کنارے لگا دیتا۔
پر اس بھاگ دوڑ سے شیر کافی نڈھال ہو گیا تھا۔
اس کی آنکھوں کے آگے تتلیاں سی ناچ رہی تھیں۔ منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔
تب قصہ گو نے سوال کیا۔
"میرے عزیز یہ بتاؤ کہ پھر یہ قصہ ختم کہاں ہوتا ہے؟" □

علی امام نقوی
۸۳ جولی میکر چیمبرز II نریمان پائنٹ
بمبئی ۴۰۰۰۲۱

نئی کربلا

کل ——
سورج، صحرا، ریت، ریگستان، اور —— پیاس
چاند، چاندنی، ریگستان، برف سی ٹھنڈی سراب
روشن صبح، تپتی دوپہر، خوں بہاتی شام
پیاس، پیاس، اور صرف پیاس کا شور
لشکر کثیر، خیمے، رقص و سرور، قہقہے، لیکن پھر بھی دلوں میں جاگزیں خوف
دستہ قلیل، محصور، بھوک اور پیاس سے جاں بلب، عبادتیں، مجسم اطمینان
لشکر
کربلا
حسینؑ اور اصحاب حسینؑ
آج ——
سورج، صحرا، ریت، ریگستان، حدت اور پیاس
چاند، چاندنی، ریگستان، برف کی طرح سرد، محض سراب
طلوع ہوتا ہوا سورج، جھلستی دوپہر، اشک خوں روتی شام
پانی قلت
متلاشی نظریں، کچھ صبر، تھوڑا سا شکر، اور جہد مسلسل
پانی، محبوب لیکن...... نایاب
راجستھان اور وہاں کے لوگ
بھاگل، محبوب، سکورا، عاشق، ریت کے ذروں میں اترتا سورج، آنسو، آہیں، کراہیں، عظیم روایتیں

تہذیب تمدن، ٹوٹتی، بکھرتی، سب کچھ ان ہی ذروں میں پوشیدہ، مندر میں کلس، مسجد میں گنبد، مندر سے نکل کر صحرا کی وسعتوں میں دوڑتی مندر کی گھنٹیوں کی آوازیں، گنبد سے ٹکرا کر فضا کی اور لپکتی اذان کی صدائیں "میرا محبوب ..... مجھ سے بہت دور ہے۔ کوئی جا کر اس سے کہہ دے کہ میں اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہوں، یہ ..... یہ برہا کی آگ کب بجھے گی؟ ..... کب بادل چھائیں گے، دور آکاش سے گلے ملنے والو ..... آؤ کہ تمھاری راہ دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں، آؤ ..... ورنہ یہ آگ ..... ہمیں راکھ کر دے گی۔ ہمیں ..... ہاں ہمیں تمھارا انتظار ہے۔

نوحے، ماتم، گریہ، آنسو، کرب ..... اور بلائیں۔

"جو مجھے جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ اور جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ میں .....

"میں آپ کا سیوک ہوں۔ برسوں سے آپ کی سیوا کرتا آرہا ہوں کہ سیوا ہی میرا دھرم ہے۔ اور میرا دھرم بتا رہا ہے کہ ہماری سب سے بڑی ضرورت پانی ہے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے سرکار کو اس ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے اور سرکار ..... آپ کے اس سیوک کے کارن جان گئی ہے کہ ریت کے ان ذروں میں ہماری موت چھپی بیٹھی ہے۔ دن کے پہلے ہی پہر، سوریہ دیوتا آکاش سے اتر کر ان ہی ذروں میں سما جاتے ہیں۔ گرمی حد سے بڑھ جاتی ہے۔ زبانوں میں کانٹے پڑ جاتے ہیں۔ اور وہ تاوے جا لگتی ہے۔ اس کی اینٹھن ہمیں پہروں رلاتی ہے، ڈھور ڈنگر زبانیں لٹکائے ہمیں تکا کرتے ہیں۔ اور ہم ..... ہم چیخ پڑتے ہیں ..... یوں تو ہم برسوں سے چیخ رہے تھے لیکن ..... ہماری کمزور آوازیں سرکار تک پہنچنے سے پہلے ہی ریگستان کے بگولوں کی بندی ہو جایا کرتی تھیں پر آج ..... نیٹ، ایٹمی دھماکہ، آریہ بھٹ اور بھاسکر

جنگ، شکست، فتح، جنگ، بھوک اور پیاس

العطش، العطش، مشک و علم صیقل ہوتی تلواریں، تسبیح، سجدے، شکرن، شکرن، شکرن

دور، شمی تج کی کوکھ سے اڑتی دھول

واٹر ٹینکر، گرد کا طوفان، انجن کا شور، لمبی قطاریں

گھڑے، چھاگل، مشربہ اور صراحیاں

انتظار، محبوب، انتظار، عاشق، پانی، گرد کا بیٹھتا طوفان، دھندلے، ہیولے، واضح صورتیں

"آج میں ایک سندیسہ لایا ہوں

"سندیسہ

"سندیسہ

کیا ہو سکتا ہے

"سرکار نے گمبھیر وچار کے بعد ہماری سمسیا کا حل کھوج نکالا ہے۔

تھوڑے سے متبسم چہرے، حیرت سے پھیلتی آنکھیں

"اب ــــ ہماری آپ کی زبانوں پر کانٹے نہیں پڑیں گے کوئی پیاسا نہیں رہے گا۔ نہ پشو، نہ پنچھی، نہ ہی منش، سرکار ..... ہمیں سیراب کرنے کا پربندھ کر چکی ہے۔ جلد ہی پانی ہمارے گھروں میں ہوگا۔ آپ کو ..... آپ کو ان ٹینکروں کی راہ نہ دیکھنی ہوگی پتھرائی پتھرائی آنکھیں، اور سوکھے کنوؤں کی تہہ سے پھوٹتے سوتے۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں ..... کوسوں دور سے پانی گھر گھر کیسے پہنچے گا؟ ــــ یہی نا ــ تو سنئیے، ہماری سرکار اس علاقے میں نہر کھود دے گی ..... ریت کے ان ذروں میں جہاں آج ہماری موت چھپی بیٹھی ہے زندگی انگڑائیاں لے گی، سبزہ اگے گا ہریالی چھائے گی۔ سایہ دار درخت ہوں گے

"بند کرو یہ بکواس

پتھرائی آنکھوں کی پتلیوں کا رقص، سوالات کا آنکھوں سے فرار، ایک گونجتی آواز

"میں کہتا ہوں اپنی بکواس بند کرو

"کون ہو تم منتری مان؟

"یہ ماتھر صاحب ہیں

"ارے یہ ماتھر صاحب ہیں

"آپ انھیں نہیں جانتے ..... حیرت ہے

"ہاں تو منتری ماتھر جی ــــ ہماری سمسیائیں .....

"ہمیں ان سے زیادہ اپنی روایتوں کا خیال ہے۔

"لوگ پیاسے مر جاتے ہیں

"اس لئے کہ وہ اپنی روایت پرست جانا پسند کرتے ہیں

"یہ جھوٹ ہے

"اس کا اثر ــــ اب ہم ــــ تم سے سیکھیں گے

"تجویز پاس ہو چکی ہے۔ بہت جلد اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔ اور اس کے لئے ہمیں آپ کی سہائتا چاہئے۔

"تمھیں یہاں سے ایک بھی مزدور نہ مل سکے گا۔

سناٹا ..... صرف سناٹا

الیکسی لیٹر پر پیروں کا دباؤ، دوڑتے ہوئے بل ڈوزر، ہالے، سرکاری مزدور، کدالیں، پھاوڑے، تسلے پرآئیں، سنبل تیر سہ شعبہ، کمانیں، خود، تلواریں، گرز، علم وطبل اور ہزار ہا اسپ غضب ناک۔

"میں تمھاری گردنوں سے اپنی بیعت اٹھارہا ہوں۔ کہ میرے ساتھ رہنے والوں کی موت یقینی ہے یہ لوگ.....صرف میرے سر کے طلب گار ہیں!......ان میں سے کوئی تم سے باز پرس نہیں کرے گا.....میں پھر کہتا ہوں جو جانا چاہتا ہو، لوٹ جائے......کہ میرے ساتھ رہنے والوں کی موت یقینی ہے.....لو میں چراغ گل کئے دیتا ہوں.....جنھیں لوٹنے میں شرم آرہی ہو.....اب چلے جائیں

"رات کے دوسرے پہر میں نے آپ کو یہاں اس لئے جمع کیا ہے کہ ہم سب کو سرکار کے خلاف آواز اٹھانی ہے۔ ہمیں سرکار کو بتانا ہے کہ تمھاری نہر اپنے ساتھ ہمارا کلچر، اور ہمارا فطری حسن بہالے جائے گی۔

یلغار، دفاع، رجز، اور جنگ

ایک، دو، تین

دوست، احباب، عزیز، اقربا، آل واولاد

مورچے، نعرے، احتجاج، بے ضابطہ کاروائیاں،

لاٹھی چارج، آنسو گیس کے شیل، دھواں، سوزش،

بل ڈوزر، ہالے، سرکاری مزدور،

وقفہ

"میں عظیم روایتوں کا امین ہوں، دیکھو اب بھی باز آجاؤ۔ تم نے میرے دوستوں کو تہ تیغ کر دیا۔ عزیز واقارب مار دیئے، میرے بازو قلم کر دیئے، میری اولاد.......

"مسٹر ماتھر — اپنے آدمیوں کو سرکاری کاموں میں حارج ہونے سے روکیں، یہ نہر.....اگر تعمیر ہوگئی تو نئی روایت کو جنم دے گی۔

"میں ماضی کی عظیم ترین روایتوں کی سرکشا کی خاطر آپ کی سرکار کے خلاف اٹھا ہوں۔ آپ اس بات کو مان کیوں نہیں لیتے کہ آپ کی نئی روایت ہمارے کلچر کی قاتل ہوگی!

چنوتی، وارننگ، دھمکیاں، اور پھر فائرنگ

واپسی، استقامت، دم توڑتے انسان، بوڑھے، جوان، بچے اور خون، خون، خون، پانی، پانی، پانی۔

(برسوں کی مخالفتوں اور تصادم کے بعد آخر کار نہر تعمیر ہوئی، کمشنر منتری نے اس کا ادگھاٹن کیا۔ کنارے کھڑے لوگوں نے نہر کا پانی دیکھا تو ان سب کا سر جھک گیا۔ انھیں اپنی بے چارگی بہت یاد آئی

چھاگلیں کوڑیوں پہ ڈال دی گئیں، کمہاروں نے صراحیاں بنانی چھوڑ دیں، سکورے عنقا ہو گئے، پلاسٹک کے گلاسوں میں آج بھی جب وہ سب پانی پیتے ہیں تو انھیں ماتھر صاحب بے حد یاد آجاتے ہیں) ▯

شوکت حیات

ڈاکٹر مہادیر بھون
ہندرو۔ پٹنہ ۶

سیلاب

پانی بڑھتا جارہا ہے۔

آدمی، جانور، پیڑ پودے، سب کے سب دھیرے دھیرے اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے ہیں اور سیلابی ریلوں کی گود میں بے یار و مددگار آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔ پانی اگر اسی طرح بڑھتا رہا تو پہلے سیڑھیاں، پھر چھت، پہلی منزل، دوسری منزل، ......اور اسی طرح سارا شہر ڈوب جائے گا۔

سطح آب پر ایک چھپر بہا چلا جارہا ہے۔ اس کے اوپر ایک کمزور آدمی اپنے زرد ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے بسی کے عالم میں "بچاؤ بچاؤ" چیخ رہا ہے۔ ٹھیک اس کے بغل سے ایک تنومند تھکتی ہوئی بھینس بہہ رہی ہے۔ سیلابی تموج کے دو اطراف میں شہر بلندی پر ہے۔ جہاں کھڑے ہوئے لوگ یہ سب کچھ یا تو محض تماشا کی طرح دیکھ رہے ہیں یا سہمے سہمے اپنے اپنے علاقوں کی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

کچھ تنومند لوگ ہمدردی میں کود پڑے ہیں۔ تیزی سے تیرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ اسی طرف، جہاں ایک آدمی چھپر پر اور بغل میں کچھ دوری پر ایک تنومند بھینس بہے چلے جارہے ہیں۔ لوگ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں سب لوگ چھپر سے گذرتے ہوئے اس آدمی سے آگے بڑھ گئے ہیں اور چاروں طرف سے بھینس کو گھیر چکے ہیں۔ سب کے چہروں پر کامیابی اور حصول کی مسرتیں ہیں۔ آہستہ آہستہ سب لوگ بھینس کو کھینچ کر کنارے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آدمی پیچھے چھوٹ گیا ہے اور متوحش انداز میں "بچاؤ.....بچاؤ" چیختا ہوا اداس آنکھوں میں موت کو سمیٹے بہا چلا جارہا ہے۔

"بچاؤ.....بچاؤ....." کی چیخ دور ہوگئی ہے۔

پانی پھیلتا جارہا ہے۔ آدمی، جانور، پیڑ پودے سب کے سب دھیرے دھیرے اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے ہیں اور سیلابی ریلوں کی گود میں بے یار و مددگار آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔

سب کے سب یہی سوچ کر خوف سے لرز رہے ہیں کہ اگر پانی اسی طرح تیز رفتاری سے بڑھتا رہا تو ان کا کیا ہوگا۔ وہ لوگ جن کے ہاتھ آسمانی چھت تک پہنچ چکے تھے اور پاؤں زمین پر نہیں تھے اور یوں وہ تمام زمینی بلاؤں سے نجات حاصل کر چکے تھے، سیلاب کے ایک تیز ریلے میں ان کے جسموں کے پارے مٹی کی ناؤ بن جائیں گے اور پھر وہ

بھر بھرا کر پانی میں ریزوں کی طرح بہہ جائیں گے۔

سطح آب پر آبی پودوں کے ایک جھنڈ میں ایک آدمی کی لاش پھنسی ہوئی بہہ رہی ہے۔ پانی کے کنارے بہت سارے بیٹھے، کھڑے اور سوئے اپنے اپنے علاقوں کے حشر سے خوف زدہ ہیں۔ ایک طرف بیٹھے ہوئے کچھ سیاہ فام لوگ سطح آب کا بہت دور دور تک عقابی آنکھوں سے جائزہ لے رہے ہیں۔ پانی سے لاوارث لاشوں کو نکال کر اسے اسپتال کے اینا ٹومی ڈپارٹمنٹ میں فروخت کر دینا ان کے فاضل اوقات کا پیشہ ہے۔ یہی ان کی زائد آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ایک دو لاشیں کسی حد تک صحیح سلامت مل جائیں تو تھوڑی سی محنت سے رات بھر کی اچھی خاصی عیاشی کا انتظام ہو جاتا ہے۔ لاش پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ پانی میں کود پڑے ہیں۔

تیزی سے یہ لوگ لاش کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ لاش بالکل صحیح و سالم ہے۔ ان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ہے۔ یہ لوگ مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ لاش کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اتنے سارے زندہ آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر لاش نے مدد کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے ہیں۔

"ارے زندہ ہے......!!!

ان کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے اور وہ بوجھل بوجھل انداز سے الٹے پاؤں واپس لوٹ پڑے ہیں اچانک وہ مڑتے ہیں۔ لاش کے ہاتھ ہل رہے ہیں۔ اس کے قریب پہنچتے ہیں اور اسے ڈبکی لگا دیتے ہیں۔ ہلتے ہوئے ہاتھ دھیرے دھیرے ساکت ہو جاتے ہیں۔

پانی پھیل چکا ہے۔ شہر کے وسطی علاقے میں کمر تک پہنچ چکا ہے۔ شہر کی سب سے خوبصورت دائرہ نما کالونی میں پانی مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔ سب لوگ اپنے قیمتی اثاثے کے ساتھ چھتوں پر چلے آئے ہیں۔ پانی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک لاش کافی دیر سے کالونی کے علاقے میں سطح آب پر چکر کاٹتی ہوئی پھول اور سڑ رہی ہے۔ چکر کاٹتی ہوئی ایک مکان کے سامنے کسی چیز میں پھنس کر رک گئی ہے۔ لاش کا خالی پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے مرنے سے پہلے مرحوم مرنے کی اذیت ناک جدوجہد سے گذرا ہو گا۔ چہرے پر موت سے لڑنے والی شکنیں اتنی گہری ہیں کہ لاش کے پھولنے کے باوجود اب تک نمایاں ہیں۔ لاش کی آنکھیں پھٹی ہیں اور ان سے احتجاج کا مردہ لاوا ابل کر پانی میں اُبال پیدا کر رہا ہے۔

چھتوں پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ اپنا بیش قیمت اثاثہ چھتوں پر منتقل کرنے کے بعد مطمئن تھے اور سیلاب کے مناظر خوف اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پھولتی ہوئی اس لاش کو دیکھ کر انھیں ابکائی آنے لگی ہے۔ جس چھت کے پاس لاش آ کر رک گئی تھی اس پر سے کچھ لوگ ہاتھوں میں لکڑی لئے ہوئے بیزار قدموں سے پانی میں اترے ہیں۔ لکڑی کے ایک زوردار جھٹکے سے لاش پرے ہٹ جاتی ہے۔ اطمینان کی سانسیں لیتے ہوئے وہ اپنی چھت پر

واپس آ گئے ہیں۔

سطح آب پر تیرتی ہوئی لاش دوسرے مکان کے سامنے آ کر کسی چیز کے سہارے ٹک گئی ہے۔ اس چھت کے لوگ جو سیلابی منظر کے رومانی پہلو سے لطف اندوز ہو رہے تھے، پھولتی ہوئی لاش کو دیکھ کر پہلے تو حواس باختہ ہو گئے اور پھر ایک ابکائی ان کے اندر سے باہر آنے کے لئے کروٹیں بدلنے لگی ہے۔ یہ لوگ بھی اسی طرح لکڑی لے کر پانی میں اترتے ہیں اور لاش کو آگے دھکیل کر واپس چھت پر چلے جاتے ہیں۔

لاش بہتی بہتی تیسری چھت کے پاس آ کر رک گئی ہے۔ اس چھت کے لوگ بھی سڑتی ہوئی لاش کی ناقابل برداشت بدبو کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیتے ہیں اور پھر ایک ہاتھ سے منہ اور ناک بند کئے ہوئے پانی میں اتر کر لاش کو لکڑی سے آگے دھکیل دیتے ہیں۔

سطح آب پر بہتے بہتے لاش چوتھی چھت کے قریب آتی ہے اور یہاں سے اگلی چھت کی طرف دھکیل دی جاتی ہے اور پھر پانچویں چھت سے چھٹی چھت کی طرف پھینک دی جاتی ہے....... اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اور اسی طرح یہ لاش مستقل پوری کالونی کا چکر کاٹ رہی ہے۔ جس چھت کے پاس بھی پہنچتی ہے، اس چھت کے لوگ اسے آگے دھکیل دیتے ہیں۔ لاش کئی گھنٹوں سے سیلابی سطح پر اسی طرح سورج اور چاند کی کرنوں میں چکر کاٹتے کاٹتے سڑنے اور پھولنے لگی ہے۔ لاش کا خالی پیٹ بڑے غبارے کی طرح پھولتا چلا جا رہا ہے۔ ایک بے حد سیاہ کوا اڑتا ہوا آتا ہے اور لاش کی احتجاج سے بھرپور دونوں آنکھیں نکال لیتا ہے۔

خالی پیٹ پھولتا جا رہا ہے..... کچھ ہی دیر میں اسی طرح چکر کاٹتے ہوئے کسی بھی چھت کے پاس لاش کا پیٹ اچانک پھٹ جائے گا اور خالی پیٹ کی زہریلی بدبو ساری کالونی میں پھیل جائے گی۔ □

فرخندہ لودھی
۴۔ اے، ایمپرس پارک
لاہور، پاکستان

اخباری بات

بات تو اخباری ہے مگر کہنے کو جی چاہتا ہے۔

دانا کہتے ہیں "زندگی ایک کتاب ہے" لیکن جدید دور کی زندگی کو اخبار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نوع بنوع اور چٹ پٹی خبریں، جن میں سے کوئی بھی ذہن میں تادیر محفوظ نہیں رہتی۔

قادر آباد روڈ کسی زمانے میں ہرے بھرے کھیتوں میں سے یوں گزرتی تھی جیسے مالا میں ڈوری۔ آج کل یہ پختہ سڑک ہے جس کے دونوں جانب مکان، کارخانے اور گندگی کے ڈھیر ہیں۔ گنجان شہر کی شاہراہوں کی طرح یہاں بھیڑ بھاڑ تو نہیں تاہم اسے فارغ اور بیکار بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں شور اور ہنگامہ کبھی کبھی ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک گذرگاہ ہے بازار نہیں۔ راہیوں کو روکنے کے لئے دلکشی کا سامان نہیں۔

میں اس سونی سڑک پر اپنی دھن میں مگن چل رہی تھی کہ ایک آواز نے میرے قدموں کو بریک لگادی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"اور وہ میرے ہاتھوں مرگیا۔ جیسے کوئی کیڑا ــــ ہا ہا ــــ

میں نے فوراً قیافہ لگایا کہ مرنے والا مکھی مچھر نہ سہی کوئی کتا بلا ہوگا اور یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں تاہم میں ہمہ تن گوش تھی اور مجھے اپنے ساتھ ساتھ چلتی لال دوپٹے والی لڑکی کی بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ معمولی ناک نقشے والی اس لڑکی نے بولتے بولتے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:

"دیکھیں نا باجی! انھوں نے سکول کی ہر شے نیشنلائز کر لی ہے اور ....." میں نے اس کی بات اچک لی اور رائے داغ دی:

"کتنا اچھا ہوا ہے تمھیں اور کیا چاہئے ــــ انھوں نے وہ کام کیا ہے جو آج تک کوئی نہ کر سکا ــــ"

مجھے اس لمحے قوم کا مستقبل نہایت شاندار نظر آرہا تھا میں نے کہا:

"علم کی روشنی پھیلانے کے لئے لہو جلانا پڑتا ہے مگر اس پارٹی نے یہ کام نہایت سہل طریقے سے سر انجام دیا ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت ہر سمت امید کے در وا ہوتے نظر آ رہے تھے اور ہر در کے درے روشن آنگن تھا۔

انوکھی آرزو جیسی مسرت کی لہر میرے حلق میں پھنس گئی میں نے بے فکری سے قہقہہ لگاتے ہوئے، لال دوپٹے والی سے پوچھا:

"پھر ــــ"

اپنے پیچھے پیچھے چلے آتے لڑکوں کی آواز دوبارہ میرے سینے میں آکر لگی۔ لڑکا کہہ رہا تھا۔

"یار! پھر میں نے پسیری[1] اس کے سر پر دے ماری"

"اچھا ــــ پھر ــــ" دوسرے نے استفسار کیا۔

یہ گفتگو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ مار پیٹ اور قتل و غارت کا موضوع ہو تو انسان کا دھیان بلا تردد ادھر ہو جاتا ہے لیکن میری ہم سفر نہ معلوم کس مزاج کی تھی کہ بس اپنی ہانکے جاتی تھی۔ اب کے اس نے مجھ سے پوچھا:

"باجی! جب باقی سب نیشنلائزڈ ہو گئے، تو مجھے کیوں نہیں کیا؟"

"کیا مطلب؟"

میں نے اسے خوش کرنے کے لئے حیران اور پریشان ہو کر پوچھا۔ جس کا جواب اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دیا۔ وہ سچ مچ اداس تھی۔ روہانسی سی ہو کر بولی:

"دیکھیں نا! جمعدارنی ہو گئی، چوکیدار ہو گیا، بیلدار، مالی ــــ سارے ہی نیشنلائز ہو گئے ــــ ہیں"

"تو ایسی ضروری اور اہم نہ ہو گی بی بی!"

میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔ اصل میں میری تمام تر توجہ پیچھے تھی۔ اور میں چاہتی تھی کہ وہ کچھ دیر کے لئے اپنی ریں ریں بند کرے تو پتا چلے کہ لڑکے کے ہاتھوں مرنے والا کون تھا؟

"یار جس دم اس نے تڑپ کر آخری سانس لیا تو مجھے پاگل کتا یاد آیا جسے ابا نے گولی ماری تھی۔"

لال دوپٹے والی نے غم اور مایوسی بھری نظروں سے پاروں اور دیکھا پھر دوپٹے کو سنوارتے ہوئے تقریباً میرے ساتھ چپک کر چلنے لگی۔ اس کے لبوں سے شکایت اب بھی جاری تھی:

"قادر یہ بھی سرکاری ہو گئی اور مولوی جی جو کبھی کبھار آیا کرتے تھے۔" مجھے اس کی باتیں بک بک لگ رہی تھیں تاہم میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینا چاہی لیکن مجھے کوئی دلیل یا جواز سوجھ نہیں رہا تھا

[1] پانچ سیر کا باٹ۔

اسی لمحے پشت سے آواز آئی:

"دیکھو بی! جن کے سر پر سائیں[1] ہوں وہی ایسے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں ـــــ عام آدمی نہیں۔"

دوسری آواز نے پھر ہنکارا بھرا جیسے اندھیری رات میں کوئی بچہ بھوت پریت کی کہانی سنتے ہوئے لمبی سرد آہ بھرے ـــ میں نے کمال ہوشیاری سے ایک طرف تھوکنے کے بہانے سر موڑ کر پیچھے دیکھا۔

فلیٹ کریپ کا سبز سوٹ، پاؤں میں سفید کھسا، لڑکا اچھا خاصا پاکستانی جھنڈا بنا ہوا تھا۔ عمر یہی کوئی سترہ یا اٹھارہ برس ہوگی۔ اس کی چال میں عجب ٹنک اور مستانہ پن تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے ساتھ سر نیوڑھائے چل رہا تھا میں نے اندازہ لگایا لمبا 'ہنکارا' بھرنے والا یہی لڑکا ہوگا۔ اس دنیا میں کچھ لوگ صرف سننے اور سہنے کے لئے آتے ہیں کچھ کہنے اور کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ـــ ایک چپ سو سکھ ـــ ان کی زندگی قطرے کی طرح لرزتے کانپتے ختم ہو جاتی ہے۔

لڑکے ہمارے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ ان میں ایک تامل تھا۔ میرے کان اس کی آواز پر ہی تھے لیکن میں نے لال دوپٹے والی سے پوچھا:

"کیوں بی بی! تم بھی نیشنلائز ہونا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے بلا تامل جواب دیا:

"میرے ابا تو کہتے ہیں کہ ہم سب اسی دن نیشنلائز ہو گئے تھے جس دن پاکستان وجود میں آیا مگر بعد میں کچھ گھپلا ہو گیا۔"

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"خدا کی قسم باجی! میرے ابا بڑے سیدھے ہیں۔ میں بہت کہتی ہوں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ لوگ دینے لینے کے بغیر بات نہیں سنتے مگر وہ کہتے ہیں کہ تم بچی ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دی۔ اب کے میں نے اس کے کندھے کا سہارا لیا کیوں کہ میں لڑکھڑا گئی تھی۔

"ہاں پرانے لوگ جس خوش فہمی میں ہیں رہنے دو۔ اپنے عہد کے ساتھ خود نمٹو۔ بھی برخورداری" اپنی طرف سے میں نے پتے کی بات کی تھی لیکن میں جانتی تھی کہ لڑکی کی تسلی کے لئے ناکافی تھی کیوں کہ وہ نئے حالات کا شکار تھی۔

سبز سوٹ والا لڑکا اب پولیس والوں کو نہایت خنگی کالیوں کے ساتھ یاد کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک کھڑ اور

---

[1] سرپرست۔ پشت پناہی کرنے والا۔

سکوٹر رکشا ایک دوسرے کو کراس کرتے گزرے، مجھے فقط اتنا سنائی دیا:

"اس نے چوٹ کھاتے ہی اپنا سر سرکاری نلکے کے نیچے کر دیا۔ ٹھنڈے پانی کی دھار پڑتے ہی ـــ اللہ بیلی۔"

میرے اٹھتے ہوئے قدم کو میرے وجود کے اندر سے ٹھوکر لگی۔ لال دوپٹے والی نے دوپٹے کو پیشانی تک کھینچ لیا ـــ اب دونوں لڑکے ہمارے برابر برابر چل رہے تھے ـــ سبز پوش لڑکے کے چہرے پر خوشحالی کی لالی اور لاابالی پن تھا۔ لمبے لمبے بال، لمبی قلمیں، شکل و شباہت، خاصی دلکش تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ہم سفر اسے لگاوٹ سے تک رہی ہے ـــ اب ہم دونوں اس لڑکے کی گفتگو میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ اگرچہ رویے میں فرق عیاں تھا۔

"جناب! پھر پولیس آگئی ـــ سپاہی نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور ہتھکڑی لگانے لگا۔ میرے بچانے اسے اڑنگا دے کر وہ مارا۔ میرے ابا کو پتہ چلا وہ اسی وقت دوڑا دوڑ آیا ـــ تھانیدار نے موقعے پر ہی میرے ابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دئے ـــ "چودھری صاحب! یہ کیس تو قتل کا ہے ہی نہیں۔ میرے سپاہی سے جو گستاخی ہوئی اس کے لئے میں معافی مانگتا ہوں۔ دیکھئے چودھری صاحب! آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ سپاہی بھی بندہ بشر ہوتا ہے۔ غلطی ہو گئی۔"

دوسرے لڑکے نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں مفلسی کی زردی اور چہرے پر زمانے کا خوف طاری تھا۔ بال پریشان اور میلے کپڑے۔ میری ساتھی نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر دوبارہ اپنی بپتا کہنی شروع کر دی۔ وہ اپنے باپ کی پوزیشن واضح کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"میرے ابا پرانے خیالات کے ہیں۔ دنیاداری میں یقین نہیں رکھتے۔"

"چلو۔ تمھیں تو ہے ـــ تم ایسے کرو بی بی! کہ چپ چاپ گھر میں بیٹھ کر گھرداری کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔ لڑکیوں کے لئے یہ کام تو ہر وقت موجود رہتا ہے۔ عورت کچھ نہ بن سکے بیوی تو بن سکتی ہے ـــ شادی کرا لو ـــ اللہ اللہ خیر صلا ـــ" میں نے قصہ مختصر کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن شادی ایسے ہی نہیں ہو جاتی۔" لڑکی نے مجھے جواب دیا۔

"نہ معلوم کوئی دل والا مل جائے"

میں نے بات سنجیدگی کو مذاق میں اڑانا چاہا۔ اس پر وہ ہنس دی ـــ یونہی ہلکا سا ـــ

"باجی! آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔" اس نے پوچھا۔

اس پر میں نے قہقہہ لگایا ـــ بس کھوکھلا سا۔

ڈوبتا ہوا انسان تنکوں کا سہارا لینا نہیں بھولتا۔ کیوں کہ امید زندگی کی آبرو ہے۔

اس لمحے وہ لڑکی مجھے ایسی بھکاری نظر آئی جس کے ہاتھ میں نہ کاسا تھا نہ کاسہ سر میں بھیجا۔

میں نے احساس کا پورا زور خرچ کر کے کہا:

"بی بی! ہم چھوٹے موٹے سرکاری ملازموں کی کیا حیثیت ہے۔ تم اس مسئلے کے لئے کسی سیاسی آدمی سے کہو—— کسی بڑے افسر کو ملواؤ۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنی رفتار تیز کر دی جیسے مجھ پر اچانک انکشاف ہوا ہو کہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔

لال دوپٹے والی کا سکول میری منزل سے دو تین فرلانگ آگے قادر آباد روڈ پر ہی کہیں واقع تھا——

اب لڑکے ہم سے ذرا سا آگے چل رہے تھے۔ ان کی گفتگو ابھی جاری تھی اور ہوا بردوش پیغام کی طرح کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ سبز پوش نے کہا:

یارا میں نے اس چھوکرے کو جان سے مار دیا—— میرے گھر والوں نے مجھے گرم ہوا تک نہیں لگنے دی۔ کتنی مزے کی بات ہے۔"

اس کے ساتھی کی آواز کسی خالی کنوئیں میں سے آئی:

"یارا تمھارے اس کارنامے کی خبر کسی اخبار نے نہیں چھاپی؟"

"واہ۔ یہ کون سی نئی خبر تھی" وہ کچھ تامل کے بعد فخر سے بولا۔

"مٹھیاں—— مٹھیاں—— گرم گرم—— کیا سمجھے؟"

اس روز تمام وقت، میرا دھیان کام میں نہیں لگا۔ لڑکوں کی گفتگو میں بھول بھال گئی۔ البتہ لڑکی کا خیال آتا رہا۔ میں کتنی کنجوس ہوں—— کوئی دلاسا، کوئی بھروسہ—— مجھے اس کی اخلاقی مدد کرنی چاہئے تھی۔ ہاں میں اس کے لئے دعا کر سکتی ہوں—— لیکن نہ معلوم دعاؤں کے زمانے کہاں لد گئے۔ اب تو ایک الجھاؤ سا ہے۔

سہ پہر کام سے فارغ ہو کر واپس ہوئی تو سڑک پر روز کی طرح رونق تھی۔ کارخانوں کے مزدور اور مجھ جیسے لوگ چھٹی کر کے تیز تیز قدم اٹھاتے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی اپنی دھن میں قدم اٹھاتی چل رہی تھی کہ اتنے میں میرے سامنے جھپٹا سا پڑا—— ٹلے ٹلے—— جیسے کتوں میں دوڑ لگی ہو۔

میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سفید کھدر پر سبز سوٹ لال چنی کو ہوا میں اڑاتا دوڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے لڑکوں کا ایک گروہ چلاتا، ٹھٹھے لگاتا ہوا——

میں نے اچانک مردوں کے گھیرے میں سر ڈال دیا۔ گھیرے کے بیچوں بیچ میری صبح والی ساتھی اپنی چھاتیوں کو گھٹنوں میں دیئے، ننگے سر کو بانہوں سے ڈھانپے چیخ رہی تھی۔

مجھ پر نمرتی سی بے ہوشی چھا گئی—— اس کی چیخوں پر تیرتی ہوئی اک گونج میرے وجود کا حصہ بن گئی۔

"ان کو ردو—— جنھوں نے تجھے جنم دیا—— رو۔ کھسیٹے رو"—— ▯

سلام بن رزاق

خوں بہا

میری رگوں میں جہنم کدہ دہک رہا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا مگر محسوس کر سکتا ہوں کہ جسم سے بھاپ یوں اٹھ رہی ہوگی جیسے سمندر سے ابخرات اٹھتے ہیں گلے میں بار بار سوئیاں سی گڑ رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے کوئی سرہانے بیٹھا متواتر حلق میں پانی کے قطرے ٹپکاتا رہے۔ مگر وہاں کون تھا؟ اگر بس چلتا تو میں خود اپنے وجود کا گٹھر موت کے گھاٹ اتار آتا کہ پچھلے تین روز سے خود اپنا وجود ناقابل برداشت بوجھ بن گیا تھا۔

ابھی ابھی رگھو چپکے سے بتا گیا ہے کہ پاٹل کے مکان پر تھانے دار آیا ہے۔ تحقیقات کے لیے۔ اس کے ساتھ چار سپاہی بھی ہیں۔ پاٹل نے اس کے لیے اپنی کوٹھی میں ایک کمرہ مختص کر دیا ہے۔ جسم کی حرارت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا۔ رگھو مجھے وید کی دی ہوئی پڑیا کھلا کر۔ میرے حلق میں پانی کے دو گھونٹ انڈیل کر جا چکا ہے۔ مگر اس کی دی ہوئی اطلاع میرے کانوں میں ابھی بھنبھیری کی طرح گھوم رہی ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے مگر ہوا بالکل بند ہے۔ باہر تالاب، قبرستان اور بڑی سڑک تک پھیلے دھان کے کھیتوں پر دھوپ فولاد کی چادر کی طرح تنی ہوئی ہے۔ حبس سے گھبرا کر رگھو سے کھڑکی کھول دینے کو کہا تھا مگر اب دھوپ کی کرچیں آنکھوں میں اس بری طرح چبھ رہی ہیں کہ باہر ایک نگاہ دیکھنا بھی بے حد تکلیف دہ ہے۔ اٹھ کر کھڑکی بند کر دینا چاہتا ہوں مگر بدن پر جیسے کسی نے بڑی بڑی پتھر کی سلیں رکھ دی ہوں۔ اٹھنا تو کجا کروٹ لینا محال ہے۔ مگر نہیں اٹھنا تو پڑے گا ہی۔ اگر آج اس طرح سوتا رہ گیا تو پھر کبھی نہ اٹھ سکوں گا۔ چھاتی پر رکھی اس سل کو سرکانا ہی ہوگا۔ ورنہ تاحیات الٹے پڑے تلچٹے کی طرح چھٹپٹاتا رہ جاؤں گا۔ دائیں ہاتھ کی کہنی پر زور دے کر ایک جھٹکے سے اٹھتا ہوں اٹھ کر کھاٹ پر بیٹھ بھی جاتا ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحے لگتا ہے اچانک میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا ہوں اور چاروں طرف سے ہوا کے طاقتور جھکڑ چلنے لگے ہیں۔ سائیں۔ سائیں کان بج اٹھتے ہیں۔ بدن کانپتا ہے اور میں پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتا چٹانوں سے ٹکراتا۔ جھاڑیوں سے الجھتا کھائی میں آگرتا ہوں۔

تکیے پر سر رکھے اوندھے منہ گہری گہری سانسیں لیتا ہوں۔ آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر تک ہانپتے رہنے کے بعد سرہانے پڑے تولیے سے ماتھے اور گردن کا پسینہ پونچھتا ہوں۔ پھر بستر پر چت لیٹ جاتا ہوں۔ کھڑکی سے باہر دھوپ اس طرح برچھیاں تانے کھڑی ہے۔ ایک لمحے کو سوچتا ہوں۔ رگھو کی بات مان لوں۔ شام کو ساڑھے چھ بجے کی ٹرین سے گھر چلا جاؤں۔ مگر اب کہیں بھی جاؤں وہ منظر تو پرچھائیں کی طرح میرے ساتھ جائے گا۔ وہ منظر جس کا میں خود ایک جز بن گیا ہوں۔ بلکہ وہ پورا منظر میرے وجود میں کسی اپھنتے سمندر کی طرح سانسیں لے رہا ہے۔ اور میری آتما ایک بے بس تنکے کی طرح اس سمندر میں غوطے کھا رہی ہے۔ پچھلے تین روز سے کتنی بار یہ منظر آنکھوں میں تصویر ہوا اور پھر اوجھل ہو گیا۔

شام کے سائے ڈوب چکے ہیں۔ سورج پہاڑ کی اوٹ سے کسی دیو کی غضب ناک آنکھ کی طرح گھور رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیو کی آنکھ بھی چھپ گئی۔ شام کے مٹیالے اجالے میں ہنومان مندر کا کلس دکھائی دے رہا ہے۔ اتنے میں مندر کے پیچھے سے کوئی بھاگتا ہوا نکلا اور تیزی سے بائیں طرف دھان کے کھیتوں میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے سات آٹھ لوگ لاٹھی بلم لیے نکلے اور پہلے والے شخص کے پیچھے وہ بھی کھیتوں میں اتر گئے۔ پھر وہ نیم دائرے کی شکل میں دوڑتے ہوئے پہلے والے شخص کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔ میں ٹھٹھک کر پیپل کے نیچے رک گیا۔ کھیت کٹ چکے تھے۔ پودوں کی کٹی ہوئی جڑیں کھونٹیوں کی طرح زمین سے سر ابھارے کھڑی تھیں و کھیتوں میں دوڑتے لوگوں کو ان کی کھونٹیوں کی وجہ سے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ لوگ برابر دوڑ رہے تھے۔ اب آگے بھاگنے والے شخص کی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔ کیوں کہ وہ لڑکھڑا لڑکھڑا کر دوڑ رہا تھا۔ شاید اس کا پاؤں زخمی تھا۔ تعاقب کرنے والے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اتنے میں آگے بھاگنے والا شخص کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ اور دم کی دم میں پیچھا کرنے والے اس کے سر پہ پہنچ گئے۔ پھر کسی کی لاٹھی اس کے سر پر پڑی اور ایک دردناک چیخ دور تک گونجتی چلی گئی۔ کوئی چلایا۔ "زندہ مت چھوڑو۔ مارو ـــــ مار ڈالو"۔

اچانک ان میں سے ایک دو قدم پیچھے ہٹا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے بلم کو تولا اور پوری طاقت سے بلم کی انی گرنے والے کے سینے میں گاڑ دی۔ ایک تیز مگر ڈوبتی کراہ کے ساتھ باقی سبھوں کی لاٹھیاں ہوا میں تیرتی رہ گئیں۔ میں نے کانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب کھولیں تو مارنے والا زخمی شخص کے سینے سے اپنے بلم کو کھینچ لینے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ ایک پارہ پارہ خون آلود جسم بلم کے ساتھ ہی نصف

کے قریب اوپر کو اٹھ آیا تھا۔ بلم کی نوک شاید زخمی شخص کی پسلیوں میں پھنس گئی تھی۔ بیک وقت چار پانچ لاٹھیاں ہوا میں لہرائیں اور ایک ساتھ اس انسانی جسم پر پڑیں۔ زخمی شخص کا بے جان جسم کسی لٹھے کی طرح دھپ سے زمین پر گر گیا۔

"کون ہے ادھر؟"

آواز شری کانت کی تھی۔ میں پرانے پیپل کے نیچے یوں کھڑا تھا جیسے میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہوں۔ چاروں طرف اب اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"ارے کوئی بھی ہو۔ جانے مت دو حرام جادے کو۔"

وہ سب لاٹھیاں ٹھک ٹھکاتے میری طرف لپکے۔ اور مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شری کانت میرے قریب آیا۔ جھک کر میرا چہرہ دیکھا۔

"ارے یہ تو شالا ماشٹر ہے۔"

"کیوں ماشٹر اتنے بکھت کو یہاں کیا کرنے کو آیا تھا"

"ماشٹر بولو، نہیں تو تمہارا ابھی ادھر ہی کریا کرم ہو جائے گا"۔

کسی نے میری کمر میں لاٹھی کا ٹھوکا دیا۔ میں کیا جواب دیتا۔ میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"ماشٹر! بول نہیں تو ابھی بیندھ کر رکھ دوں گا۔ ادھر تو کیا کرنے کو آیا تھا"۔

"نہیں، نہیں دتّو! اس کو جانے دو گاؤں کا ماشٹر ہے اس سے باپو بات کریں گے"۔ شری کانت بیچ میں آگیا۔

"مگر اس نے سب کچھ دیکھا ہے"۔

"کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ شالا ماشٹر سالا، کیا کر سکتا ہے"۔

"تم جاؤ شری کانت! ہم اپنا کام کر چکے"۔

"چلو، ماشٹر صاب! اپنا راستہ ناپو، اور جو کچھ دیکھا اسے بھول جاؤ۔ ورنہ....."

پھر ایک لاٹھی سے میری کمر میں ٹھوکا دیتے ہوئے کوئی غرایا۔

"چل بھاگ ادھر سے ——— سالا ———"

کھٹ، کھٹ۔

"کون ہے؟" میں نے اپنی جلتی آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کھٹ کھٹ"۔

"کون ہے آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے"۔

"دروازہ کھلا اور پاٹل کا خاص نوکر گلاب راؤ میرے سامنے آ کھڑا ہوا"۔ گلاب راؤ تھوڑی دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا"۔

"ماشٹر! پاٹل نے کل تیرے کو بلایا تھا۔ کیوں نہیں آیا؟"

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیٹے لیٹے گلاب راؤ کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ گلاب راؤ نے آگے بڑھ کر میرا پنڈا چھوا"۔

"ارے، تم کو تو بخار ہے"۔ گلاب راؤ چند سیکنڈ تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "اچھا ماشٹر! میں جاتا ہوں۔ جب بھی طبیعت ٹھیک ہو جائے آجانا۔ میں پاٹل سے بول دوں گا"۔

گلاب راؤ چلا گیا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ پاٹل نے بلایا ہے۔ پاٹل کے گھر تھانے دار آیا ہوا ہے۔ ششی کے قتل کی تفتیش کے لیے۔ پاٹل نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

"تھانے دار صاحب! میں نے خود اپنی آنکھوں سے ششی کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ ہاں، قاتلوں کو میں جانتا ہوں۔ قاتل کوئی اور نہیں۔ آپ جس کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ یہی سب لوگ ششی کے قاتل ہیں"۔

مگر میں یہ سب کہہ پاؤں گا؟

"چلو ماشٹر اپنا راستہ ناپو۔ اور جو کچھ دیکھا اسے بھول جاؤ۔ ورنہ ...." رگھو کہہ رہا تھا۔

"آج سویرے ششی کی داہ کریا ہوگی۔ بے چارے کا بوڑھا باپ ارتھی کو کاندھا دینے بڑھا اور راستے ہی میں غش کھا کر گر پڑا۔ جوان بیٹے کی ارتھی تو پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ بوڑھے مادھو کی سوکھی ٹانگوں میں اتنی قوت کہاں؟"

میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہو۔ میں نے اپنے خشک گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"رگھو! پانی!!"

رگھو اس اچانک تبدیلی پر بوکھلا گیا۔ لپک کر صراحی سے کٹورے میں پانی انڈیلا اور میرے سر کو سہارا دیتے ہوئے کٹورا میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے دو تین گھونٹ پانی پیا۔ اور سر کو تکیے پر رکھ کر ہانپنے لگا۔

"ماسٹر صاحب! اب کیسا ہے؟ وید کو بلا کر لاؤں؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ پھر تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لیں۔ چند سیکنڈ بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو رگھو مجھے تشویش آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اب کیسا ہے؟" اس نے دوبارہ گھبرائے لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"رگھو اب تو جا، کافی دیر ہو گئی۔ تجھے ڈھور ڈنگر بھی دیکھنے ہوں گے۔"

رگھو شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اور میرے سامنے شششی کے بوڑھے باپ کا چہرہ گھوم گیا۔ ایک دبلا پتلا شخص، رنگ کچھ دھوپ، کچھ غربت نے سنولایا ہوا۔ سر منڈا ہوا جس سے سفید بالوں کی کھونٹیاں جھانک رہی تھیں۔ آنکھیں گدلی اور منہ قریب قریب پوپلا۔ کپڑوں کے نام پر اس کے چیتھڑوں کے درمیان پھنسی ہوئی ایک لنگوٹی اور کاندھے پر ایک میلا سا گمچھا۔

"ماسٹر صاب! شششی آپ کی بہوت عجت کرتا ہے۔ آپ اس کو جرا سمجھا دو۔ وہ آج کل پاٹل سے الجھا ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

"کہتا ہے مجوری بڑھا کر دو نہیں تو ہم لوگ کھیت میں کام نہیں کریں گے۔"

"مادھو! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "سبھی کھیت مزدور شششی کے ساتھ ہیں۔"

"نہیں ماسٹر صاب۔ دو چار کو چھوڑ کر کوئی بھی شششی کے ساتھ نہیں ہے۔ پاٹل کے غنڈوں سے سبھی ڈرتے ہیں۔"

"اچھا تم اسے میرے پاس بھیج دو، میں اس سے بات کروں گا۔"

مگر شششی میرے پاس نہیں آیا۔ شاید وہ جانتا تھا۔ مجھ جیسا معمولی، بزدل شالا ماسٹر اس سے کیا کہے گا۔ کیا کہہ سکتا ہے۔

"کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ شالا ماسٹر کیا کر سکتا ہے؟"

واقعی شالا ماسٹر کیا کر سکتا ہے۔ اگر میں تھانے دار کے پاس پہنچ کر خود کو گواہ کی حیثیت سے پیش کر دوں؟ مگر تھانے دار تو پاٹل کے گھر بیٹھ کر پوچھ تاچھ کر رہا ہے۔ کیا وہ میرا بیان سنے گا۔ اگر سن بھی لیا تو بیان دینے کے بعد کیا ہوگا؟"

"میں تو بولتا ہوں۔ اس کو بھی خلاص کر دے۔ بعد میں کھٹ کھٹ مت ــــــ" "ارے نہیں۔" تم نہیں سمجھتے۔ چلو ماسٹر! اپنا راستہ ناپو۔ اور دیکھو جو کچھ دیکھا اس کو بھول جاؤ ورنہ ....."

میں نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اپنی کنپٹیوں پر دباؤ ڈالا۔ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ کنپٹیوں پر دباؤ ڈالنے سے دماغ میں اٹھتی ٹیسوں میں قدرے کمی کا احساس ہوا۔ جی چاہ رہا تھا کوئی پاس بیٹھا اسی طرح دھیرے دھیرے کنپٹیوں پر دباؤ ڈالتا ہے۔ اور میں تھوڑی دیر کے لئے صرف تھوڑی دیر کے لئے سکون سے آنکھیں بند کیے پڑا رہوں۔ سونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ پچھلے تین دن سے جاگ رہا ہوں۔ اگر آنکھ جھپک بھی جاتی ہے تو خون میں لت پت ایک انسانی ہیولا سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور پھر چاروں طرف سے اس قدر دردناک چیخیں بلند ہوتی ہیں کہ میں ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔

پچھلی رات تو ایک بار اس بری طرح چیخا تھا کہ پڑوس سے رگھو دوڑتا ہوا آیا تھا۔ رگھو کی کاکی بھی ایک ٹوٹی لالٹین لٹکائے جس کی چمنی کالک اور دھوئیں سے پُتی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھے ٹٹولتی، ٹھوکریں کھاتی آ گئی تھی۔

"ماسٹر ساب، ماسٹر ساب!"

"باہر رگھو زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا تھا۔ میں بڑی مشکل سے چارپائی سے اٹھ پایا۔ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اور دروازے کی شکنی گرا کر دوبارہ چارپائی پر آ کر ڈھیر ہو گیا۔

"کیا ہوا ماسٹر ساب، کیا ہوا؟" رگھو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"کچھ نہیں رگھو ــــــ مٹکے سے تھوڑا پانی پلا دے۔"

کاکی نے بھی میرا پنڈا چھوا اور بولی۔

"ارے رگھوا! ماسٹر کو بہوت تاپ ہے رے!"

رگھو مجھے سہارا دے کر اٹھاتا ہوا بولا۔

"کاکی! میں نے تو سانجھ ہی کو کہا تھا کہ وید سے دوائی لو۔ مگر ماسٹر ساب نہیں مانتے۔"

میں نے دو گھونٹ پانی پی کر اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چار بج رہے تھے۔ کاکی لالٹین کو

فرش پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جھکی ہوئی پر تشویش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں پانی پی کر دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

"ماشٹر! چا بنا کر بھیجوں۔ دو گھونٹ گرم گرم چا پئیں گا تو اچھا لگے گا رے!"

میں نے قریب ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں کاکی! اب رہنے دو۔ سویرا ہونے کو ہے"۔

"چا پئیں گا تو بہوت فرق پڑے گا رے بابا! میرے پاس ہری چا کی پتی ہے"۔ کاکی لالٹین اٹھا کر دروازے کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔ پھر دو قدم چل کر رکی اور پوچھا۔ "گڑ کی چا چلیں گی نا رے بابا! ساکھر نہیں ہے میرے پاس"۔ میں نے کاکی کو پھر منع کرنا چاہا مگر نہیں کر سکا۔

"چلے گی کاکی! بس ایک پیالی بنانا زیادہ نہیں"۔

"اچھا —— اچھا ——"

کاکی باہر نکلتی ہوئی رگھو سے بولی۔

"رگھو! تھوڑی دیر سے آکر چائے کر جا —— ہاں"۔

رگھو فرش پر اکڑوں بیٹھا میرا سر دبا رہا تھا۔ مجھے تھوڑا سا راحت کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر رگھو اور کاکی نہ ہوتے تو شاید اس رات میں اس طرح چیخ چیخ کر بے ہوش ہو جاتا۔

پچھلے تین دن سے رگھو میرے کمرے کے کئی کئی چکر لگا چکا ہے۔ کبھی دوا پلاتا۔ کبھی کاکی کی دی ہوئی ہری پتی کی چائے یا ابلے چاولوں کی پیچ لا کر دیتا۔ سب سے پہلے اس نے مجھے آکر بتایا تھا کہ کچھ نامعلوم لوگوں نے نشتی کو ہنومان مندر کے پاس والے کھیتوں میں قتل کر دیا ہے۔ پھر شام میں خبر دی کہ تحصیل سے تھانے دار آیا ہے۔ پنچ نامہ ہو رہا ہے۔ لاش شہر لے جائی گئی ہے۔ تیسرے روز لاش پوسٹ مارٹم کے بعد اس کے بوڑھے باپ مادھو اور اس کی بیوہ کے حوالے کر دی گئی ہے۔ صبح بتایا کہ نشتی کی ارتھی اٹھائی گئی ہے۔ اور اسے شمشان میں نذر آتش کر دیا گیا ہے۔ اور ابھی ابھی خبر دے گیا ہے کہ تھانے دار چار سپاہیوں کے ساتھ پاٹل کے گھر میں بیٹھا قتل کی تحقیقات کر رہا ہے۔

"قاتل کے گھر میں قتل کی تحقیقات ——"

یہی سب سوچتے پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب دوبارہ آنکھ کھلی تو دن ڈوب چکا تھا۔ سامنے چار پانچ مرغابیاں تالاب میں ڈبکیاں لگا

رہی تھیں۔ اور دن بھر جنگل میں چرنے والے ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو لوٹ رہے تھے۔ ایک چرواہا یہہ، یہہ، یہہ کی آواز نکالتا، اپنا ڈنڈا بجاتا ریوڑ سے نکلے ایک بچھڑے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرے بدن کی ٹوٹن کم ہو گئی تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ ذہنی تناؤ بھی غائب ہو گیا تھا۔

میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قمیص پسینے سے تر تھی۔ میں اٹھ کر موری کے پاس گیا۔ لوٹے میں پانی لے کر منہ پر پانی کے دو چار چھپاکے دیئے۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ پسینہ خشک ہو چکا تھا۔ مگر بدن اب بھی چپچپا چپچپا لگ رہا تھا۔ میں نے قمیص اتار دی اور دوسری قمیص پہن لی۔ پھر چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ ذہن میں پھر پچھلے واقعات کے مناظر یوں رینگنے لگے، جیسے اسٹیج سے دھیرے دھیرے پردہ سرکتا جا رہا ہو۔ میں ان واقعات کو بار بار تصور میں دوہرا دوہرا کر مزید پریشان ہونا نہیں چاہتا تھا۔ تین دن سے میں جس کرب ناک عذاب سے گزر رہا تھا۔ وہ میرا ہی دل جانتا تھا۔ مجھے ایک طویل عرصے کے لیے آرام کی ضرورت تھی —— میں نے طے کر لیا کہ میں دو تین مہینے کی چھٹیاں لے کر گھر چلا جاؤں گا۔ اس بیچ چپ چاپ یہاں سے تبادلہ کروا لوں گا۔ اب میرا اس گاؤں میں رہنا، رہ کر کام کرنا بے حد مشکل تھا۔ چھٹی لینے سے پہلے پاٹل سے مل لینا ضروری تھا۔ پاٹل نے دو دو بار مجھے بلوا بھی بھیجا تھا۔ میں تین دن سے جس روحانی کرب سے گزر رہا تھا۔ اس نے میری روح کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ اب اس سے زیادہ برداشت کرنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ مجھے جلد ہی اس گاؤں کو چھوڑ دینا ہوگا۔ یا یہاں سے اپنا تبادلہ کروا لینا ہوگا۔ مگر یہ سب اتنی جلدی کیوں کر ممکن ہو سکے گا۔ چھٹی —— ہاں دو تین مہینے کی لمبی چھٹی تو لے ہی سکتا ہوں۔ مگر لمبی چھٹی سے پہلے پاٹل سے مل لینا ضروری ہے۔ اسکول کی چابی بھی تو اس کے حوالے کرنی ہوگی۔ میں دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے اٹھا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ اب داڑھی بنانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کنگھی اٹھائی۔ ادھر ادھر بالوں کو جمایا۔ چپلیں پہنیں اور گھر سے باہر نکل گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں رگھو نہ مل جائے۔ ورنہ اس حالت میں وہ مجھے اکیلے کہیں نہیں جانے دیتا۔ خود بھی ساتھ ہو لیتا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں مکان کے پچھواڑے سے گھوم کر پاٹل کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گھروں میں دیئے جل چکے تھے۔ بعض دوکانوں میں گیس کی بتیاں بھک بھک کر رہی تھیں۔ دو ایک جان پہچان والے ملے۔ انھوں نے پرنام کیا۔ میں نے پرنام کا جواب دیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ جب میں پاٹل کے گھر کے سامنے پہنچا تو اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پاٹل کے مکان کے سامنے چھت سے ایک بڑی سی گیس لالٹین لٹک رہی تھی۔ جس کی تیز روشنی سے پورا ورانڈا روشن تھا۔ میں پھاٹک سے داخل ہو کر ورانڈے

میں پہنچ گیا۔ دالانڈے میں ایک دری بچھائے پولیس کے چار سپاہی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ غالباً یہ وہی چار سپاہی تھے جو تھانے دار کے ساتھ تحصیل سے قتل کی تحقیق کے لیے آئے تھے۔ میرے دالانڈے میں داخل ہوتے ہی ان چاروں نے یکبارگی پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گئے۔ میں دالانڈے کے ایک ستون کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ نقاہت کی وجہ سے اتنی سی مسافت ہی میں میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ میں ستون سے ٹیک لگائے ایک منٹ تک سستاتا رہا۔ اتنے میں کہیں سے کتے کے غرانے کی آواز آئی۔ اور اس سے پہلے کہ میں پاٹل کو آواز دیتا ایک بڑا سا کتا غراتا ہوا مکان کے اندر سے باہر نکلا۔ میں نے گھبرا کر آواز دی۔ "پاٹل صاحب!"

کتا مجھ سے صرف دو بالشت کے فاصلے پر کھڑا گردن اٹھائے بھونک رہا تھا۔ اندر سے کسی نے پکارا۔ "موتی —— موتی ——"

اور ساتھ ہی گلاب راؤ باہر نکلا۔ 'موتی —— موتی' گلاب راؤ نے کتے کو پچکارا۔ اور موتی نے بھونکنا بند کر دیا۔ مگر اس کی غراہٹ اب بھی جاری تھی۔ میری جان میں جان آئی۔ گلاب راؤ نے مجھے پہچان لیا۔

"ارے ماشٹر تم ——"

"پاٹل صاحب ہیں گھر میں؟"

"ماشٹر! تم کو دن میں بلایا تھا۔ تم رات میں چلے آئے۔ پاٹل گھر پر ہیں۔ مگر تھانے دار صاب کے ساتھ کچھ جروری بات چیت کر رہے ہیں۔"

"ارے کون ہے؟ —— کیا بات ہے؟"

دالانڈے میں پسر کر بیٹھے ان چار سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے للکارا۔

"کچھ نہیں —— یہ گاؤں کا شالا ماشٹر ہے۔ پاٹل سے ملنے کو آیا ہے۔" گلاب راؤ نے وضاحت کی۔

"اس کو بولو۔ کل آ کر ملو۔ ابھی پاٹل ہمارے صاب کے ساتھ بیٹھا ہے۔ ابھی پاٹل کسی سے نہیں ملے گا۔"

گلاب راؤ میری طرف جھک کر ڈرنے اور ڈرانے والے لہجے میں بولا۔

"حوالدار صاب ہے۔ بڑے صاب کے ساتھ آئے ہیں۔ تم کل سویرے آ کر ملنا ماشٹر پاٹل سے۔ ابھی رات میں کیا کرو گے مل کر؟"

"گلاب راؤ مجھے پاٹل نے بلایا تھا۔ جا کر پاٹل سے کہو، میں آیا ہوں۔ اگر انھوں نے بلایا تو مل لوں گا۔ ورنہ سویرے آؤں گا۔"

"ارے گلاب راؤ! اس کو بولو، سویرے آ کر پاٹل سے ملو۔ نہیں تو صاب غصہ کرے گا۔"

"گلاب راؤ! جاؤ پاٹل کو میرے آنے کی خبر کرو۔" میں نے حوالدار کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"گلاب راؤ اندر جانے کا نہیں ——" حوالدار گلاب راؤ کو دھمکانے لگا۔

"پر صاب، پاٹل نے ان کو بلایا تھا۔ یہ سچی بات ہے۔"

"ارے بلایا تھا تو کل بھی مل سکتا ہے۔ آخر ابھی کے ابھی ملنے کے لیے یہ ہے کون؟"

"صاب! یہ ہمارے گاؤں کا شالا ماشٹر ہے۔"

"شالا ماشٹر ہے نا، لاڈ گورنر تو نہیں ہے۔"

اتنے میں اندر سے پاٹل کی دھاڑ سنائی دی۔

"کون ہے رے، گلاب!"

شاید پاٹل نے ہماری تکرار سن لی تھی۔ گلاب راؤ لپک کر اندر چلا گیا مونچھوں والا حوالدار مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گلاب راؤ پھر واپس آ گیا۔

"چلو ماشٹر! پاٹل نے بلایا ہے۔"

میں بپھرے حوالدار پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا گلاب راؤ کے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ مجھے بغل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں کیروسین کے بڑے بڑے دو لیمپوں کا گدلا گدلا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سامنے ایک صوفہ بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں پر کچھ تصاویر آویزاں تھیں۔

گلاب راؤ مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں تذبذب کے عالم میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

ایک کیروسین لیمپ کے پاس ہی دیوار پر ٹنگی ایک تصویر میں رام اور لکشمن ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک بھیلنی بیٹھی تھی اس کے سامنے بیروں سے بھری ٹوکری تھی۔ وہ ان دونوں کو بیر کھلا رہی تھی۔ دوسرے لیمپ کے ادھر ادھر دیوار پر ہرنوں کے دو سر لگے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک دو نالی بندوق ٹنگی ہوئی تھی۔

معاً اپنی پشت پر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ میں چونک کر پلٹا ۔ پاٹل اپنے اونچے پورے ڈیل ڈول کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا ۔ ان کی نکیلی مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں ۔ چہرہ تمتما رہا تھا اور بھویں تن گئی تھیں ۔

"اچھا ہوا ماسٹر ـــــ تم آگئے ـــــ بیٹھو" ۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ پھر خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ۔

"ماسٹر ! گلاب راؤ بول رہا تھا ۔ تم بیمار تھے" ۔

"ہاں پاٹل میں تین دن سے بیمار ہوں" ۔

"اچھا ـــــ اچھا ـــــ ٹھیک ہے ۔ ماسٹر تم ایک دو مہینے کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلے جاؤ ۔ تم کو آرام کی ضرورت ہے" ۔

پاٹل کے لہجے سے ہمدردی پھوٹی پڑ رہی تھی ۔

"ہاں پاٹل ! میں بھی یہی کہنے آیا تھا" ۔

"کب جا رہے ہو ؟"

"سویرے کی گاڑی سے چلا جاؤں گا ۔ یہ اسکول کی چابی رکھئے" ۔ میں نے اسکول کی چابی اس کی طرف بڑھا دی ۔ اس نے چابی لے لی ۔

"اچھا ہے ۔ اسٹیشن تک گلاب راؤ کو بھیج دوں ـــــ ؟"

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ میں چلا جاؤں گا" ۔

"اچھا ماسٹر ! چھٹی میں خرچے پانی کے لیے رکھو" ۔

پاٹل نے جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا ۔ "پانچ سو روپے ہیں" ۔

"پاٹل صاحب !" میں جھٹکے سے صوفے سے کھڑا ہو گیا ۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو ۔ غصہ ذلت اور ندامت سے میرا جسم کانپ رہا تھا ۔

"بیٹھو ماسٹر ، بیٹھو ـــــ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ۔ بیٹھو" ۔

"پاٹل صاحب ! اب مجھے اتنا ذلیل تو مت کرو" ۔ میرے الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے ۔

"ماسٹر ! مجھے غلط مت سمجھو ، جو کچھ ہوا اس کا مجھے بھی بے حد دکھ ہے ۔ مگر یہ چھوکرے کب کسی کی سنتے ہیں ۔ اب یہی دیکھو ۔ غلطی یہ لوگ کرتے ہیں ۔ نبھانا ہم کو پڑتا ہے" ۔

پاٹل نے یہ بات کچھ اتنے پر سکون انداز میں کہی ۔ جیسے شری کانت اور دتو نے ششی کا قتل

نہ کیا ہو محض پڑوس کی بیری پر ایک آدھ پتھر مار دیا ہو ۔ میں چپ رہا ۔ یک بیک ششی کی خون میں ڈوبی لاش میرے آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ۔ میرے کان انسانی چیخوں سے گونج اٹھے ۔ اس کا باپ ایک ارتھی کو کاندھا دیئے لڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا ۔

"پاٹل ، مجھے سب معلوم ہے ۔ مجھے سب معلوم ہے ، اب مجھے جانے دو ۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے" ۔

میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ۔ میں ہلکے ہلکے ہانپ بھی رہا تھا ۔

"ماسٹر ! پریشان مت ہو ، تم سیدھے سادے آدمی ہو ۔ تم نہیں جانتے یہ سب ہر جگہ ہوتا رہتا ہے ۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ چھوکرے اس حد تک بڑھ جائیں گے ۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے ۔ جو ہونا تھا ہو چکا ۔ ان روپیوں کا غلط مطلب مت لو ۔ تم دو تین مہینے کی چھٹی پر رہو گے ۔ تمھیں روپیوں کی ضرورت ہو گی ۔ انھیں رکھو اپنے گاؤں جا کر اپنا علاج بھی کرنا" ۔

پاٹل دو قدم آگے بڑھا ۔ اس نے وہ لفافہ میری جیب میں ٹھونس دیا ۔ مجھے تعجب ہے کہ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کیوں نہیں دیا ۔

پاٹل نے دروازے کی طرف مڑ کر پکارا ۔

"گلاب راؤ !"

گلاب راؤ اندر آیا ۔

"گلاب راؤ ! ماسٹر کو گھر تک چھوڑ آؤ ۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ۔ اچھا ماسٹر ! ـــــ"

پاٹل میرے کاندھے کو تھپتھپاتا ہوا الٹے قدموں لوٹ گیا ۔ میں بیچ کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا تھا ۔ گلاب راؤ کی آواز میرے کانوں میں آئی ۔ "چلو ماسٹر !"

اور میں سحر زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا ۔ ورانڈے سے گذرتے ہوئے پیچھے سے حوالدار کی آواز آئی ۔

"گلاب راؤ ! کدھر ؟"

گلاب راؤ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا ۔ اس نے شاید پلٹ کر انھیں اشارے سے کچھ کہا ۔ چاروں حوالدار ہی ۔ ہی ، کر کے ہنسنے لگے ۔ میں پھاٹک سے باہر نکل آیا ۔ گلاب راؤ اب میرے ساتھ آ گیا تھا ۔

"کیا ماسٹر ! کیا بولا پاٹل نے ـــــ ؟"

میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔

"گلاب راؤ، تم واپس جاؤ —— میں چلا جاؤں گا گھر ——"

"ارے نہیں ماشٹر! چلو میں گھر تک چلتا ہوں"۔

"میں نے کہا نا —— میں چلا جاؤں گا۔ میری فکر ست کرو۔ میں ٹھیک ہوں"۔

"میں واپس گیا تو پاٹل غصہ ہوگا ماشٹر"۔

"نہیں ہوں گے —— ان سے کہہ دینا میں نے واپس کر دیا ہے"۔

گلاب راؤ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا سا کھڑا رہا۔ پھر کاندھے اچکا کر بولا۔ "تمھاری مرضی ماشٹر!"

اور مڑ کر پاٹل کے مکان کی طرف چلا گیا۔

جب اس کی شبیہہ تاریکی میں ڈوب گئی تب میں بھی دھیرے دھیرے ایک طرف کو چلنے لگا۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ گلیوں کے نکڑوں پر گرام پنچایت کے لیمپ پوسٹ بیمار بوڑھوں کی طرح کپکپاتے کھڑے تھے۔ مکانوں کی چمنیوں اور اولتیوں سے دھواں نکل نکل کر ماحول کو گدلا کر رہا تھا۔ میں کچی سڑک پر بکھرے پتھروں سے بچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اپنے آپ میں ڈوبا، خیالوں میں گم۔

کل سویرے سورج نکلنے سے پہلے میں گاؤں چھوڑ دوں گا۔ رگھو سے رات ہی میں کہہ دوں گا بہت دکھ ہوگا اسے —— نہیں اس سے یہ نہیں کہوں گا میں اس گاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ورنہ رو رو کر مجھے پریشان کر دے گا۔ نہیں اب میں اس گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ اس گاؤں کی ہر کھڑکی سے شری کانت اور دتو کے چہرے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر دیوار سے ششی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ششی کی آخری چیخیں دوبارہ کانوں میں بجنے لگیں۔ اس کا بلم سے چھدا جسم نظروں کے گھیرے میں چھٹپٹانے لگا۔

اف، کیا اب اس منظر سے، ان چیخوں سے میں کبھی پیچھا نہ چھڑا پاؤں گا؟

اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی۔ میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں چونک کر رک گیا۔ میں ششی کے جھونپڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے جھونپڑے کے سامنے ایک قندیل جل رہی تھی۔ دروازے کے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن پر چار پانچ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اندھیرے میں ان کی صرف کالی کالی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ انھیں میں کوئی ششی کا باپ مادھو بھی ہوگا۔ ششی کے جھونپڑے کے اندر بھی ایک چھوٹا سا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ دیے کی روشنی میں اندر بھی دو تین عورتیں گٹھریاں سی بنی

بیٹھی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا چارپائی پر بیٹھے لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی باتیں بند ہو گئیں۔ جب میں بالکل ان کے قریب پہنچ کر رک گیا تو ایک آواز آئی۔

"کون ہے؟"

انھوں نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں تھا۔ میں چپ رہا۔ ان میں سے ایک شخص اٹھا۔ دروازے میں ٹنگی لالٹین لے کر میرے قریب آیا۔ لالٹین کو چہرے تک اٹھا کر میرے چہرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"کون ہے کاشیا!"

غالباً یہ سوال مادھو نے ہی پوچھا تھا۔

"شالا ماشٹر!"

"ماشٹر ——" تھوڑی دیر تک سب چپ رہے۔ پھر کوئی بولا۔

"ادھر آؤ، ماشٹر ادھر آؤ ——"

چارپائی پر بیٹھے سبھی لوگ کھڑے ہو گئے۔ میں نے مادھو کو پہچان لیا۔ مادھو اپنی چارپائی پر سے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مادھو —— بیٹھو ——"

"تم بھی بیٹھو ماشٹر ——"

"میں بیٹھ رہا ہوں۔ میں بیٹھ رہا ہوں"۔

کہتا ہوا میں اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ کھڑے تھے۔ مادھو بھی اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا میں نے اندھیرے میں دیکھا اس کا جسم پتنگ کی طرح کانپا۔ اور وہ پچاس ساٹھ برس کا بوڑھا شخص بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے جھک کر اس کے لرزتے کانپتے کاندھے تھام لیے۔ مادھو تھوڑی دیر تک اسی طرح پھپھک پھپھک کر روتا رہا میں بت بنا اسے دیکھتا رہا تھوڑی دیر بعد مادھو اپنے کاندھے پر پڑے گمچھے سے آنکھیں اور ناک صاف کرنے کے بعد بولا۔

"کھلاس ہو گیا ماشٹر! سب کچھ کھلاس ہو گیا"۔

"مادھو ——" میں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر میری بزدلی نے پھر میرا گلا دبا دیا۔ اور میں کھانسنے لگا۔ کھانسنے لگا تو کھانستا ہی چلا گیا۔

"مادھو! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تین دن سے بخار ہے۔ کل سے چھٹی پر جا رہا ہوں۔ سوچا جانے سے پہلے تم سے مل لوں"۔

کاشیا لالٹین کو قریب کی ایک اینٹ پر رکھے کھڑا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ہمارے سائے ہماری جسامت سے دس گنا بڑے ہو کر جھونپڑے کی دیوار پر لرز رہے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب ماتمی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں سب چپ چاپ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ کیسٹروں کی کرکراور کبھی کبھی پتوں کی سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے اندر ایک عجیب سی ندامت ایک عجیب سی بے اطمینانی محسوس کی۔ آخر میں تھوڑی دیر بعد چارپائی سے اٹھتا ہوا بولا۔

"اچھا مادھو! میں چلتا ہوں۔ مجھے سویرے سوا پانچ کی گاڑی سے اپنے گھر جانا ہے"۔

"اچھا ماشٹر!" مادھو نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں پاس ہی سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ جھونپڑے کے سامنے چھجے کی کڑیوں سے ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ بچے کے رونے کی آواز اس جھولے ہی سے آ رہی تھی۔ کاشیا نے ہاتھ بڑھا کر جھولے کو دو تین جھٹکے دیئے۔ بچے کا رونا رک گیا۔

"تشتی کا بچہ ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"ہاں ——" کاشیا نے جواب دیا۔

میں اٹھ کر جھولے کے قریب گیا۔ سن کے بورے کے چاروں سروں کو چار الگ الگ سوں سے باندھ کر رسیوں کے چاروں سرے چھجے کی کڑیوں میں باندھ دیئے گئے تھے۔ میں اندھیرے کے سبب بچے کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ مگر اتنا اندازہ ہو گیا کہ ایک دس گیارہ مہینے کا تندرست بچہ جھولے میں سویا ہوا ہے۔

میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا —— اور —— اس دوران سب کی نظریں بچا کر پاٹل کا دیا ہوا پانچ سو روپے کا پاکٹ اس کے پنگوڑے میں ڈال دیا

پھر میں تیزی سے مڑ کر بولا۔

"اچھا —— مادھو، اب میں چلتا ہوں"۔

"ماشٹر آدھی پیالی چا تو پی کر جاؤ ——"

"نہیں مادھو دیری ہو جائے گی۔ پھر کبھی —— سویرے جلدی اٹھنا ہے۔ اچھا ——"

میں مادھو اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر تیز تیز قدم اور بھاری من کے ساتھ اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔ □

علی حیدر ملک پاکستان

اُتھلے جل کی مچھلی

سارا شہر کرفیو کا کفن اوڑھے سو رہا تھا۔

رات بہت ڈراؤنی اور پر اسرار ہو گئی تھی۔ ہر چیز سانس روکے۔ دم بخود تھی۔ اس بھید بھری خاموشی میں صرف بوٹوں کی آواز وقفے وقفے سے ڈنکے کی چوٹ کی مانند بلند ہوتی اور پھر رفتہ رفتہ کہیں تحلیل ہو جاتی۔ اچانک ایک انسانی چیخ ابھری اور خوف و احتیاط کے سارے پردے چیر کر گلی گلی بین کرنے لگی۔

میں نے تکئے سے سر اٹھا کر پہلے آواز کی سمت متعین کی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس سمت میں چلنے لگا جدھر سے چیخ کی آواز آئی تھی۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد وسوسے کی سنگینوں نے مجھے چاروں طرف سے آگھیرا —— اگر کسی نے اس گھور اندھیرے کے باوجود میرا اٹھا ہوا سر دیکھ لیا۔ یا میرے وجود کی آہٹ محسوس کر لی تو؟ —— انجام کا تصور زیادہ مشکل نہیں تھا۔

انجام کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سر نہوڑا لیا اور زمین پر جھک کر کسی زخمی جانور کی طرح گڑگڑنے لگا۔ خوف کی چیونٹیاں اب بھی میرے اندر رینگ رہی تھیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے زمین پر رکھ کر پاؤں پیچھے کی طرف پھیلا دیئے اور زمین کے سینے سے سینہ ملا کر آگے بڑھنے لگا۔

گندے تالاب کے اس پار بانس کی جھاڑیوں کے درمیان گھری جھونپڑی سے چیخیں اب بھی رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔

جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا —— دروازہ کھلا تھا۔ اور عین دروازے کے سامنے ایک دبلا پتلا سا آدمی ایستادہ تھا جس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی دھول اڑ رہی تھی۔ اس کی پشت پر دو لڑکیاں تھیں۔ خوف زدہ ہرنیوں کی طرح سہمی اور دبکی ہوئی اور ان کے پیچھے سراسیمگی کی تصویر بنی ایک ادھیڑ عمر کی عورت۔ ان سے ذرا ہٹ کر دونوں جوان پستول تانے کھڑے تھے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی دبلے آدمی کی آنکھوں میں امید کا سورج طلوع ہوا مگر دونوں نوجوانوں کے چہرے پر ناگواری کے سانپ لہرانے لگے۔

"تم یہاں کیسے آمرے ہو؟" ـــــ ایک نوجوان نے بارود بھری آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنے آیا ہوں۔" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم ؟" ـــــ دوسرا نوجوان مکروہ سی ہنسی کے ساتھ بولا ـــــ "ہم ان لڑکیوں کو لینے آئے ہیں۔" ہرنیوں کی مانند سہمی ہوئی لڑکیاں تیز ہوا کی زد پر آئے ہوئے درخت کی کمزور کچی شاخوں کی مانند تھرتھرانے لگیں۔

"لیکن میں تمھیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" میں نے اپنے اندر کی ساری قوت اور سارا اعتماد سمیٹ کر کہا۔

"یہ غدار کی لڑکیاں ہیں اور ہمارے لئے مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تمھیں ان سے کیا واسطہ؟" ایک نوجوان نے اپنی پستول کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم شاہی قبیلے کے فرد ہو اور یہ غدار ماہی قبیلے کا آدمی ہے...." دوسرے نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں شاہی قبیلے کا فرد نہیں ہوں" ـــــ میں نے سختی سے اس کی تردید کی۔

"تم شاہی قبیلے کے نہیں ہو پھر بھی تمھارا تعلق اسی قبیلے سے بنتا ہے۔ ماہی قبیلہ تمھارے اور شاہی قبیلے کے خلاف ہے اس طرح ....."

"میں کسی قبیلے کا نہیں ہوں۔ کوئی قبیلہ میرا نہیں ہے" ـــــ میں نے بلند آواز میں کہا ـــــ "یا میں ہر قبیلے کا ہوں۔ ہر قبیلہ میرا ہے ـــــ مگر کان کھول کر سن لو۔ میں تمھیں وہ ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ جو تم قبیلے کے نام پر کرنا چاہتے ہو۔"

"غدار!" ـــــ ان میں سے ایک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں تمھیں اس غداری کا مزا چکھاتا ہوں۔" دوسرا نوجوان پستول لہراتا ہوا آگے بڑھا مگر قبل اس کے کہ وہ مجھے گولیوں کا نشانہ بنائے میں نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں نے دیکھا دبلے پتلے آدمی نے بھی دوسرے نوجوان کو دبوچ لیا تھا ـــــ دونوں لڑکیوں نے شیرنی کی طرح جھپٹ کر نوجوانوں کے ہاتھوں پر جن میں انھوں نے پستول پکڑی ہوئی تھی اپنے دانت گڑو دیے۔ وہ دونوں اچانک چیخ پڑے اور ان کے ہاتھوں سے پستولیں تقریباً ایک ساتھ ہی زمین پر گر پڑیں۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ جانے کے بعد ان کا سارا دم خم ہوا ہو گیا اور وہ غصّے اور نفرت سے مجھے گھورنے لگے۔

"فوراً یہاں سے دفعان ہو جاؤ اور پھر کبھی بھولے سے بھی اِدھر کا رخ نہ کرنا" ـــــ میں نے کہا وہ دونوں اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سہلاتے، دانتوں کو پیستے، دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں کہیں ڈوب گئے۔

دُبلا پتلا آدمی آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔" اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور گردن جیسے کسی بوجھ سے دَبی جا رہی تھی۔ "یہ میری بہن ہے ـــــ اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا ـــــ "اور یہ میری بیٹی" اس نے دوسری لڑکی کی جانب انگلی اٹھائی دونوں لڑکیوں نے ایک لمحے کو میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

اچانک موسم تبدیل ہو گیا۔ طوفان کا رُخ اب دوسری سمت میں تھا۔ ہر طرف آہ و بُکا اور نالہ و شیون کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ بارود اور انسانی خون کی بو پھیل رہی تھی۔ میں نے کئی دن تک سورج کی روشنی اور آسمان کی نیلاہٹ نہیں دیکھی۔ اور پھر ایک دن طوفان میرے دروازے پر دستک دینے لگا۔

"تم غدار ہو۔ تم نے ہمارے قبیلے کے خلاف سازش کی ہے۔"

"تم دلال ہو۔ تمھیں دلالی کی سزا بھگتنی ہوگی۔"

میں گم سم کھڑا رہا۔ میں نے کسی کے خلاف سازش اور کس کی دلالی کی تھی، مجھے معلوم نہ تھا۔

"چپ کیوں کھڑے ہو؟"

"چلو۔ اِسے غداروں کی آخری آرام گاہ میں لے چلو۔"

"نہیں، تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس نے کوئی دلالی، کوئی سازش نہیں کی۔" تالاب کے اس پار رہنے والے دبلے پتلے شخص نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا جیسے کہیں دور سے دوڑ کر آ رہا ہو۔

"اس نے ہمارے دشمنوں کا ساتھ دے کر ہم سے غداری نہیں کی ؟"

"نہیں۔ اگر یہ ایسا کرتا تو آج میں تمھیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

جب طوفان ٹل گیا تو میں نے اس آدمی سے کہا ـــــ "تم مجھے کب تک اس طوفان سے بچا سکو گے اس نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔ آج نہیں تو کل مجھے پھر آ گھیرے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔"

اس نے اپنی زبان بند رکھی اور قدموں کو حرکت دی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ قدم اٹھائے اور ہم دونوں بانسوں کے جھنڈ کے درمیان تالاب کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے۔ رنگ برنگی مچھلیاں تالاب میں اِدھر سے اُدھر دوڑ لگا رہی تھیں۔ اس نے مچھلیوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یوں تو ایک سے ایک مچھلیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ سلیمانی مچھلیاں پسند ہیں۔" وہ چلا گیا ـــــ اور جب دوبارہ آیا تو اس کا سارا وجود رسوائیوں کے داغ سے لہولہان تھا۔

"کیا ہوا؟ تمھیں کس سانپ نے ڈس لیا؟"

"آستین کے سانپ نے۔"

"آستین کے سانپ نے؟"

"ہاں! طوفان اب بگولا بن گیا ہے۔ کوئی گھر اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس اندھے طوفان نے مجھے میری ماں جائی اور میرے خون کے پیکر سے جدا کر دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ لوگ میری بہن اور بیٹی کو۔۔۔۔۔"

"لیکن وہ تو تمھارے اپنے قبیلے کے۔۔۔۔۔"

"پاگل کسی کو کب پہچانتے ہیں۔۔۔۔۔" اسے چپ سی لگ گئی۔

"کیا تم نے شاہی قبیلے میں جانے کا واقعی فیصلہ کر لیا ہے؟" اس نے ذرا ٹھہر کر سوال کیا۔

"ہاں! یہاں تو اب اپنا سایہ بھی خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔"

"میں بھی اس قبیلے کو خیرباد کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟" تالاب کے کنارے آکر مچھلیوں کو گھورتے ہوئے اس نے بڑی حسرت کے ساتھ پوچھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تمھیں تو سلیمانی مچھلیاں پسند تھیں۔۔۔۔۔" میں اس سے کہنا چاہتا تھا — "میں بھی اصل مچھلیوں کا پرستار ہوں لیکن۔۔۔۔۔

لیکن میں خاموش رہا اور نظریں پانی پر جما دیں — مبادا اس کے ہاتھ سے موہوم سا وہ آخری تنکا بھی چھوٹ جائے جسے حرزِ جاں بنائے ہوئے میں اب تک زندہ تھا۔ □

ایس۔ این۔ شاہ

ویمنس پالی ٹکنیک
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کہانی

یہ جو میری بیوی ہے ان دنوں ایک نوعمر لڑکی تھی اور لوگ کہتے ہیں کہ بہت آوارہ تھی۔ اس کی ماں ایک بدکار عورت تھی اور اس کی ماں کی ماں — اب یہ بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ خیر —

تو ان ہی دنوں وہ ایک روز اپنے ساتھی لڑکوں کے ساتھ پکنک پر گئی۔ بھری برسات تھی۔ آسمان پر دور دور تک بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ہلکا ہلکا سا ٹھنڈا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

وہ اور اس کے دوست چاروں لڑکے اپنی ٹوٹی پھوٹی موٹر میں پوں پوں والا ہورن بجاتے دیہات کی کچی پکی سڑک پر ہچکولے کھاتے قہقہے لگاتے چلے جا رہے تھے۔ دور دور تک پھیلے کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور ان میں کہیں کہیں ایک ایک دو دو بگلے چل پھر رہے تھے۔

ایک جگہ جب کیچڑ میں موٹر کے پچھلے پہیے دھنس گئے تو وہ ٹھپ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ داڑھی والے نے انجن کی چابی نکال کر جیب میں ڈالی اور ربڑ کا گولہ زور زور سے دبا کر ہورن بجایا اور اعلان کیا کہ بھائیو اب گاڑی آگے نہیں جائے گی اترو اور اپنا اپنا مال اسباب اپنے کندھوں پر رکھ کر اپنے پیروں پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو کہ پکنک اسپاٹ ابھی کچھ دور ہے۔

زمبو نے اتر کر سینہ پھلایا، پیلٹ کسی اور دونوں پیر چیر کر کھڑا ہوا ایک جھٹکے کے ساتھ دری اور گول تکیوں کا گٹھر اپنے کندھے پر رکھا اور ہاتھ میں کھانے سے بھرا کیس لے کر آگے آگے ہو لیا۔ ورزش سے اس کا جسم کسا ہوا تھا۔ وہ جمنیزیم کا رسیا تھا اور اکثر خواب میں زبسکو سے کشتی لڑتا تھا۔

اس کے پیچھے گھنگھریالے بالوں والا لانبا خوبصورت دیوتا چلا پھر معلمے خاں اور داڑھی اور سب سے آخر میں نزاکت سے پیر دھرتی مورنی۔

کھیتوں کی منڈیروں پر چڑھتے اترتے ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہنستے بولتے وہ ایک چھوٹے سے میدان میں پہنچ گئے۔ اس کے ایک کنارے پر زمین ذرا اونچی سی تھی اور اس پر کسی کسان نے جاڑوں میں کھیت رکھانے کے لیے کچی پکی سی جھونپڑی بنائی تھی جو اب خالی پڑی تھی۔ جھونپڑی

کے پیچھے آم کا باغ تھا۔ گہرے سبز پتوں میں ادھ پیلے گدرائے آم جھول رہے تھے۔

موری نے داڑھی سے کہا۔

"ہائے رام ——"

داڑھی نے کہا

"اوش —— جاؤ تو یار معاملے خاں —— یہ لو روپے —— وہ سفید تھیلا لے لو ——"

معاملے تھیلا لے کر باغ کی طرف کٹ گیا۔

پہلوان بوجھ اٹھائے آگے آگے چل رہا تھا۔ اور پیچھے دیوتا اپنے آپ میں مگر سنبھال سنبھال کر قدم رکھ رہا تھا۔ آگے بڑھ کر نم زمین پر وہ پھسلی تو داڑھی نے بڑھ کر بازو تھام لیا۔ پھر اس کا ہاتھ اس کی کمر کی طرف پھسلنے لگا۔ لڑکی نے اس ہاتھ ہٹایا اور آگے آگے چلنے لگی۔

کچھ آگے جا کر نیم کے درخت کے نیچے انھوں نے اپنا ڈیرہ جمایا دری بچھائی اس پر نائلون کا بڑا سا کور اور گول گول کشن تکیے میں راجہ اندر بن کے بیٹھا۔ بوتل نکال گئی۔ گلاس سجائے گئے۔ اور خوش گپیاں شروع ہوئیں

لڑکی نے لنچ کیس کھول کر پلیٹیں نکالیں۔ تولیے سے پونچھ پونچھ کر پلاسٹک کے ٹیبل کلاتھ پر قرینے سے رکھی۔ کھانے کا سامان نکالا۔ اور اسٹوو جلا کر فرائی پان میں مچھلی کے قتلے تلنے لگی۔ سینکڑوں ہزاروں سال سے یہی ریت چلی آتی ہے ان کی ماؤں نے ان گنت پیڑھیوں سے ان کے دسترخوان سجائے ہیں۔ ان کی پیاس بجھائی ہے۔ اور ان کی اولاد کو جنم دیا ہے۔

وہ پیتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے جھگڑتے رہے۔ جب ذرا زیادہ چڑھی تو سب سے پہلے پہلوان آپے سے باہر ہوا۔ لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔

"یہ کیا معاملہ ہے بھائی —— ہم بھی تو ہیں ——" پٹھان بھی قریب آگیا وہ پیچھے کھسکنے لگی تو وہ قہقہے لگانے لگے۔

"ارے کھا تو نہیں جائیں گے بھئی —— بیٹھی بھی رہو —— اس نے پلیٹیں ان کے ہاتھوں میں تھمائیں اور کھانے کی ڈشیں آگے سرکائیں وہ کھانا نکالنے کھانے لگے۔

دیوتا اپنی پلیٹ ہاتھوں میں لئے اٹھ کر لڑکی کے قریب آیا اور اپنا منہ اس کے رخسار کے قریب لا کر لڑکھڑاتی زبان سے پوچھنے لگا۔ "اور تم —— تم —— کیا کھا —— کھا رہی ہو"

"چاول اچار یہ —— اپنے چمچے سے چاولوں میں اچار ملاتے ہوئے کہا۔

"ہاہا سویٹ ——"

"سویٹ —— ازنٹ اِٹ" داڑھی بھی جھومتے ہوئے بولا۔ یار معاملے خاں اور لو تھوڑی سی —— لو نا بھئی"

دھیرے دھیرے سرخ وحشت ان کی آنکھوں میں تیرنے لگی۔ ان کے قہقہوں میں جانوروں کی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ معاملے زیادہ پی کر ناچنے لگا۔ پھر سب سے پہلے موٹر کا مالک داڑھی جھومتا ہوا اٹھا۔

"آؤ ذرا وہاں —— وہاں تک گھوم آئیں —— آئیں" ہاتھ پکڑ کر اس نے لڑکی کو اٹھایا۔

"ارے بارش آرہی ہے"

باریک بوندوں کا جھرنا برسنے لگا۔

"آنے دو —— آنے دو —— وہ ہنسا۔

ہاہاہا —— خاخاخا —— خی خی خی —— وہ سب ہنستے ہی جارہے تھے۔

بوندیں بڑھنے لگیں۔ بارش تیز ہوگئی۔ وہ سامان ہاتھوں میں اٹھائے دری کو کھینچتے ہوئے نیم کے نیچے بھاگے۔ بارش اور تیز ہونے لگی۔ نیم بھی برسنے لگا۔ تو وہ سامان اٹھائے بھیگتے ہوئے جھونپڑی کی طرف بھاگے۔

وہاں پہنچتے پہنچتے وہ بالکل بھیگ گئے۔ اپنے رومالوں سے اپنا چہرہ اور سر پونچھا پتلونوں کے پائنچے نچوڑے۔ اور جھونپڑی کے اندر دیکھنے لگے۔ پتلے سے چھپر کا پھوس جگہ جگہ سے ادھڑ گیا تھا۔ اور کچی پکی ٹیڑھی میڑھی دیواریں تھیں۔ تیل کا دیا رکھنے کے طاق پر لو کے دھوئیں کا سیاہ نشان ماتھے کے ٹیکے کی طرح اوپر کی طرف کھنچا ہوا تھا

"وہ دیکھو —— وہ جگمگاتا میرا ستارہ ہے —— جس دن وہ ڈوب جائے گا —— میں بھی ڈوب جاؤں گا"

یکایک روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں —— بجلی کا ایک کوندا ان کے بالکل ان کے سر پر سے تڑپتا گرجتا آسمان کے کنارے تک نکل گیا۔

لڑکی اور دیوتا دونوں کے منہ سے ایک ساتھ ہلکی سی چیخ نکلی۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی ہوئی پھر ایک زبردست دھماکا ہوا اور ایک بھاری سا گولہ گھڑگھڑاتا ہوا بادلوں

کے اوپر لڑھکتا چلا گیا۔ بارش کے بھیگتے کھیتوں میں دور تک اس کی گونج ٹھوکریں کھاتی مدھم ہوتی چلی گئی۔

پھر ایک لمحے بعد بجلی ایک تیز چمکتے سانپ کی طرح بالکل ان کے سروں پر تڑپنے لگی مچلنے لگی۔ گرج سے ان کے کان گنگ ہونے لگے وہ ڈرے کھڑے تھے۔

پھر دو چار لمحے کے لئے سکون ہوا تو پہلوان نے ایک لمبا سانس لیا۔ دیوتا نے کہا

"دیکھا تم ___ خدا کی پناہ ___ میری ماں کہتی تھی کہ جب آسمان پہ بجلی تڑپتی ہے تو اسے ڈھونڈھتی ہے جس کا وقت آ گیا ہے ___ ہاں ڈھونڈھ ہی نکالتی ہے ___"

ایک لمحے کے لئے روشنی پھیلی اور پھر غائب ہو گئی اور اس کے بعد ایک بھاری گرج بادلوں سے گونجتی دور تک نکل گئی۔ پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا اور وہ سہم کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور کچھ بولنے ہی والے تھے کہ پھر بالکل ان کے سروں پر سے بجلی کڑکتی چنگھاڑتی گذری۔ بارش سے اندھیرا سا ہو گیا تھا۔

دیوتا نے چیخ کر کہا

"وہ کون ہے بابا ___ نکل جاؤ یہاں سے ___ نکل جاؤ خدا کے لئے ___"

وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

پہلوان نے لڑکی کو کھینچ کر باہر دھکا دے دیا

"نکل کمبخت ___ نکل جا"

"ارے ___ ارے" وہ گھگھیائی۔ پھر اندر آنے لگی۔

انھوں نے اسے پھر دھکا دینے کے لئے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے

"چلی جا ___ چلی جا" وہ سب چیخے

وہ سہمی گھبرائی بھیگتی پھسلتی نیم کے درخت کی طرف بھاگی۔ جیسے ہی وہ نیم کے درخت کے نیچے پہنچی

یکلخت بجلی بڑے زور سے چمکی بادلوں کو چیرتی ہوئی زبردست آواز نکلی تڑاخ ___ تڑا ___ تڑا ___ تڑا آسمان سے زمین تک آگ کی ایک لکیر کھنچ گئی جو نیم کی ایک لمحے کے لئے شعلہ بن گئی۔ دیواریں بکھر گئیں اور ملبے میں سے دھواں اٹھنے لگا ___

یہ جو میری بیوی ہے ان دنوں ایک نو عمر لڑکی تھی اور لوگ کہتے ہیں ___ ☐

طارق چھتاری
ناظم منزل، دودھ پور، علی گڑھ

کھو کھلا پہیہ

"ہم تو خدا کے بنائے ہوئے پہیے ہیں، کھوکھلے پہیے ..... جس طرح وہ چاہتا ہے ہمیں گھماتا ہے اور اگر ہم گھومنے سے انکار کریں .... انکار؟ انکار کیسے کر سکتے ہیں، ہمیں تو گھومتے ہی رہنا ہے۔ خدا پر اتنا اعتماد؟ اعتماد کیوں نہ ہو، رزق بھی تو وہی دیتا ہے .....!!" ہر شام دھندے پہ نکلنے سے پہلے وہ یہی سوچتا۔

اس نے لونی لگی دیوار میں ٹنگی کھونٹی سے پرانے جھولے کو اتارا اور اپنے دھندے کے اوزاروں کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ہتھوڑی، چھینی، سنڑاسی، چھوٹی سی کدال اور ایک آنکڑا۔ سب ٹھیک ہے .... سب ٹھیک تھا مگر ایک بار پھر اس نے جھولے میں جھانک کر دیکھا، غروب ہوتے سورج کی مدھم روشنی میں اسے اپنے اوزار دکھائی دیئے۔ آنکڑا منھ اٹھائے اسے تک رہا تھا، اسے محسوس ہوا کہ آنکڑا اس کی قمیص کے دامن میں پھنس گیا ہے .... وہ سہم گیا اور جلدی سے جھولا بند کر دیا۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے نا، اسی لئے آنکڑے سے ڈر جاتا ہے۔

وہ دھندے پر جا رہا ہے۔ اس کی بغل میں جھولا اور ہاتھ میں بتیل چھڑی ہے۔ اسے کدھر جانا ہے اسے کیا معلوم، ابھی دو چار گاؤں یونہی بھٹکے گا پھر آدھی رات ہو جائے گی، کام بن گیا تو ٹھیک ورنہ صبح ہوتے ہوتے گھر واپس ___ گھر؟ گھر تو بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا تھا۔ تو کیا ہوا ہے تو گھر ہی ....!! اسے دور کوئی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ کچھ قریب پہنچا تو دیکھا ایک چھوٹا سا بلب چمک رہا ہے۔ یہ تو پہیہ ہے .... پہیہ نہیں گاڑی ہے ایک بچے نے دو پہیوں میں ڈنڈا باندھ کر گاڑی بنا رکھی تھی۔ دونوں پہیوں کے بیچ میں دو سیل کھپچوں میں لپیٹ کر رکھ دیئے تھے اور سیلوں سے تار میں بلب لگا کر ڈنڈے میں لٹکا دیا تھا۔ "واہ رے خدا سچ ہم کھوکھلے پہیے ہیں، تو جس طرح چاہتا ہے ہمیں گھماتا ہے۔" اسے یاد آیا بچپن میں بنجاروں والے کوئیں پر اسے ایک پہیہ ملا تھا جو بالکل کھوکھلا تھا یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ کھوکھلا کیوں تھا۔ اس نے دیکھا بچہ آہستہ آہستہ اس گاڑی کو چلا رہا ہے۔ ارے اس میں تو دو ہے کے دو تار بھی بندھے ہیں۔ اس نے غور سے دیکھا بچے نے ایک

تار کھینچا گاڑی کے دونوں پہیے ایک جانب مڑ گئے، دوسرا تار کھینچا تو گاڑی رک گئی، یہ بریک تھا..... اتنا آہستہ چلانے پر بھی بریک کی ضرورت؟ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی—کیا اسے سمجھنے کے لئے بچہ بننا پڑے گا؟ مگر کیوں..... کیا وہ کبھی بچہ نہیں تھا۔ بچپن میں جب وہ کھیت پر بابا کو روٹی دے کر زنگ آلود لوہے کے کھوکھلے پہیے کو مکا کے ٹھٹھرے سے ڈھکیلتا بہت تیز دوڑتا ہوا گھر واپس آتا تھا تو اس کے پہیے کو نہ تو کہیں بریک کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہ اتنا دھیمے چلتا۔ اگر کبھی وہ آہستہ چلانے کی کوشش بھی کرتا تو پہیہ دو چار چکر لے کر گر جاتا۔ وہ پہیئے کے سہارے کتنی جلدی گھر واپس آجاتا تھا۔ وہ جب تھوڑا بڑا ہوا تو اس کے بعد کی نسل نے مکا یا سرکنڈے کے ٹھٹھرے کے بجائے لوہے کے آنکڑے بنائے تھے اور سب پہیئے دھیمے دھیمے چلنے لگے تھے، جب وہ جوان ہوا تو پہیوں میں آنکڑے اس طرح جڑ دیئے گئے کہ پہیئے اپنی رفتار کھو بیٹھے اور اب جب کہ وہ بوڑھا ہے موڑنے اور بریک لگانے کے لئے تار بھی کس دیئے گئے ہیں۔ اب اسے پہیوں سے نفرت ہونے لگی ہے پہیوں سے ہی کیوں قصبے کی زمین سے اگتی ہوئی نئی نئی بلند عمارتوں سے بھی اسے نفرت ہے.....!!

جب عمارتیں کم تھیں تو پہیئے تیز چلتے تھے اور جب پہیئے تیز چلتے تھے تو اس کا دھندا بھی اچھا چلتا تھا۔ جب وہ تمام دھندوں سے تھک گیا تبھی شکور تیلی مرا اور اس نے اپنا نیا دھندا شروع کیا—شکور تیلی کی قبر کھود کر تختہ ہٹایا اور کفن کھینچنے کے لئے آنکڑا ڈالا تو اس میں سے کتنا قیمتی کپڑا نکلا تھا—اور پھر آہستہ آہستہ وہ کفن کھسوٹنے میں ماہر ہو گیا، وہ رات ہی رات میں دس دس کوس کے مردوں کے کفن کھسوٹ لاتا—

"تیرا نام کیا ہے۔؟" اس نے گاڑی والے بچے سے پوچھا۔

بچے نے جواب دیا۔ "سلیم"

"تو حاجی وحید کا ناتی ہے؟" بچہ کچھ کہے بغیر آہستہ آہستہ اپنی گاڑی ڈھکیلتا آگے بڑھ گیا۔

"حاجی وحید"—؟ ہاں وہی وحید پہلوان—جن کی اب دو منزلہ پکی عمارت ہے۔ یہیں پر ان کا کچا مکان تھا۔ اسارے میں اپنے چیلوں کے لئے بیٹھے رہتے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانا پینا چلتا رہتا، کبھی بادام، کبھی دیسی گھی میں بنا انڈے کی زردی کا حلوہ، دیسی گھی تو وہ پانی کی طرح اوک سے پی جائے پھر انہوں نے اسارے کی جگہ دوباری بنوالی اور دیسی گھی پینا بند کر دیا۔ جب پچھلا کوٹھا تڑوا کر دو کمرے بنوائے تو زردی کا حلوہ بھی بند ہو گیا۔ اور جب ان کی لکڑی کی ٹال آرا مشین کا کارخانہ بنی تو چیلے چپاٹے غائب—اب ان کے بچے شہر میں پڑھتے تھے اور وہ دوباری میں بیٹھے کھانستے رہتے تھے۔ اور ایک دن ان کا انتقال ہو گیا تو اس نے ان کی قبر کھودی۔ اس نے سوچا تھا، آج تو بہت قیمتی کپڑا ملے گا اس دفعہ وہ کپڑا

رام سروپ بزاز کے ہاں نہیں بیچے گا، بے ایمان بہت کم پیسے دیتا ہے۔ مگر رام سروپ کیا کرے اب قبر سے کپڑا ہی کتنا باریک اور خراب نکلتا ہے۔ جس دن اخبار میں یہ خبر چھپی کہ ہمارا قصبہ تحصیل ہو گیا ہے اس دن دتا پٹواری کی قبر سے کتنا مہین کفن نکلا تھا۔ رام سروپ نے تو اٹھا کر پھینک دیا مگر پھر مان ہی گیا آخر تھا تو اسی کی دوکان سے خریدا ہوا۔ مگر حاجی وحید کے بیٹوں نے بڑا قیمتی کفن پہنایا ہوگا۔ اس نے چھڑی میں آنکڑا کسا اور تختہ ہٹا کر قبر میں ڈال دیا۔ دو تین جھٹکے مارے پھر آہستہ آہستہ کھینچا، دیکھا تو کپڑا کیا تھا چیتھڑا تھا۔ رام سروپ تو دو آنے کو بھی نہیں پوچھے گا۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ اس کے استاد نے بتایا تھا.... بہت دن کی بات ہے جب اس قصبے میں سب مکان کچے تھے اور ہر آدمی کا چھپر برسات میں ٹپکتا تھا اس وقت استاد کے دادا نے جس قبر سے کفن چرایا تھا اس میں سونے اور چاندی کے تاروں سے بنا ایک دوشالہ نکلا تھا۔

بچہ گاڑی لے کر حاجی وحید کی دو منزلہ عمارت میں گھس گیا۔ اندھیرا کافی ہو چکا تھا، ابھی اسے کئی گاؤں گھومنا پڑے گا شاید کہیں موت ہوئی ہو۔ خیرات پور، نرائن پور، گنگا گڑھ اور پھر دیر پور کے قبرستان کے قریب پہنچا۔ اسے قبرستان میں روشنی نظر آئی، سکون کی سانس لی اور قبرستان کے باہر ایک پلیا پر بیٹھ گیا۔ لوگ دفنا کر واپس جا رہے تھے—اس نے چھپ کر واپس جاتے لوگوں کو دیکھا ان کے چہروں پر نہ غم کے آثار تھے اور نہ موت کا خوف—

یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا سچ مچ یہ دیر پور کا قبرستان ہے یا وہ کہیں اور آن بھٹکا ہے۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا—"مگر مجھے کیا۔ کوئی بھی جگہ ہو۔ ہے تو قبرستان ہی۔ اور قبرستان بھی نہ ہو تو کیا ہوا قبر تو ہے جس میں ابھی ابھی کچھ لوگ مردے کو دفن کر کے واپس گئے ہیں۔"

چاروں طرف چنبیلی کی خوشبو مہک رہی ہے۔ "لگتا ہے امیروں کا قبرستان ہے۔ اور جو لوگ دفنا کر گئے ہیں ان کے کپڑوں سے بھی عجیب عجیب خوشبوئیں نکل رہی تھیں۔" اس نے اپنے جھولے کو ٹٹولا، آنکڑا نکال کر چھڑی میں لگایا۔ اور تازہ قبر کی تلاش میں چل دیا۔ اسے قبر ملی تو اس پر گلاب کی ٹہنی اڑسی ہوئی تھی اور قبر کی مٹی کیوڑے سے مہک رہی تھی۔ اس نے کدال نکالی اور قبر کھودنے لگا۔ وہ جتنا کھودتا خوشبو تیز ہوتی جاتی، اچانک "ٹن" سے آواز ہوئی۔ وہ اچھل گیا۔ اسے لگا کہ کدال لوہے کے زنگ آلود کھوکھلے پہیے میں لگی ہے۔ اس نے پھر کدال ماری آواز اور زور سے ہوئی، وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "اے خدا وہ کہاں آن پہنچا ہے۔ یہ لوگ کون تھے جو مردے کو دفن کر گئے ہیں۔ اور یہ آواز..... یہ آواز کیسی ہے۔ کیا مٹی پتھرا گئی ہے یا اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔"

اس نے ہمت کو سمیٹا اور ایک بار پھر کدال ماری اب اس کی سمجھ میں آگیا کہ تختے کی جگہ پتھر کی پٹیا

رکھی ہے۔ "آج تو برسوں کے بعد اس کی حسرت پوری ہوگی۔ کسی امیر کی قبر ہے۔ شاید سونے اور چاندی کے تاروں والا دوشالہ ہو۔" اس نے ہاتھ سے پتھر کو کھسکانا چاہا مگر پتھر بہت بھاری تھا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا کہ پتھر بہت بھاری ہو، ہلکا پھلکا پتھر رکھنے والے مردے کو دوشالہ کیا اُڑھائیں گے۔ اب وہ چھینی اور ہتھوڑی سے پتھر میں چھید کرتے کرتے پسینے سے شرابور ہو چکا ہے۔ پتھر کاٹنے کی آواز قبرستان کے سکوت کو توڑ رہی ہے۔ کبھی کبھی جب آواز زور سے ہوتی ہے تو وہ کانپ جاتا ہے۔ "کون ؟" "ارے یہ تو میرا وہم ہے یہاں اندھیرے کے سوا کون ہو سکتا ہے ــــ" پتھر بہت موٹا ہے۔ وہ ہتھوڑی کی چوٹیں زور زور سے مارنے لگا آخر چھید ہو ہی گیا۔ اس نے آنکڑے والی چھڑی چھید کے اندر ڈال دی۔ "آج وہ اتنا خوف زدہ کیوں ہے؟ آخر بیس سال سے وہ یہی کام کر رہا ہے....." اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس نے ہمت کی اور آنکڑے میں کفن پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید دوشالہ بہت دبیز ہے اس نے زور سے آنکڑا پھنسایا اسے محسوس ہوا کوئی موٹی سی چیز آنکڑے میں پھنس گئی ہے۔ اس نے آنکڑے کو کھینچنا چاہا مگر آنکڑا نہیں کھنچا۔ بہت موٹا کپڑا ہے۔ اس نے زور سے جھٹکا دیا اب آنکڑا پتھر کے چھید سے باہر آچکا تھا۔ اس نے آنکڑے کو چھوا تو اس کے ہاتھ میں لجلجی سی کوئی چیز آگئی، یہ مردے کے جسم کی کچی ہوئی کھال تھی۔ وہ چیخ پڑا اور بے تحاشا وہاں سے بھاگنے لگا..... وہ اپنی سمت بھول چکا تھا۔ وہ کب سے بھاگ رہا ہے... برسوں سے؟ صدیوں سے.......؟ یہ تو یاد نہیں مگر اب وہ جہاں آن پہنچا ہے جگمگاتی ہوئی روشنیوں والا کوئی بہت بڑا شہر ہے۔ اسے دور سے دھواں اگلتی چمنیاں نظر آرہی ہیں۔ چمنیاں لوہے کی ہیں مگر کھلے پھٹے والے زنگ آلود لوہے کی نہیں ــــ وہ شہر کے باہر عیسائیوں کے قبرستان کے قریب کھڑا ہے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ شہر کی جانب سے گیس کی لالٹینوں کے ساتھ بارات آرہی ہے..... ارے یہ تو کسی عیسائی کا جنازہ ہے۔ اسے اپنے استاد کی بات یاد آئی۔ "جب کوئی عیسائی مرتا ہے تو اسے تابوت میں سونے کی زنجیر، گھڑی اور قیمتی کپڑے پہنا کر بند کیا جاتا ہے۔" کیا سچ مچ آج بھی سونے کی زنجیر اور گھڑی پہناتے ہیں عیسائی لوگ ــــ ہاں کیوں نہیں..... وہ تو بہت امیر ہوتے ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا ایک بڑا ستارہ چمکتا ہوا نظر آیا ــــ "ارے یہی تو ہے اپنی قسمت کا ستارہ..... کتنے دنوں بعد چمکا ہے۔

وہ قبرستان کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ "ان لوگوں کے چہروں پر خوف کیوں ہے۔ شاید موت کا خوف ہو ــــ مگر کسی کے چہرے پر رنج و الم کا نام و نشان بھی نہیں۔"

اس کے استاد نے بتایا تھا۔ "عیسائی لوگ کسی کی موت پر روتے پیٹتے نہیں ہیں، بس کالے کپڑے پہن

لیتے ہیں۔"

"یہ لوگ کچھ باتیں کر رہے ہیں....." اس نے کان لگا کر سننا چاہا مگر باتیں اتنی آہستہ ہو رہی تھیں کہ شاید بات کرنے والا بھی اپنی بات نہیں سن پا رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اشارہ کیا اور سب لوگ دو دو چار چار کر کے ادھر ادھر چلے گئے۔

"اے خدا یہ کون سا دستور ہے....." اس نے سوچا اور پھر جلدی سے قبر کے پاس پہنچ گیا اور کدال سے مٹی ہٹانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں تابوت نظر آگیا۔ اس نے چھو کر دیکھا اس پر پیتل کی پتیاں جڑی ہوئی تھیں "اف تابوت بھی اتنا قیمتی ــــ" اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور تابوت کی ایک کیل اکھاڑی..... پھر کیل کو آنکھوں کے قریب لا کر اس طرح دیکھنے لگا کہ کہیں یہ کیل سونے کی تو نہیں۔ مگر رات کی تاریکی میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اندر کتنا خوبصورت مردہ ہوگا ــــ گھڑی اور سونے کی زنجیر پہنے...... اور دوشالہ.......؟ دوشالہ نہیں بھی ہوا تو سونے کی زنجیر تو ہوگی ہی ــــ جب وزیر خاں حج کر کے آئے تھے تو دونوں ہاتھوں میں گھڑی پہنے تھے اور عیسائیوں کا کیا ہے چار چار گھڑیاں بھی پہنا سکتے ہیں مردے کو...

وہ ہاتھوں میں چار چار گھڑیاں پہنے گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے اور چاندی سونے کے تاروں سے بنا دوشالہ اوڑھے بڑے بڑے شہروں کی چوڑی سڑکوں پر ٹہل رہا ہے۔ بڑے سے بڑا سنار بھی اس کی زنجیر اور دوشالہ خریدنے کو تیار نہیں ــــ خرید بھی کیسے سکتا ہے۔ کس کے پاس ہے اتنا روپیہ۔ اتنا قیمتی سامان تو کوئی راجا ہی خرید سکتا ہے۔ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا، اس نے مڑ کر دیکھا.... پولیس.... نہیں.... نہیں.......!!

اس کی سانس پھول رہی ہے.... وہ قبرستان میں تابوت پر تنہا بیٹھا ہے۔ آسمان پر بڑا تارہ اور تیز چمکنے لگا ہے۔ اس نے تابوت پر ہاتھ پھیرا۔ پیتل کے پتھر کے نقوش ابھرے محسوس ہوتے تو اس کی امیدوں کو تسکین ملتی اور دل کھل اٹھتا ــــ اب دیر کرنے سے کیا فائدہ ــــ "کھل جا سم سم" ــــ اس نے تابوت کے اوپر کا تختہ ہٹایا اور جلدی سے مردے کی دونوں بانہوں کو پکڑ کر اٹھانا چاہا مگر وہ لرز گیا جب اس کے ہاتھ مردے کے بجائے تابوت کے نچلے تختے پر جا لگے۔ اس نے دیکھا تابوت خالی تھا..... بالکل خالی....!! وہ چیخا اور پھر چکرا کر اس طرح گر گیا جیسے کسی نے اس کے جھولے سے کدال نکال کر اس کے سر پر دے ماری ہو۔ وہ اتنا ہلکا کیوں ہو گیا ہے، شاید اس کے جسم سے بہت کچھ نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ وہ اندر سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ اس کی پسلیاں گلنے لگی ہیں، ایک ایک کر کے سب گلتی جا رہی ہیں۔ اس کا گوشت بھی سڑ چکا ہے اور کھال پر زنگ لگ گئی ہے۔ اب وہ بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس نے بھاگنے کے لئے زور لگایا وہ بھاگ

تو نہ سکا گر زمین پر لڑھک پڑا اور اتنی تیز لڑھکنے لگا کہ وہ رکنا بھی چاہے تو نہ رک سکے۔ وہ لڑھکتا رہا چھوٹے بڑے آڑے ترچھے راستوں پر لڑھکتا رہا۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ زنگ آلود لوہے کا کھوکھلا پہیہ ہے اور کوئی شخص سکّے کے ٹھیرے سے اسے مار مار کر اسے تیزی سے لڑھکا رہا ہے ...!! ☐

تنویر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

کتاب	مصنف	ناشر	قیمت
۱- پرایا گھر	جیلانی بانو	اردو مرکز، حیدر آباد	۲۰/۰۰
۲- خوشی کے موسم	علی باقر	سیما پبلی کیشنز، نئی دہلی	
۳- دستک	صفیہ ملک	علی برادرز، لاہور	۱۵/۰۰
۴- فرشتے خاموش ہیں	دیریندر پٹواری	سیمانت پرکاشن، نئی دہلی	۱۶/۰۰
۵- کوندے	تقی حسین خسرو	ادارہ نوائے سروش، کراچی	۱۵/۰۰
۶- سورج کا چکر	رشید عارف	ڈاکٹر دھاوے بلڈنگ، کرلا بمبئی	۳/۰۰
۷- ادھورے چہرے	شمیم صادقہ	بھوپال ہاؤس، بھوپال	۶/۰۰
۸- ہوا	محمود احمد قاضی	کلاسیک، دی مال، لاہور	۱۰/۰۰
۹- نئے مکان کی دیمک	علی امام نقوی	شمیم پبلی کیشنز، بمبئی	۱۰/۰۰
۱۰- ہارا ہوا پرندہ	مظفر الزماں خاں	ادارۂ شعر و حکمت، حیدر آباد	۱۰/۰۰
۱۱- آگ کے ہم سائے	احمد یوسف	شمیم یوسف	۱۵/۰۰
۱۲- بارہ رنگوں والا کمرہ	عبد الصمد	انجمن تہذیب نو، الٰہ آباد	۱۵/۰۰
۱۳- گمشدہ کلمات	مرزا حامد بیگ	خالدین، لاہور	۳۰/۰۰

اس وقت ہمارے سامنے اردو کے تیرہ ۱۳ افسانوی مجموعے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف ممالک سے شایع ہوتے ہیں بلکہ افسانوی ادب کے مختلف رجحانات کے حامل ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانہ نہ صرف یہ کہ خیالات کے اعتبار سے متنوع ہے بلکہ تکنیک کے اعتبار سے بھی ان میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ اردو افسانے نے پچھلے دس پندرہ سال میں جو نئے نئے تجربے کئے ہیں ان کی بھی ان افسانوں سے نشان دہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک افسانہ نگار نہ صرف یہ کہ اپنا اسلوب بیان تلاش کر رہا ہے بلکہ وہ تکنیک کے میدان میں بھی اپنی چھاپ چھوڑنا چاہتا یا چاہتی

ہے۔ اس لئے ان افسانوں کو سرسری طور پر بھی نہیں پڑھا جا سکتا اور نہ یہ وقت گزاری کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اگر آپ ان کو اپنے کسی سفر میں شریک کریں گے تو آپ کا وقت شاید اور مشکل سے کٹے۔ ظاہر ہے کہ ادب کے اپنے مطالبات ہوتے ہیں اور اگر اردو افسانہ اپنے قاری سے ذہانت کی فرمائش کرے، ذرا غور و فکر سے پڑھنے کی خواہش ظاہر کرے تو یہ کوئی زیادتی نہیں ہے۔

اس بزم میں جیلانی بانو سے کرشیم صادق تک کے مجموعے شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک قارئین کی توجہ کا مستحق ہے۔

● جیلانی بانو صفِ اول کی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں روایت بھی ہے اور بغاوت بھی۔ اس مجموعے میں نئے مسائل بھی ہیں اور پرانے بھی، وہ مسائل جو آج بھی اتنے ہی نئے ہیں جتنے برسوں پہلے ـــــ عورت اور مرد کے مسائل ـــــ جیلانی بانو کے یہاں عورت کا احتجاج بھی نظر آتا ہے۔ اس میں غصہ کم، اداسی اور غم زیادہ ہے۔ "بند دروازہ" نہ صرف ایک مرد کی بہیمیت کا آئینہ دار ہے بلکہ شہری زندگی کی ناہمواری اور "اپ اسٹارٹ" طبقے کی بڑی جاندار پیش کش ہے۔ بلاشبہ اس کا شمار اردو کے بہت اچھے افسانوں میں ہو سکتا ہے۔ "بے مصرف ہاتھ" رفو بیوی کی کہانی ہے جس کا ظاہر ایک چڑیل کا سا تھا "منہ شاید چیل کوؤں نے نوچ لیا تھا اور آنکھوں کی جگہ سرخ گڑھے تھے اور ناک سے ٹھوڑی تک کہیں گوشت اور کھال نہ تھی" کتنا بھیانک چہرہ تھا لیکن دل محبت سے لبالب بھرا تھا کہ ذرا سے ہچکولے میں چھلک جاتا تھا ـــــ جیلانی بانو نے اس کہانی میں بڑی خوبصورت کردار نگاری کی ہے۔ جیلانی بانو نے اپنی متعدد کہانیوں میں نفسیاتی گرہوں کو الفاظ کی انگلیوں سے کھولنے کی کوشش کی ہے اور انھیں کھولا بھی ہے۔ ایسے افسانوں میں "کلچرل اکیڈیمی"، "اسکوٹر والا"، "اے دل، اے دل"، "ایک دن کیا ہوا" شامل ہیں۔

جیلانی بانو نے اردو افسانے کی جاندار روایتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ان روایتوں کی نہ صرف آبیاری کی ہے بلکہ انھیں آگے بھی بڑھایا ہے۔

● "خوشی کے موسم" علی باقر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ علی باقر نے چودہ سال انگلستان میں قیام کیا ـــــ وہاں کی زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کیا ـــــ یہ کہانیاں اسی پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ پس منظر محض کہر آلود فضا کا نہیں ـــــ ان افسانوں میں برطانوی دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ "کرسمس کی ایک شام" "اندھیرا"، "حسنِ انتقام"، "شراب اور شہد"، "کسک"، "کہر" بلاشبہ اعلا درجے کے افسانے ہیں جن میں مغرب کی جدیدیت بھی ہے اور اس کا سونا پن بھی ـــــ تہذیب کی اس ترقی نے کیا کھویا کیا پایا ـــــ یہ سب کچھ ان افسانوں میں ہے ـــــ "حسنِ انتقام" میں خود غرضی اور نسلی عصبیت کی عکاسی تو ہے لیکن اس کے برخلاف انسانی دلوں کی دھڑکن کی ہم آہنگی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ علی باقر بلاشبہ اردو کے اچھے افسانہ نگار ہیں ـــــ لیکن انھوں نے "شمع" میں لکھ کر اپنے افسانے عوام تک پہنچائے، ان عوام تک جو افسانے محض لطف و انبساط کے لئے پڑھتے ہیں ـــــ علی باقر کو ابھی اپنے اصل قاری نہیں ملے اور مجھے یقین ہے کہ وہ جب پڑھیں گے تو یقیناً انھیں خیال ہوگا کہ اردو افسانے میں علی باقر نے یورپ کے معاشرے کی جھلکیاں

پیش کر کے اس کی سرحدوں کو وسیع کر دیا جو شاید بمبئی، دہلی، لکھنؤ، لاہور اور کشمیر تک ہی محدود ہو گئی تھی اور ان افسانوں کے ساتھ یورپ اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد جس طرح ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں ـــــ علی باقر بھی "شمع" کی بزم سے آگے بڑھیں گے اور اپنے اصل قاریوں کو پہچانیں گے، جن میں بیشتر نئے افسانے کی شناخت میں "کنفیوز" ہو رہے ہیں۔

● صفیہ ملک کی کہانیاں ہماری گھریلو زندگی کی ٹوٹ پھوٹ، مرد کی بے حسی، معاشرے میں عورت کی مجبوری اور بے کسی کی عکاس ہیں۔ انھوں نے زندگی کو جیسا پایا، ویسا ہی پیش کر دیا ـــــ انھوں نے اپنے خیالات زندگی کی بے رحم حقیقتوں سے بنائے ہیں اسی لئے ان میں توانائی ہے اور کہیں بھی تصنع نظر نہیں آتا۔ وہ حقائق کو پیش کرنے کے لئے نظریات کا تانا بانا تیار نہیں کرتیں بلکہ جو دل پر گزرتی ہے رقم کر دیتی ہیں۔ اس عمل میں کبھی کبھی فنی توازن برقرار نہیں رہتا لیکن پڑھنے والا وہ سب کچھ جان لیتا ہے جو وہ بتانا چاہتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کو سمجھا بھی ہے اور انھیں بڑی کامیابی سے اپنے افسانوں میں برتا بھی ہے۔ "شناسا اجنبی"، "دستک"، "ڈستی تنہائیاں" اور "پالتو" سے ان کے فن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان میں فنی مہارت پیدا ہوتی جائے گی ان کے تاثر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

"دستک" میں کل ۱۲ کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں ہلکی پھلکی ہیں اور بقول سلیم احمد "روزمرہ زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔" یہ ان کی ابتدائی کہانیاں ہیں ـــــ ان میں عورت کا کرب اور اس کا المیہ ہے ـــــ ابھی یہ درد پورے طور پر صفیہ ملک کے دماغ و دل سے ہم آہنگ نہیں ہوا لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ درد، ایک کیفیت اور ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک لب و لہجے کر ان کے افسانوں سے ابھرے گا اور پھر ان کو اپنی منزل مل جائے گی۔ اور اردو افسانے کو ایک اچھا اور دردمند افسانہ نگار ـــــ میں سلیم احمد کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ "عمر، وقت اور مشق کے ساتھ ساتھ ان کا فن بھی ترقی کرے گا اور وہ زیادہ بہتر طور پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں گی۔ وہ فطری افسانہ نگار ہیں۔ وہ کہانی کہنا جانتی ہیں۔ کہانیاں جو زندگی کی حقیقتوں سے جنم لیتی ہیں۔

● کشمیر نے اردو کو کئی اچھے افسانہ نگار دیئے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی بڑے ہونہار تھے۔ ان سے اردو افسانے کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ یہ کلی کھلتے کھلتے مرجھا گئی۔ "فرشتے خاموش ہیں" دریندر ترپاٹھی کے افسانوں کا مجموعہ ہے ـــــ "ریت کی دیوار" بڑی دردناک کہانی ہے۔ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے کہ جو اپنی بڑی بہن کے سہارے "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی زندگی گزارتا ہے لیکن ایک روز وہ جب ایک نئے جسم کو خریدنے نکلتا ہے تو اسے اپنی بڑی بہن کا جسم ملتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ دریندر ترپاٹھی کو اپنے افسانوں میں تفکر کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی شدید احساس ہے۔ ان کے یہاں دردمندی اور انسان دوستی کی جھلکیاں ملتی ہیں جن سے اظہار کے خلوص کا یقین مستحکم ہوتا ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے تکنیکی تجربے کر رہے ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں اندازِ بیان میں روایت کی جھلک ملتی ہے۔ ان کا یہ طریقہ مناسب ہے۔ بقول جوگندر پال انھیں اس کا بھی احساس ہے کہ زندہ ہیئتیں بے ضمیر نہیں

ہوتیں، بلکہ فنی اہتمام انسانی ضمیر سے دم پکڑتا ہے !"

● "گوندے" تقی حسین خسرو کے ۱۸ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ تقی حسین خسرو جدید دور کے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے افسانے نہ علامتی ہیں اور نہ تجریدی۔ ان کی کہانیوں کی خصوصیت ان کی تکنیک اور اسلوب بیان ہے جو اتنے سادہ ہیں کہ مومن کے شعر کی طرح جب آپ ان افسانوں کو پڑھتے ہیں تو اس فضا میں کھو جاتے ہیں اور آپ کو کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کے یہاں تقریر کی لذت تحریر میں جب بدلتی ہے تو ہمیں اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہیں۔ خسرو نے اپنا اسلوب دریافت کر لیا ہے اور ان کے ہر افسانے میں ان کے اسلوب کی چھاپ ہے۔ وہ جب کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو ان کی سادہ بیانی اس میں ایک خاص قسم کا حسن پیدا کر دیتی ہے جس میں "حرف عام کی" افسانویت نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات جب شعور سے لاشعور کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ افسانہ نگار کے اندر ایک جال سا بُن دیتے ہیں ـــــ یہ کہانیاں متوسط طبقے کے ایک ذہین فرد کی کہانیاں ہیں جس میں یہی لوگ نظر آتے ہیں۔ بقول جمیل جالبی "اس متوسط طبقے کی کہانیاں ہیں جس میں خوابوں کے بکھرنے اور عمر کے تیزی سے گزرنے کا کرب موجود ہے جن کی زندگیاں ننھی ننھی خوشیوں اور ننھے ننھے غموں کی کسک سے عبارت ہے "ـــــ لنگڑا عاشق"، "کھانسی"، "علامت"، "حرفِ مکرر" ان کے انفرادی اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ انفرادیت بڑی ریاضت کے بعد نصیب ہوتی ہے اور تقی حسین خسرو نے یقیناً بڑی ریاضت کی ہے۔ وزیر آغا نے صحیح لکھا ہے کہ ان کے افسانوں کے اسلوب میں افسانہ نگار کی دلآویز شخصیت اپنی ساری مٹھاس، خوشبو اور سندرتا کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔

● "سورج کا چکر" رشید عارف کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے کے بعد پتا چلتا ہے کہ جدیدیت ترقی پسند تحریک کی توسیع ہے۔ یہ افسانے ترقی پسند تحریک سے متاثر ذہن کی تخلیق ہیں لیکن ان کا فنی اظہار جدیدیت سے قریب تر ہے۔ رشید عارف کے افسانوں کا موضوع تقریباً وہی ہے جو ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ہے لیکن اظہار بیان ان کا اپنا ہے۔ رشید عارف نے علامتی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ جیسے "منزل ایک مسافر تین" جہاں ٹرین کے پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے طبقاتی علامت بن گئے ہیں۔ رشید عارف نے علامت کو بڑے صاف ستھرے انداز سے پیش کیا ہے۔

رشید عارف کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور ایک ہونہار اور ذہین افسانہ نگار کے اچھے مستقبل کا پتہ دیتا ہے، بشرطیکہ وہ فن پر اسی طرح توجہ دیتے رہیں۔

● "ادھورے چہرے" شمیم صادقہ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے سات افسانے ہیں۔ اس سے پہلے "کرچیاں" شائع ہو چکا ہے۔ میں نے "کرچیاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان افسانوں میں ایک اچھے افسانہ نگار کا مستقبل چھپا ہوا ہے اور چونک چونک کر ادھر ادھر دیکھ رہا ہے کہ کیسے سامنے آئے۔ "ادھورے چہرے" میرے خیال کی تصدیق کرتا نظر آتا ہے۔ بقول مصنفہ ان افسانوں میں زندگی کے ادھورے پن کی عکاسی ہے۔ کھوکھلے نظریات کا ملبہ ہے۔ شمیم صادقہ کا ذہن

بہت وسیع ہے۔ وہ محض عورتوں کے مسائل پر باتیں نہیں کرتیں۔ وہ اپنے وجود کی متلاشی نہیں ہیں۔ ان کے افسانوں میں داخلی اور خارجی زندگی کا بڑا خوبصورت امتزاج ہے۔ "بجھی ہوئی تیلی"، "دھند کی دیوار"، "ادھورے چہرے" مختلف قسم کے افسانے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک میں سماجی شعور ہی نہیں بلکہ واضح طور پر جانبداری ملتی ہے لیکن اس کے باوجود افسانے کے فن پر حرف نہیں آتا۔ شمیم صادقہ حساس فن کار ہے اور اس نے ان کے افسانوں کو گہرائی عطا کی ہے۔ "دھند کی دیوار" ہجرت کی کہانی ہے لیکن ہجرت کی عام کہانیوں سے مختلف ہے۔ یہاں ماضی ایک تہذیب کی علامت بن جاتا ہے۔ شمیم صادقہ کی زبان ان کے احساسات کی بڑی خوبصورتی سے ترجمانی کرتی ہے۔ نئے اردو افسانے کو ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔

● "ہوا" محمود احمد قاضی کے تیرہ ۱۳ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ یہ انسانی معاشرے کی الٹتی پلٹتی قدروں کی کہانی ہے جہاں احساسات بدلتے رہتے ہیں اور بقول قاضی "کان" ترش بیل کا ذائقہ چکھیں، زبان زیرِ زمین چھپائی سرنگوں کے دھماکے سنیں، پاؤں چھالوں کی بولی بولیں، آنکھیں آسمانوں کی سختی محسوس کریں اور ہاتھ ہڈیوں کے تعفن سونگھیں ـــــ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں قلم اگر لفظوں کو چھونے کے بجائے زخموں کو کریدنے لگے تو تعجب کیا۔" ہوا" کے افسانے انسانی دکھ درد کی کہانیاں ہیں جن کی زبان، لب و لہجہ، اندازِ بیان، سب کچھ جدید ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی فضا ـــــ زبان، احساسات و جذبے کا اظہار تو کرتی ہے لیکن قاضی نے ان کے ذریعہ ماحول اور فضا کو اپنے پڑھنے والوں سے مانوس کر دیا ہے۔

دریا کی بڑھتی ہوئی باڑھ کو کچھ دیر تو باندھوں سے روکا جا سکتا ہے لیکن سیلاب روکے نہیں رکتے۔ کہیں نہ کہیں سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ جب سیاسی موسم خراب ہوتا ہے، اظہارِ خیال پر پابندی ہوتی ہے تو خیال اپنے اظہار کے لئے نئی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے۔ شاید علامتی کہانیوں کا یہ بھی ایک جواز ہے۔

محمود احمد قاضی نے یہی سوچا کہ ایسا لکھا جائے کہ ہوا کو قید کرنے والے ہاتھ شل ہو جائیں اور بقول قاضی کے یہی جب ایسا لکھا جائے گا تب تمام زمانوں کے بچے سورج اکثریت کے ساتھ طلوع ہوں گے۔ مہربان چاند کی ساری ٹھنڈک دھرتی کے زہر کو چوس لے گی اور اس طرح منافق لفظوں کی موت ہو گی۔" وہ بولے گا سرِ راہ، ہوا، مگر اسٹیج خالی ہے، وہ بچہ ہنسے گا جواز، بے لوث خارجی قسم اس مجموعے کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ "ہوا" میں بشر اور اس کی بیوی فاطمہ حال کی علامت ہیں جنھوں نے اپنے زمانے سے ڈر دب کر مجھوتہ کر لیا ہے ـــــ لیکن ان کا بچہ جو مستقبل کی علامت ہے اور جس کا نام ٹیپو ہے وہ تازہ ہوا کا متلاشی ہے ـــــ باپ فاطمہ سے پوچھتا ہے کہ ٹیپو ایسا کیوں سوچتا ہے ؟" فاطمہ نے کہا: "اسے روکنا ہمارے بس میں نہیں ـــــ ضروری تو نہیں کہ جن چیزوں کے متعلق ہم نہیں سوچتے یا ہم نے نہیں سوچا ـــــ ان کے بارے میں ٹیپو بھی نہ سوچے ـــــ ہم اسے سوچنے سے نہیں روک سکتے ـــــ اسے سوچنے دو" ـــــ اتنا کہہ کر وہ رو پڑی ـــــ اب بشر نے تنگ آ کر بیرونی کھڑکی کے پٹ ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے کیوں کہ وہ یہی کر سکتا ہے۔ مگر ٹیپو اب بھی

بند کھڑکی کے ساتھ لگا کھا کرتا ہے ــــ " مجھے ہوا چاہئے ۔ مجھے ہوا چاہئے ۔"

پاکستان سے جو مجموعے ہم تک پہنچ رہے ہیں ان میں محمود احمد قاضی کے افسانوں کا مجموعہ " ہوا " یقیناً قابلِ ذکر ہے ۔ اس مجموعے میں روحِ عصر پورے طور پر جلوہ گر ہے ۔ قاضی نے فنی اعتبار سے بھی خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے ۔ یہ مجموعہ اردو افسانوی ادب میں یقیناً ایک اضافہ ہے ۔

● " نئے مکان کی دیمک " علی امام نقوی کے ۱۳ افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ علی امام نقوی نے مختصر عرصے میں اپنے افسانوں میں اپنا ایک مخصوص انداز اپنا لیا اور یہ بڑی بات ہے ۔ نقوی جدیدیت سے متاثر ہیں لیکن اسلوب کی حد تک ــــ شاید جدیدیت کی پہچان اسلوب سے ہوتی ہے ۔ ایک ایسا اسلوب جس میں سیدھی سادی بات کو پیچیدہ بنا کر کہا جاتا ہے ایسی صورت میں تاثر کی کمی ہو جاتی ہے ۔ نقوی صاحب کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن وہ اپنے انداز سے بیان کرتے ہیں ۔ اس لئے یہ پیچیدگی کہیں کہیں تفہیم کی دشواری پیدا کرتی ہے ۔ افسانہ نگار یہ چاہتا ہے کہ قاری ان کہی بات کو خود دریافت کرے ۔ نقوی اپنے قاری کو سہارا دیتے ہیں ۔ " دانتوں میں گھری زبان " ۔ " منھ زور گھوڑیاں " اس کی واضح مثال ہیں ۔

" منھ زور گھوڑیاں " فساد کی کہانی ہے مصنف نے جس کا انتساب مرحوم زکی انور کے نام کیا ہے ۔ اس کہانی کا اہم کردار خود زکی انور ہے ۔ یہ کہانی ایک مایوسی کی کہانی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاشرے میں صرف پاگل اور بیوقوف ہی رجائی ہو سکتے ہیں اور کہانی کا حقیقت پسندانہ انداز ہی اس کی معنوی خصوصیت ہے ۔

امید ہے کہ علی امام نقوی کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ ، ان کے آئندہ کے خوبصورت افسانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا ۔ ان کے یہاں ایک اچھے افسانہ نگار کے آثار صاف نظر آرہے ہیں ۔

● " ہارا ہوا پرندہ " مظہر الزماں خاں کا " پہلا آسمان " ہے ــــ اس کے ساتھ ہی انھوں نے چھے آسمانوں کی اور بشارت دی ہے جن میں ان کی ریڈیائی کہانیاں ، ناولٹ ، طنز و مزاح ، تنقیدی مضامین اور جدید افسانے شامل ہوں گے ۔ اس مجموعے میں شروع سے چونکا دینے والی بہت سی باتیں ہیں ۔ وہ " ایک اہم بات " کے تحت لکھتے ہیں کہ میری دلی خواہش یہ تھی کہ میں اپنے افسانوی مجموعے میں اپنی تصویر کے بجائے اپنا لاشعاعی عکس لوں اور اس کا پازیٹیو بنوا کر شایع کروں تاکہ میرا گوشت پوست کا لباس اتر جائے اور میں اپنی اصلی حالت میں آپ کے سامنے آجاؤں ۔ لیکن وقت کی کمی اور حالات کی وجہ سے میرے اندر کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی ۔" پھر خاں صاحب نے اس کا انتساب اسی کے مجموعے کے نام کیا ہے اور اپنا نشان انگوٹھا ثبوت کے طور پر دیا ہے کہ شاید اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے ۔ لیکن جس آدمی کو اپنے پوست پر اعتماد نہیں ، وہ کیوں اس کو اتنی اہمیت دیتا ہے ۔ یہ بات بھی سوچنے کی ہے ۔ اس مجموعے میں ۱۲ افسانے ہیں جو تمام تر تجریدی رنگ میں لکھے گئے ہیں ۔ اسی لئے ابہام کی کیفیت ہے ۔ کہیں کہیں پر ذاتی علامتیں تفہیم سے بالاتر ہو جاتی ہیں ۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے صحیح لکھا ہے کہ اسے علامتی افسانہ کہیں یا تجریدی افسانہ ، یا نیا افسانہ ،

بہر حال ایک نئی چیز افسانے کے میدان میں در آئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسے قبولیتِ عام کا شرف نہ بھی مل سکا تو بھی اس کی ادبی حیثیت ایک کمزور بچے کی نہیں بلکہ تنومند نوجوان کی ہے ۔"

مظہر الزماں خاں کے یہاں جہاں نئی بات نئے انداز سے کہی گئی ہے وہاں ذات کی مسلسل تلاش ملتی ہے ۔ وہ ذات جو کسی مجمع میں اپنی انفرادیت کھو دیتی ہے یا پھر ہر لمحہ نئے چہرے لگا کر اپنے آپ کو خود چھپا لیتی ہے ــــ افسانے کی زبان میں اگر یہ ذات مل جائے تو کیا کہنا ــــ بہر حال مظہر الزماں خاں کے یہاں فنی تہ داری ملتی ہے ۔ ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت بار بار یہ خیال آتا ہے کہ افسانہ اور شاعری کا بعد شاید جلد دور ہو جائے اور ایک اک افسانے کی مختلف تشریحیں ہو سکیں خاص طور پر جب کہ افسانہ نگار اس معاملے میں رہبری نہیں کرتا ۔ اس مجموعے کے افسانے ایک ذہین قاری کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اس کتاب دل کی تعبیریں خود کرے ۔ نیا افسانہ اپنے افسانہ نگار سے زبان و بیان پر پوری قدرت کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ قدرت مظہر الزماں خاں کے قلم کو کسی حد تک حاصل بھی ہے ۔ مظہر الزماں خاں کے یہاں داخلی اور خارجی زندگی کے تجربوں کا امتزاج ملتا ہے ۔

" ہارا ہوا پرندہ " سرسری طور پر پڑھنے کی کتاب نہیں ہے ۔ اسے بڑے غور سے پڑھنا پڑے گا اور تب جا کر قاری کی رسائی اس کی تہہ تک ہوگی ۔ ظاہر ہے کہ موتی نکالنے کے لئے غوطہ زنی تو کرنا پڑتی ہے ۔ جدید افسانوی ادب میں یہ مجموعہ بڑی انفرادیت کا حامل ہے اور نئے افسانے کے مطالعہ میں اس مجموعے کو یقیناً اہمیت حاصل ہوگی ۔

● " آگ کے ہمسائے " احمد یوسف کے ۲۱ افسانوں کا مجموعہ ــــ اس کا موضوع وہی انسانی المیہ ہے لیکن سنانے والا اسے چہرے بدل کر سناتا ہے ۔ یہ افسانے جدید ہیں ــــ علامتی ہیں ــــ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ــــ لیکن شاید پرانی شراب میں نشہ دو چند ہو جاتا ہے اس لئے محض بوتلوں کی تبدیلی نہیں ــــ احمد یوسف کی کہانیاں اپنے اندازِ بیان سے متاثر کرتی ہیں ــــ " قصہ حجام کے ساتویں بھائی کا " ہجرت کی کہانی ہے ــــ لیکن وہ ہجرت نہیں ہے جو مکے سے مدینے تک ہوئی ہے ۔ یہ تو فرار ہے ــــ حقیقتوں سے آنکھیں نہ ملانے کی بات ہے ــــ بیزارہ اپنے شہر کے آندھی طوفان سے بچ کر ایک دوسرے شہر میں قدم رکھتا ہے لیکن وہاں بھی مہیب طوفان آتے اور بالآخر شہزادی نے اہلِ شہر کی ایما پر اس اجنبی اور خوبرو شہزادے کو یہ کہہ کر محل سے باہر نکال دیا کہ مقرر اس کی بدبختی سے طوفان آتے ہیں ۔"

اور پھر وہ بھوک اور پیاس سے نڈھال اپنی حویلی میں بند پڑا رہتا تھا اور اپنی نادانی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا تھا کہ طوفانوں کے خوف سے اس نے ناحق اپنا شہر چھوڑا اور بزرگوں کے اس قول کو فراموش کیا کہ " طوفان ہر شہر میں آتے ہیں اور بجلیاں ہر مقام پر کڑکتی ہیں ۔"

احمد یوسف کے کردار عام انسانی کردار ہیں لیکن ان کے یہاں یہ کردار کوئی بھی جامہ پہن لیں ، وہ اپنے اندازِ قد سے پہچان لئے جاتے ہیں ۔

" چراغ کشتہ " کا ملازم ایک خاندان ہی نہیں ایک عہد کی کہانی سنا دیتا ہے اور اس کہانی میں

ہمیں اس کی اپنی کہانی بھی سنائی دیتی ہے۔ گویا قصّہ گو خود ایک کردار بن گیا۔ "نقش ناتمام" اس مجموعے کی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ اس میں مجبور و بے کس انسان کتّے اور بلّیوں کی زندگی گزارتے اور مرتے ہیں لیکن ان کے اندر جینے کی تڑپ اور احساسِ حسن باقی رہتا ہے۔ اور پھر حسین خواب جو جینے پر آمادہ کرتے ہیں!

احمد یوسف نے اردو افسانے کی روایت کو یقیناً آگے بڑھایا ہے۔ آج کے نئے افسانے کا مطالعہ احمد یوسف کے افسانوں کے بغیر نامکمل ہے۔ احمد یوسف کے فن میں رچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے اور اب ہمیں ان کے نئے افسانوں کو دیکھنا ہے۔ ان کے یہاں علامتوں کا استعمال معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہے۔

● "بارہ رنگوں والا کمرہ" عبدالصمد کے ۱۹ افسانوں پر مشتمل ہے۔ عبدالصمد اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ اردو افسانے میں جو تکرار شروع ہوئی تھی کہ افسانہ نگار کا موضوع محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید اسی لئے جمود کی بحث نے زور پکڑ لیا تھا لیکن پھر نئے افسانے نے اس تکرار کو ختم کیا اور زندگی کے مسائل نے علامتی شکلیں اختیار کر لیں۔ عبدالصمد کے افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو افسانے میں نئے موضوعات کو اپنانے کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے یہاں آفاقی مسائل بھی ہیں ــــ عبدالصمد کے افسانے ذات کی تلاش نہیں بلکہ کائنات کی کھوج ہیں۔ ان کی فکر استعاروں کے توسط سے آگے بڑھتی ہے اور سچ پوچھئے تو کہانی بذاتِ خود ایک استعارہ ہے۔ عبدالصمد کے افسانے ہمارے معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کے علامتی اظہار ہیں ــــ "بارہ رنگوں والا کمرہ"، "کال بیل"، "زر مبادلہ"، "اپنی صلیب"، "چند غیر مصدقہ واقعات" ــــ یقیناً اردو کے اچھے افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں ــــ عبدالصمد کے افسانوں کا بدلا ہوا روایتی لہجہ افسانے کے قاری کو نہ صرف چونکا سکتا ہے بلکہ یہ نئے افسانے کا معتبر لہجہ ہے۔ جس میں عبدالصمد کی اپنی انفرادیت کا بھی ہاتھ ہے۔ عبدالصمد کی زبان میں ایک خاص قسم کی شعریت ہے جو اُن کی اپنی ہے۔ مجھے بیدی کی ایک بات یاد آ رہی ہے کہ افسانہ اور شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ہے تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے:

عبدالصمد اس مسلسل لمبی بحر سے عمدہ برا ہوئے ہیں۔ ان کے غیر معمولی شعور نے ان کے احساس کو اتنا ہی غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے اسی لئے ان دونوں کے امتزاج سے کبھی کبھی ابہام بھی پیدا ہونے لگتا ہے اور یہی ابہام عبدالصمد کے افسانے کا حسن ہے۔ یہ افسانے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

● "گمشدہ کلمات" پاکستان کے ممتاز افسانہ نگار مرزا حامد بیگ کے ۱۶ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ مرزا حامد بیگ کی ایک خصوصیت جو مجھے نظر آئی اور جس کی طرف ہمارے آج کے جدید افسانہ نگار زیادہ توجہ نہیں دے رہے ہیں کہ افسانے کی افسانویت خارجی حقیقت سے ابھرتی ہے اور یہی قاری سے افسانے کو پڑھواتی ہے۔ میں جناب سجاد باقر رضوی کی تائید کرتا ہوں کہ "حقیقت اور خواب" "معلوم و نامعلوم، موجود

اور ناموجود، سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ حامد بیگ ہمیں لبھانے کے لئے افسانہ شروع کرتے ہیں تو ان کے قدم ٹھوس زمین پر ہوتے ہیں ــــ گرد و پیش کی دنیا ــــ ٹھوس تفاصیل، ہمیں ہر شے مانوس معلوم ہوتی ہے۔ پھر کسی موڑ پر مانوس، غیر مانوس میں ٹھوس اشیاء تاثرات میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور پورا افسانہ ایک علامت بن کر ذہن میں در آتا ہے اور ہم سے اپنے معنی اور جہتیں متعین کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ افسانے کی روایت سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ انھوں نے اس روایت کے بہترین عناصر کو قبول کرتے ہوئے اسے آگے بڑھایا ہے۔ جناب سجاد باقر رضوی کا یہ خیال کہ مرزا حامد بیگ کسی موضوع پر افسانہ نہیں لکھتے مجھے زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ مجھے تو ان کے ہر افسانے میں نہ صرف یہ کہ موضوع نظر آیا بلکہ مجھے تو اس موضوع میں ایک اندازِ نظر کی کارفرمائی بھی دکھائی دی۔ مثلاً "نیند میں چلنے والا لڑکا" ایک مخصوص معاشرے پر ایک مخصوص زاویئے سے طنز ہے۔ یہاں کسی قسم کی بے تعلقی نہیں۔ وہ مخلص فن کار کی طرح پورے جذبے کے ساتھ اپنے کرداروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے یہاں زوال پسند جاگیردارانہ نظام سے وہ ہمدردی کہیں نظر نہیں آتی جو ہمارے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں نمایاں ہیں اور ہمارے قاری ان کا داستانوی انداز سے مطالعہ کرتے ہیں۔ "کہانی کا بڑھاپا" میرے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ کے یہاں بھی ابہام ملتا ہے لیکن وہیں تک جہاں تک کہ وہ حُسن ہے۔ یہ اس لئے کہ ان کے قدم ٹھوس زمین پر ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند نقاد بھی اگر سکہ بند تنقیدی نظر اپنائیں اور وہ مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا بغور مطالعہ کریں تو انھیں بھی اپنی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آئے گی۔

مرزا حامد بیگ کہیں کہیں کتابی زبان استعمال کرتے ہیں کہیں کہیں بالکل مقامی الفاظ ــــ میں سجاد باقر رضوی کی طرح ان کو ملزم نہیں سمجھتا اس لئے شبہ کا فائدہ انھیں نہیں دینا چاہئے۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے اردو افسانوی ادب کے لئے فالِ نیک ہیں اور جو لوگ آج کے اچھے افسانے پڑھنا چاہتے ہیں انھیں "گمشدہ کلمات" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ میں ان افسانوں پر پھر کبھی تفصیل سے بحث کروں گا کیوں کہ ہر افسانہ ایک علیحدہ مطالعہ چاہتا ہے۔

(ا۔ پ)

● آپ کا تازہ شمارہ جس پر میری تصویر چھپی ہے، ملا جس کے لئے میں بہت بہت ممنون ہوں۔ چونکہ میں اپنی بیماری کی وجہ سے فرداً فرداً سب کو نہیں لکھ سکتا اس لئے آپ میری طرف سے انھیں لکھ دیجئے۔ پروفیسر آل احمد سرور، اپندر ناتھ اشک، ابن فرید، ظ۔ انصاری، رام پال کو میں لکھنا چاہتا ہوں لیکن معذور ہوں۔

راجندر سنگھ بیدی، بمبئی

● آپ کا دوماہی رسالہ "الفاظ" جس کے سرورق پر میرے پرانے دوست راجندر سنگھ بیدی کی تصویر ہے، ملا۔ آج سے نصف صدی قبل جب میں "پھول" (لاہور) کا اڈیٹر تھا تو وہ اس کے لئے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ اشک اور رام پال کے مضامین پڑھ کر مجھے لاہور کا وہ زمانہ یاد آگیا اور بیدی کی تصویر نظروں میں پھونے لگی۔ آپ کا رسالہ مختصر ہے مگر اپنی خوبصورتی، اپنے مضامین کے اعلیٰ معیار اور اپنے مرتبین کی خوش ذوقی کے باعث ضخیم رسالوں پر بھاری ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

غلام عباس، کراچی

● بیدی نمبر تو پوسٹ ہوتے ہی مل گیا تھا۔ آپ کے وفائے عشق کی داد دینا پڑے گی۔ خدا جانے تمہاری داد خواہی کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ مگر تمہارا لو لیٹر ۱۰ر اپریل کو تحریر کیا گیا تو ۲۴ر اپریل کو ملا۔ اتنی دیر یا تو تمہاری جیب کے گوشۂ عافیت میں رہا یا پوسٹ ڈپارٹمنٹ تمہارے خط کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر بار بار پڑھتے رہے (ویسے اس ڈپارٹمنٹ کے پاس بھی ایک گوشۂ عافیت ہے جسے لوگ ڈیڈ لیٹر آفس کے نام سے پکارتے ہیں۔)

چودہ دن میں دہلی سے علی گڑھ کا فاصلہ طے ہوا اس سے تو پاکستان اچھا، جو بدقسمتی سے (بجانے اُن کی یا ہماری) اگرچہ اجنبی ملک ٹھہرا مگر پھر بھی وہاں سے ایک ہفتہ میں خط مل جاتا ہے۔ بہرکیف تمہارا خط تو مل گیا۔ نصیب خیر تمہارا اچھا تھا ورنہ میں تو تمھیں سنگدل ڈکلیر کر ہی چکا تھا۔

الفاظ کے بیدی نمبر پر میں تبصرہ نہیں کروں گا کیوں کہ بیدی اب تبصرے کی اعلیٰ سطح سے بلند ہو چکا ہے۔ نمبر میں اختصار اور جامعیت دونوں تھیں ورنہ آج کل پہلوانوں کی طرح ضخیم ضخیم نمبروں کا چلن آپڑا ہے۔ جسے پڑھتے وقت ڈنڈ بیٹھکیں نکالنا پڑتی ہیں۔ یہ ایک ٹریجیڈی ہے کہ اتنے زیادہ ڈنڈ بیٹھکیں نکالنے کے بعد بھی پرچھا جائے "کچھ سمجھ میں آئیں بیدی کی گہرائیاں اور نکتہ بینیاں؟" تو جواب ملتا ہے "اس شخص میں تھکا دینے کی صلاحیت بہت ہے۔"

اطہر میاں! میں بھی بیدی کی سوچ اور اظہار کا ویسے ہی مداح ہوں جیسے لاکھوں دوسرے ہیں۔ مجھ

میں کوئی الگ انفرادیت نہیں۔ جو لوگ الگ انفرادیت کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے۔ تم نے بیدی نمبر نکال کر میری خود اعتمادی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ بڑا نمبر ضرور نکالو۔ اگرچہ ڈرتا ہوں کہیں بکھر نہ جاؤ۔ ویسے الفاظ اعلیٰ سطح کا ادبی پرچہ ہے۔ باقاعدہ نکالو تو یہ سطح برقرار رہ سکتی ہے۔ برقراری کی پیاس آج ہندوستان کے اور رسائل کو تڑپا رہی ہے۔

فکر تونسوی، نئی دہلی

● آپ نے افسانے کی فرمائش کی تھی اور ایک افسانہ زیر تحریر تھا۔ خیال تھا کہ جلد مکمل کر لوں گا اور الفاظ کے لئے نذر کروں گا مگر افسوس کہ افسانہ ابھی تک ادھورا رکھا ہے۔ سوچا آپ کو مطلع کر دوں جب بھی افسانہ لکھ لیا، بھجوا دوں گا۔ آپ اس کے لئے اپنا افسانہ نمبر نہ روکیں کسی آئندہ شمارے میں سہی۔ میں نے ایک غزل بہت عرصہ پہلے نذر کی تھی۔ نہ جانے وہ آپ تک پہنچی یا نہیں؟

احمد ندیم قاسمی، لاہور

● "الفاظ" کا "بیدی نمبر" میرے سامنے ہے۔ یقین فرمائیے کہ مجھے یہ خصوصی اشاعت بالخصوص بڑی اچھی لگی۔ راجندر سنگھ بیدی میرے محبوب افسانہ نگار ہیں، افسانہ نگار کیا ہیں جادوگر ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ انتہائی سادہ کار نظر آتے ہیں۔ ان کے فن پر پروفیسر آل احمد سرور، اپندر ناتھ اشک، ابن فرید، ظ۔ انصاری اور رام پال صاحبان کے مضامین کسی نہ کسی گوشہ کو منور کرتے ہیں۔ ضیاء الدین انصاری صاحب نے بیدی صاحب کی تصانیف کی فہرست پیش کی ہے۔ بظاہر یہ غیر اہم کام ہے لیکن میں ان دو صفحات کے مطالعہ کے بعد کچھ افسردہ کچھ مضمحل ہوا۔ بظاہر یہ چند کتابیں ہیں لیکن ایک دنیا ہیں۔ افسوس راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار کی تحریروں کا معتد بہ حصہ پاکستان میں ایک جگہ دستیاب نہیں ہو سکتا۔ جستہ جستہ مطالعہ کی بات ہی کچھ اور ہے جب آپ نے مجھ سے بیدی کے فن پر لکھنے کے لئے فرمایا تو میں بس یہی سوچتا رہا کہ کیا میں بیدی کے تمام افسانے پڑھ چکا ہوں۔ میں نے بیدی صاحب کے معتد بہ افسانوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن پھر بھی میں کیسے یقین کر لوں کہ اس کے تمام افسانے پاکستانی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ رہا سوال بیدی کے نمائندہ افسانوں کے بارے میں مجموعی خیال کا تو بھائی بیدی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ان کی عظمت کے مجنوں صاحب بھی قائل ہیں، سرور صاحب بھی، باقر مہدی صاحب بھی اور ابن فرید صاحب بھی۔ گذشتہ دنوں سلیم احمد صاحب نے بھی ایک انٹرویو میں بیدی صاحب کے فن پر توصیفی رائے دی۔ میرا خیال ہے کہ بیدی نے اردو افسانے میں سطحیت اور جذباتیت کو نکال باہر کیا ہے اور وہ ان رشتوں کی گہرائیوں میں اتر کر "اَن کہی" زبان میں وہ سب کچھ کہتے ہیں کہ بس الاماں۔

راہی معصوم رضا کا مضمون "غریب شہر" بہت پسند آیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مضامین کی یاد تازہ ہو گئی۔ ندیم قاسمی، شاذ تمکنت، رفعت سروش، کشور ناہید، شہناز صدیقی، حامدی کاشمیری، ساغر مہدی اور منظور ہاشمی قابل مبارکباد ہیں۔

آپ نے قاسمی صاحب پر لکھنے کے لئے کہا ہے، حکم کی تعمیل کروں گا

محمد علی صدیقی، کراچی

آپ کے ارسال کردہ دونوں شمارے مل گئے۔ جدید رجحانات کے سلسلے میں آپ کا پرچہ ایک اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ سابقہ پرچے بھی عنایت فرمائیں اور آیندہ کرم فرمائی جاری رہے۔ عنقریب اشاعت کے لئے کچھ بھیجوں گا۔

وحید قریشی، لاہور

● مجھے مقالوں سے سخت کوفت ہوتی ہے اور براہ مہربانی میرے اوپر مقالہ نہ چھاپئے۔ مقالے کہانی کار کا گلا گھونٹنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جس نمبر میں مقالے نہیں ہوں گے میں اس کے لئے کہانی بھیجوں گی۔ مقالوں نے میرا بہت دم گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کبھی نہیں پڑھے نہ کبھی پڑھوں گی۔ میں فلمی رسالوں میں لکھوں گی جو مقالے نہیں چھاپتے۔ میں قلم توڑ دوں گی، اگر انہوں نے بھی مقالے بازی شروع کر دی۔ میں علی گڑھ ہو کر آرہی ہوں۔ علی گڑھ سے نکلنے والا رسالہ میرے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ان مقالوں نے جو جدید لکھنے والوں کو پنجروں میں بند کیا ہے مجھے اس پر رونا آتا ہے۔ اب ذرا کھڑکی کھل رہی ہے اور امید ہے کہ دیواریں ڈھے جائیں گی۔ مجھے ہمیشہ دیواروں سے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ رسالے کے لئے دعائیں قبول کیجئے۔

عصمت چغتائی، بمبئی

● میں نے الفاظ کے صرف دو شمارے دیکھے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت خوب ہیں۔ الفاظ جس طرح آپ ترتیب دے رہے ہیں قابل ستائش و مبارکباد ہے۔ جاپان کو تو آپ اردو کے لحاظ سے ایک صحرا ہی سمجھئے۔ دور دور اردو کا نام ونشان نظر نہیں آتا۔ ایسے میں آپ کا الفاظ یقین جانئے کسی گلشن سے کم نہیں ہے۔

محمد اقبال حنیف، ریڈیو جاپان، ٹوکیو

egd. No. L. ALG/91 Jan. Feb. Mar. Apr. 1981

ALFAZ Aligarh

egistered with the Registrar Of Newspapers at R. N. No. 29123/76

پہلی بار ہندوستان میں اقبال صدی کے موقع پر علامہ اقبال کے مجموعے خوشنما آفسٹ سے

کلیاتِ اقبال (مکمل) (اُردو) (عکسی)

کا صدی ایڈیشن

- علامہ اقبال کے فرزند رشید ڈاکٹر جاوید اقبال کی ترتیب اور اُن کے دیرینہ رفیق مولانا غلام رسول مہر کی تصحیح۔
- علامہ کے اُردو کلام کے تمام مجموعوں کو ترتیب وار پیش کیا گیا ہے۔ یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ تمام مجموعوں کی ترتیب میں کتابوں کی اپنی انفرادی حیثیت بھی قائم رہے۔
- کلیاتِ اقبال نہایت عمدہ فوٹو آفسٹ کتابت و طباعت سے دیدہ زیب انداز میں آفسٹ پیپر پر پہلی مرتبہ پیش کی گئی ہے
- کلیاتِ اقبال میں شخصیات مقامات اور موضوعات کے اشاریے اشاریہ (انڈکس) کا گراں قدر اضافہ کیا گیا ہے۔
- فرسودہ پلیٹوں اور لیتھو طرزِ طباعت کے باعث تمام مجموعوں میں جو اغلاط نمودار ہو گئی تھیں انھیں تحقیق کے ساتھ اوّلین اشاعتوں سے مقابلہ کر کے دُرست کیا گیا ہے۔
- ان تمام خصوصیات اور کاغذ کی ہوشربا گرانی کے باوجود قیمتیں کم سے کم مقرر کی گئی ہیں۔

کلیاتِ اقبال اُردو ضخامت ۱۰۰ ا صفحات

قیمت مجلّد Rs.20/- مجلّد رنگین 25/-

بانگِ درا (عکسی)

علامہ اقبال کا پہلا مجموعۂ کلام

- جب اقبال نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔
- بانگِ درا اقبال کا پہلا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اُردو شعر و ادب میں پہلی بار سنائی دینے والی آواز ہے جس نے قوم کو جگایا۔ 10/-

بالِ جبریل (عکسی)

علامہ اقبال کا دوسرا مجموعۂ کلام

- جس میں شاعرِ مشرق کے فکر کی گہرائی ہے۔
- "بالِ جبریل" قوم کے نام ایک ایسا پیغام ہے جس میں دعوتِ فکر و عمل ہے۔ 8/-

ضربِ کلیم (عکسی)

علامہ اقبال کا تیسرا مجموعۂ کلام

- جس میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔
- اقبال کا فلسفۂ حیات نکھر کر سامنے آیا ہے۔

Rs. 8/-

ارمغانِ حجاز (اُردو) (عکسی)

علامہ اقبال کا آخری مجموعۂ کلام

- جس میں شاعرِ مشرق نے عالمِ انسانی کو مخاطب کیا ہے
- اس مجموعہ میں شاعر مقام سے بلندی حاصل کرتا ہے اور کئے دور کی بشارت دیتا ہے۔

[illegible]/50

ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

اِس عہد کے ممتاز شاعر فیض احمد فیض کے مجموعے پہلی بار ہندوستان میں خوشنما فوٹو آفسٹ سے

کلامِ فیض (عکسی)

فیض احمد فیض

- فیض کے مجموعوں کو ترتیب وار پیش کیا گیا ہے۔ یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ مجموعوں کی ترتیب میں کتابوں کی انفرادی حیثیت بھی قائم رہے۔
- کلامِ فیض نہایت عمدہ فوٹو آفسٹ کتابت و طباعت سے دیدہ زیب انداز میں آفسٹ کاغذ پر پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔
- کلامِ فیض میں نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ اور دستِ تہِ سنگ شامل ہیں۔
- چاروں مجموعوں کے مسودات کی تصحیح فیض صاحب کی ہدایت کے مطابق کی گئی ہے۔
- کلامِ فیض ہم نے "کلیاتِ اقبال" کے انداز پر فوٹو آفسٹ سے شائع کیا ہے۔ قیمت ۲۰/-

نقشِ فریادی (عکسی)

فیض احمد فیض

پہلا مجموعۂ کلام جس نے فیض کو دنیائے شاعری [illegible] امتیاز کے ساتھ متعارف کرایا۔ یہ مجموعہ متعدد بار شائع [illegible] ہے۔ اب ہم نے فیض کی نظرِ ثانی کے بعد فوٹو آفسٹ [illegible] سے انتہائی دلکش انداز میں شائع کیا ہے۔ قیمت ۶/-

دستِ صبا (عکسی)

فیض احمد فیض

دوسرا مجموعۂ کلام جو بیشتر قید و بند کے عالم میں وجود میں آیا۔ اس مجموعے کا شعری حُسن صعوبتوں کی بھٹی میں کُندن بنا ہے فیض کی نظرِ ثانی کے ساتھ فوٹو آفسٹ سے انتہائی دلکش انداز میں شائع کیا گیا ہے قیمت ۶/-

زِنداں نامہ (عکسی)

فیض احمد فیض

فیض کا تیسرا مجموعۂ کلام بھی جیل کی چہار دیواری میں [illegible]ب ہوا اور اپنے فنی معیار و فکری اظہار کے سے [illegible]حد مقبول ہوا۔ ہم نے اسے فیض کی اپنی ترتیب [illegible]طابق فوٹو آفسٹ کے ذریعے انتہائی دل کش [illegible] میں شائع کیا ہے۔ قیمت ۷/۵۰

دستِ تہِ سنگ (عکسی)

فیض احمد فیض

چوتھا مجموعۂ کلام جو زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی اور انسان کے بارے میں وسیع تجربات کا نمائندہ ہے۔ اس مجموعے سے فیض کی فکری و فنی بالیدگی آشکار ہوتی ہے۔ ہم نے اسے فیض کی منظور کردہ ترتیب کے مطابق فوٹو آفسٹ کے ذریعے انتہائی دلکش انداز میں شائع کیا ہے۔ قیمت ۶/-

ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱